سالنامہ

رہبر دکن

حیدرآباد دکن

Checked 1971

مدیر سید محی الدین   معین مدیر محمد عبداللہ خان   مہتمم سید یوسف الدین

بابت ۱۳۴۳ فصلی مطابق ۱۳۵۲ ہجری مطابق ۱۹۳۳ عیسوی

THE

RAHBAR-E-DECCAN

ANNUAL 1343 FASLI

1933

HYDERABAD-Deccan

S. A. MOHIUDDIN, *Editor.*

MD. ABDULLA KHAN, *Joint Editor.*

S. USUFUDDIN, *General Manager.*

Price Rs. 2—8—0

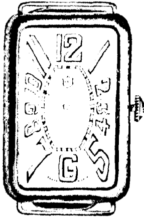
قیمت۔ دو روپیہ آٹھ آنہ

Chandiram Brothers,

SILK MERCHANT,

115 Oxford Street, SECUNDERABAD.



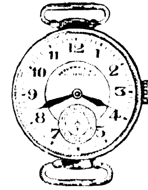


گھڑیاں

بمبئی کلکتہ اور مدراس کے قیمت پر

ویسٹ اینڈ واچ ۔ ریکارڈ

ایبرہارڈ وفیورلو



باجے مشہور کمپنیوں کے جیبی و دستی گھڑیاں۔کلاک۔الکٹرک کلاک وغیرہ کا نیا اسٹاک ہم سے خریدئیے۔

ریشمی پارچہ — ہر ہفتہ سلک کا نیا اسٹاک ہر مذاق کا فرانس 'انگلینڈ' سوئٹزرلینڈ

چائنا جاپان اور امریکہ سے راست منگوایا جاتا ہے۔اعلیٰ ترین خوش وضع ویلویٹ سوئٹزرلینڈ

کی عمدہ کارچوبی و ریشمی کام کی ہوئی ساڑیاں عمدہ فرنچ کارچوبی مخمل ساڑی

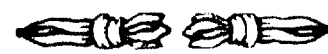
بارڈرس بنارسی کنارے۔ شرٹنگ کا بہترین کپڑا اور ہر قسم کا فینسی ٹوئیڈس وغیرہ برائے

شادی و دیگر تقاریب

ہر وقت موجود رہتا ہے



ایک بار کی خریداری آپکو ہمیشہ مطمئن کرادیگی

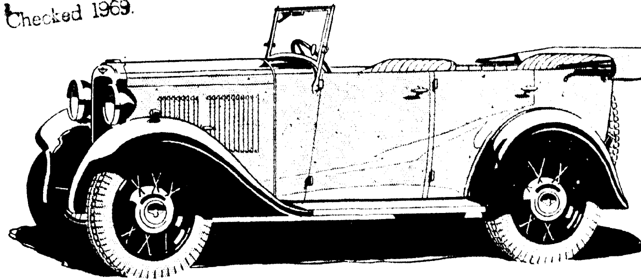


چندی رام برادرس سلک مرچنٹ

۱۱۵ - اکسفورڈ اسٹریٹ سکندرآباد

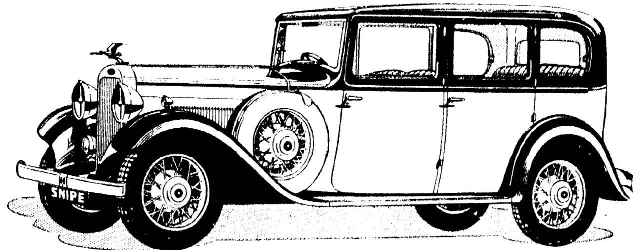
Chandrakanth Press, Hyd.-Dn.

HILLMAN



ہلمن منکس وہلمن وزرڈ موٹر کارس انگلستان کی جدت
نفاست پسندی - اور موٹر سازی کا بہترین نمونہ ہیں

HUMBER



ہمبر موٹر کارس کے مختلف ماڈل ان خاص اشخاص کی مرغوب خاطر
ہونگے جو علاوہ آرام کے پائیداری اور خوبصورتی کو ملحوظ رکھتے ہوں

COMMER

کومر لاریاں نہایت مضبوط
ہوتی ہیں اور کم خرچ

نصیر آٹو موبائل اینڈ انجنیرنگ ورکس

خیرت آباد حیدرآباد

Chandrakanth Press, Hyd.-Dn.

Chandrakanth Press, Hyd.-Dn.

JOHN BURTON,

TAILORS & OUTFITTER,

SECUNDERABAD-DECCAN.

BY SPECIAL APPOINTMENT TO H. E. H. THE NIZAM, G.C.S.I., G.C.B.E.



بسرپرستی خاص اعلیحضرت حضور پرنور ہز اکزالٹڈ ہائینس دی نظام جی سی یس آئی جی سی بی ای

تقریباً (۲۵) سال سے اعلی قدردانوں کی خدمت کر رہا ھے

شیروانی - بریجس - سوٹ - کوٹ - قمیص - کالر

متعدد رنگ برنگ اور نئی وضع کے نایاب ریشمی - اونی اور سرج اور مرسرائزڈ کپڑے

ضروریات لباس مثلاً نکٹائی - ہوا سکارف - پرانا ہی - دستانہ

واٹر پروف - کوٹ - ہیاٹ - فینسی بٹن وغیرہ ہر وقت

اسٹاک میں موجود رہتے ہیں

کارخانہ خیاطی کا

اہتمام اور نفیس کاٹ مشاق یوروپین ماہر خیاط کی نگرانی میں ھے

شیروانی اور بریجس کی تیاری میں خاص مہارت ھے

جان برٹن (الکزنڈرا روڈ) سکندرآباد دکن

فہرست مضامین سالنامہ رہبر دکن بابتہ سنہ ۱۳۴۳ف

نظم

تصاویر

(سہ رنگی)

تصاویر انقرہ پائے تخت ترکی

تصاویر برار



"تعز من تشاء و تذل من تشاء" یہ اللہ جل جلالہٗ و عم نوالہٗ کا فرمان ہے کس کی مجال ہے کہ اس کی صحت پر شبہ کرے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی کس طرح اس دنیائے دون میں ظاہر ہوتی رہتی ہے اس کے سمجھنے کے لئے اس کے اس قانون کے جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ بُرا بھلا انہی کے نصیب میں آتی رہتی ہے جو اس کے منشا کے مطابق اپنی زندگیاں گزارتے یا کم از کم اسی طرح جینے کی اپنی جانب سے کوشش کرتے رہتے ہیں جس طرح جینے کا منشاء الٰہی ہے۔ آج جب کہ تین سال کے وقفہ کے بعد رہبر کو پھر اپنی زندگی پر نظر ڈالنے کا اس سالنامہ کے ذریعہ موقع ملا ہے وہ یہ دیکھکر مطمئن اور مسرور ہے کہ اس نے اپنی فہم و بصیرت کی بموجب مگر اخلاص کے ساتھ منشائے الٰہی کے مطابق جینے کی کوشش کی تھی اس کا انعام اس کو ملنے لگا ہے کہ ملک کے اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ سارے طبقوں میں الحمد للہ اس کی ہر دل عزیزی روز افزوں ہے۔

اس مرتبہ سالنامہ کو وہ عزت حاصل ہوئی ہے جس سے اس کے پیشرو محروم تھے۔ یہ اس کی نہایت عزت افزائی ہے کہ اعلیٰحضرت شہریار دکن خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ جو حقیقتاً فارسی و اردو شعر و سخن کے بھی بادشاہ یگانۂ روزگار ہیں اپنی ایک تازہ غزل "عرض حال" رہبر کی "پشت و پناہ" بننے کے لئے عطا فرمائی ہے اس کے لئے ادارۂ رہبر اپنے شاہ ذیجاہ کی حضور لامع النور میں اپنی شکر گزاری کے عمیق ترین احساسات بہ ادب پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے۔

یہاں یہ کہنا بالکل فضول ہے کہ ملک کو آگے بڑھانے کی کوئی ایسی مفید تحریک نہیں ہوئی جس کو رہبر دلائل و براہین کی پوری قوت کے ساتھ آگے نہ بڑھا رہا ہو۔ اسکی تحریکات کی مقبولیت، اثر آفرینی و نتیجہ خیزی کی وجہ ادارۂ رہبر کا خلوص، خدمت ملک و مالک کی سچی خواہش اور ذاتی اغراض کے کانٹوں سے صحافت جیسے مقدس فریضے کے دامن کو بچائے رکھنے کی پوری کوشش ہے۔ اس میں اس کو مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور شاید پڑتا رہے مگر اس کے پائے ثبات میں لغزش ہوئی اور نہ انشاء اللہ ہوگی، اس کو مالی نقصانات پہنچائے گئے اور رہبر نے ان کو بخوشی انگیز کرلیا اور گو سست رفتاری سے سہی اس کے قدر دانوں کا حلقہ برابر وسیع ہوتا گیا حتیٰ کہ وہ اب اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں کسی کو اس کے مطالعہ کے بغیر چین نہیں پڑتا۔

رہبر کی ایک خصوصیت جو ملک کو اس کا قدر دان بنائے ہوئے ہے صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس کا نہایت مخلص خادم گزار ہے بلکہ وہ ملک کے قابل دماغوں کے افکار و خیالات کے ملک کے آگے پیش ہونے کا بھی ایک بڑا ذریعہ ہے، اس کی گنجائش بہت وسیع ہے، اس کے ذریعہ دنیا کی بہت زیادہ تازہ خبریں قارئین کو ملتی ہیں، مختلف مذاقوں کا پورا لحاظ اس کے صفحات میں موجود ہوتا ہے، اس کے تراجم خصوصی اپنا ایک خاص درجہ رکھتے ہیں اور اس میں عربی اور والائتی تار کے ترجموں کا ایسا نفیس انتظام ہے کہ اس کا مقابلہ ان خصائص میں یہاں اس کے ہندی ہمعصر بھی ایک دو کے سوا نہیں کرسکتے۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود ہم کچھ افسوس کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی آبادی والے ملک میں اس کی اشاعت ابھی اتنی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہئے تھی۔ ہم نے اپنے گزشتہ سالناموں میں اخبار کی ترقی کے وہ تمام خاکے ملک کے آگے پیش کئے ہیں جو کسی اخبار کو معیاری بنا سکتے ہیں۔ مگر اس اخبار کا ادارہ اپنے سارے خلوص اور خاکوں کے باوجود مذکورۂ بالا حالت میں کس طرح اپنے اخبار میں وہ ساری ترقیاں داخل کرسکتا ہے جو مغربی صحافت کو حاصل ہیں؟

اسی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی جس کا ہم نے اوپر کے فقرے میں ذکر کیا ہے تو یہ بات بھی روشن ہوجائے گی کہ کیوں سالنامہ میں اس مرتبہ ایک دو نہیں پورے تین سال کی تاخیر ہوگئی۔

رہبر نے جس اعلیٰ پائے کے سالنامے ملک کے آگے پیش کئے ہیں انھیں ملک جانتا ہے کہ وہ اپنی آپ ہی نظیر تھے کیا بلحاظ مضامین، کیا بلحاظ طباعت اور کیا بلحاظ تصاویر۔ ملکی مطابع کی تہی دامانی اور طباعت کی گرانی کا تقاضا یہ ہے کہ اس قسم کے سالناموں پر ایک کثیر رقم صرف کی جائے اور سچے کی ایک ہی بات اس تاخیر کی نسبت یہی ہے کہ روزنامہ کو آراستہ رکھنے اور اپنے پریس کے گرانبار قرضے سے نکلنے کی کوششوں میں سرگرم رہنے کے بعد رہبر کا مالیہ اس قابل ہی نہ تھا کہ سالنامہ کا لتا۔ اب کہ اس گرانباری میں ایک حد تک کمی ہوئی ہے سالنامہ ملک کے آگے ہے۔

یہ سالنامہ کیا ہے اس کی نسبت کچھ کہکر رہبر "اپنے منہ آپ میاں مٹھو" بننا نہیں چاہتا۔ یہ اب ملک کے سامنے ہے۔ قارئین کرام اور اہل نظر خود اندازہ کرلیں گے کہ اردو کی دنیائے صحافت میں یہ کیا چیز ہے۔ اس مرتبہ اس کی اس خاص اور سب سے بڑی خصوصیت کے سوا جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں اس میں ایک بات اور بھی ہے کہ ملک کے مشہور مصور مسٹر عبد القیوم نے تاریخ دکن کے دو واقعات کو بڑی خوبی سے اپنے موئے قلم کے ذریعہ شاندار کا غذی پیراہن پہنایا ہے۔ ان دونوں رنگین نقوش میں سے ایک تو دکن کی ایک مشہور ملکہ کی شجاعت کا اظہار کررہا اور دوسرا دکن کے مسلمان بادشاہوں کی اس رعایا پروری اور نیک نفسی کا واقعہ سنا رہا اور مسلم حکمرانان پیشین کی بے تعصبی کو مورد الزام بنانے والے مورخوں کے دربار میں فریاد کررہا ہے۔ مسٹر عبد القیوم کی یہ کوششیں یقیناً ملک کی نظروں میں قدر حاصل کریں گی۔ اسی سلسلے میں ہمیں یہاں یہ بتانے کی ضرورت بھی ہے کہ الفرۂ جدید کی ان تصاویر کے حاصل کرنے میں ادارے کو جو جد و جہد کرنی پڑی ہے اسکی وجہ ایک تو اب دودمان آصفیہ اور خانوادۂ دیسہ آل عثمان کا مبارک اتحاد ہے اور دوسرے اسوقت تک کسی ہندوستانی کے کسی پرچے میں جدید الفرہ کی تصور عظمت کا اظہار نہیں ہوا ہے اور بڑا زار کی تصاویر اس لئے اس موقع پر پیش کردی گئی ہیں کہ اس وقت اس پر کوئی سا سیاسی دور ہو مگر ہے وہ ہمارا ہی ایک ٹکڑا اور یہ یادگاریں بھی بیشتر ہماری ہی شوکت کی مرئی صورتیں ہیں۔

اس سے زیادہ اس کی نسبت ہمیں کچھ اور کہنا نہیں ہے ہم آخر میں ملک کا اس کی مہربانیوں کے لئے، اپنے ادارہ ہائے کتابت و طباعت کا سالنامے کی اشاعت میں ان کی غیر معمولی دلچسپیوں کے لئے، اپنے مشتہرین کا ان کی معاونتوں کے لئے جن کی بدولت دراصل رہبر کا مالیہ بڑی حد تک اخبار کو اپنے اس موجودہ معیار پر قایم رکھنے اور اس شکل و صورت کا سالنامہ پیش کرنے کے قابل ہوا ہے، شکریہ ادا کرتے ہیں اور اپنے عنایت فرماؤں کے آگے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ وہ ملک میں مذاق اخبار بینی بڑھانے اور اسطرح اپنی اور جرائد کی امداد کرنے کی جد و جہد بھی بطور خاص شروع کردیں فقط

کلام فصاحت التیام اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خسرو دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

(جو پیشگاہ خسروی سے رہبر کو سالنامہ کیلئے مرحمت فرمایا گیا)

غزل

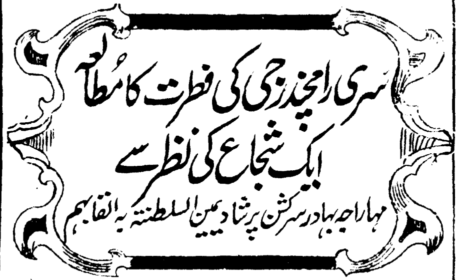
(مطلع) تا دورِ چشمِ مستِ تو ساقی بکامِ ماست
در بزمِ عیش بادۂ عشرت بجامِ ماست

جامی دہند شیشہ و ساغر بہ چشم و دل
در میکدہ ببیں چہ قدر احترامِ ماست

تا بر درت بہ خاکِ ارادت نشستہ ایم
خورشید و ماہ خادم و گردوں غلامِ ماست

زاہد حرام داشت مے و جام را ولے
ما عاشقیم و میکدہ بیت الحرامِ ماست

(مقطع) عثماں کرا مجال کہ دم پیشِ ما زند
در ملکِ عشق سکۂ شاہی بنامِ ماست



ہر ذی حس انسان اپنے ہم جنسوں کی فطرت کا مطالعہ نہایت توجہ اور غور سے کرتا ہے اور ہر مطالعہ کرنے والے کا نقطۂ نظر مختلف ہوتا ہے پیشوایان دین یا دوسرے الفاظ میں علما و مجتہدین مذہب کو قریب قریب ہر قسم کی سوسائٹی سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس لئے کہ وہ اپنے معتقدین اور پیروں کے افعال و اقوال کے ذمہ دار ہیں۔ پس اس مقدس گروہ کو بہ نسبت دیگر طبقات کے انسانی فطرت پر کافی تجربہ اور غیر معمولی عبور ہوتا چاہئے۔

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک جسمانی دوسرا روحانی جسمانی زندگی تو وہ ہے جس کا تعلق کالبد خاکی سے ہے اور اس جسم فانی پر جس وقت موت طاری ہوگی تو اس کے ساتھ ہی اس زندگی کا دور بھی ختم ہو جائے گا۔ مگر روحانی زندگی جس کو ایک حقیقی اور دائمی زندگی کہنا چاہئے وہ ہے جس کا تعلق روح کے ساتھ ہے اور یہ زندگی موت کے بعد بھی قائم رہتی ہے یہ زندگی حق تعالےٰ سے رشتہ الفت جوڑنے اور اس سے سچا تعلق پیدا کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے خدا نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لئے دنیا میں بے شمار پیغمبروں کو چراغ ہدایت و رہنمائی بنا کر بھیجا ان خدا کے رسولوں اور نبیوں نے مخلوق خدا کی رہنمائی کی اور دنیا کی محبت اور اس کی پرستش سے نکال کر خدا پرستی کی اس اونچی چٹان پر جا بٹھایا جہاں خدا اور بندوں کے درمیان صرف نور کا ایک پردہ حائل تھا وہ اپنی آنکھوں سے اوس نور کو دیکھکر سرور حاصل کرتا تھا یہی اصلی راحت اور سچی زندگی ہے۔

ہر رہنما دل سے ماسوائے اللہ جس قدر خیالات ہیں نکالدیتا ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو اس کے دل میں خدائے واحد کی جگہ لینی چاہتی ہیں اور انسان کو اپنی ظاہری شان و شوکت و شوکت اور دبدبہ سے مرعوب کر کے اپنی طرف جھکاتی ہیں ان تمام کو مخلوق سمجھکر ان کی عظمت و عزت کا خیال دل سے دور کر دیتا ہے اور سوا خدا کے کسی کی عزت و عظمت کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا۔ اظہار عبودیت و انکساری کے لئے اسی حی و قیوم کے آستانۂ جبروت و جلال پر اپنی جبین نیاز کو خم کرتا ہے اور جو چیزیں خدا کی بادشاہت اور اوس کی شان میں دخل دینا چاہیں ان سب کو ٹھوکر مارتا ہے جس طرح مہاراجہ رامچندر جی نے اپنے روحانی زندگی کو آفتاب نصف النہار بنا کر چمکایا۔

کہتے ہیں کہ کوشل (دریائے گھاگھرا) کے کنارے ایک بڑی آبادی اور سورج بنسیوں کی راجدھانی تھی۔ موجودہ زمانے میں جس کا نام اجودھیا ہے۔ وہاں کے راجہ دسرتھ کی تین رانیاں تھیں اور اون سے چار اولادیں ہوئیں۔ کیکئی کی گود بھرت سے بھری گئی اور سمترا کی آنکھ لچھمن اور سترگن سے ٹھنڈی ہوئی۔ مگر وہ وقت کیا مبارک و مسعود تھا کہ رانی کوشلیا کے بطن سے چیت کے مہینے میں نومی کے روز سری مہاراجہ رامچندر جی کی ولادت باسعادت ہوئی۔

آفتاب اپنی جھلملاتی ہوئی　　سرخ و سبز کرنوں سے دنیا کے شجر و حجر کو دھوپ چھاؤں کا لباس پہنا کر پہاڑ کی چوٹیوں کو شفق کی قدرتی سرخی سے رنگین کر رہا ہے زمین و آسمان میں خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں مملکات عالم میں مبارکباد کے ترانے گائے جا رہے ہیں بھگت تلسی داس جی نے اس مسرت خیز حالت کا عجیب الفاظ میں خاکہ کھینچا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:—

"لوگ اس جشن میں اس قدر محو اور غلطاں ہوگئے کہ کسی کو ایک مہینے تک معلوم نہ ہوا کہ آفتاب عالمتاب کب طلوع اور غروب ہوا گویا شاعرانہ طرز میں سورج کا طلوع ہونا بھی فراموش ہوگیا۔ ہون میں خوشبودار لکڑیوں کا دہواں اور عطر گلاب کا اڑنا۔ راج محل میں رشیوں اور منیوں کا قطار در قطار آنا۔ جھانجھ کا دہوکا ہوتا تھا۔ ویدوں کے گیتوں میں خدا کی حمد و ثنا کے گیت گانا پرندوں کے نغموں کا کام دے رہا تھا۔

اگرچہ کوشل کی زیب اور راج کی زینت چاروں بھائی تھے، مگر رام کی بات ہی کچھ اور تھی۔ "بچے کے پیر پالنے میں" اسی وقت سے ان کے آثار دوسرے تھے سب ان پر فدا رہے اور لچھمن تو رام پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ ان دونوں کا نام (رام لچھمن) ساتھ آتا اور ان کے عشق کو بتاتا ہے۔

رامچندر جی کی نشو و نما دنوں میں مہینوں کی مہینوں میں برسوں کی ہوتی تھی۔ آٹھ برس کی عمر میں چار وید چھ شاستر اور دیگر علوم و فنون میں ذہن خداداد کے وہ جوہر دکھائے کہ ملک سے خراج تحسین حاصل کیا فن سپاہ گری میں بحر کمال کمال حاصل کیا تیر اندازی میں تو دنیا میں کوئی مد مقابل نہ تھا۔ یہی ہنر اور شوق انہیں راجہ جنک (متھلا پور) کے سوئمبر تک لے گیا۔

ضرورت ہے کہ اس مقام پر راجہ جنک والی متھلا پور کے تاریخی حالات پر روشنی ڈالی جائے یہ راجہ بڑا باقبال ہوا ہے ہندوؤں میں آج تک اس کی مدح و ثنا کے گیت گائے جاتے ہیں یہ راجہ فضیلت دینی اور عزت دنیوی میں یکتا اور ملکی معاملات میں بڑا مدبر اور منتظم ہونے کے علاوہ خدا رسیدہ اور محقق کامل تھا۔

چنانچہ سالکان راہ حقیقت اس راجہ کو جنک (بدیہی) پکارتے تھے۔ بدیہی یعنی بے جسم والا راجہ مشہور تھا۔ یعنے خدا کی یاد میں اس قدر محو رہتا تھا کہ اس کو یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ وہ جسم بھی رکھتا ہے "دل بہ یار دست بکار" کا مصداق ہو رہا تھا اور اس مصرع کے حقیقی معنوں میں درجہ خاص حاصل کیا تھا۔

نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بیخبری رہی

اس راجہ کے باغ میں ایک ہی نورس کلی تھی جو حسن و جمال کی دیوی عصمت و عفت کی ماتا فراست، ذکاوت، شجاعت میں یگانہ روزگار تھی اس کا نام راجہ جنک نے اپنے نام پر جانکی رکھا لیکن عام طور پر سیتا مشہور تھا۔ عمر کے ساتھ جانکی جی کا حسن و جمال بھی بڑھتا گیا اس پر شاہانہ پرورش تعلیم و تربیت کے زیور سے مزین۔ سونے پر سہاگا صورت و سیرت کی شہرت نے دنیا پر قبضہ کر لیا۔ بڑے بڑے ذیجاہ راجہ مہاراجہ اس کے اوصاف حسن عالم سوز اور صفات حسنہ کے گرویدہ ہو کر شادی کے خواستگار ہوئے۔ جانکی جی میں اس حسن و نزاکت کے ساتھ طاقت اور قوت کی بھی کمی نہ تھی۔ راج محل میں قدیم زمانہ سے ایک کمان پڑی تھی جو کسی بڑے سے بڑے شہزور اور بہادر شخص کے اٹھائے نہیں اٹھ سکتی تھی۔ جانکی جی نے اپنی خداداد قوت سے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ راجہ جنک کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے اور عہد کر لیا کہ ایسی طاقتور لائق دختر کا خاوند بھی ایسا ہی قوی و بہادر ہو۔ آخر اعلان کیا گیا کہ جو راجہ اس کمان کو توڑے گا وہی سیتا کو زوجیت میں لینے کا حقدار ہوگا۔ اس اعلان سے بڑے بڑے جری طاقتور راجے اور فنون جنگ میں آزمودہ کار متھلا پوری میں جمع ہوگئے۔ سری رامچندر جی اپنے بھائی لچھمن جی کے ساتھ بسوامتر کے آشرم میں جنگلی اقوام کے ساتھ جنگ و جدل میں مصروف تھے۔ اس اعلان سے آگاہ ہو کر یہ بھی تیار ہوگئے۔ بسوامتر جی ہمراہ تھے۔ راستہ میں جنگلوں اور سبزہ زاروں کا لطف اٹھاتے نیا پانی پیتے نیا کھانا کھاتے منزل بمنزل اپنا جلوہ اور خدا کی قدرت و قوت کا اظہار کرتے راجہ جنک کے دارالسلطنت میں نزول اجلال فرمایا دونوں بھائی کمان ہاتھوں میں لئے ہتھیار سجائے شاہانہ شانت کے ساتھ بازاروں میں جا رہے تھے اور

غزل

از حضرت شاد صوفی مدظلہ

قیس کی آنکھوں کا پردہ پردۂ محمل بنا
محو ایسا تھا حجابِ دید خود حائل بنا

شکر ہے اب امتحان حسن کے قابل بنا
ترچھی نظروں کا نشانہ اب میرا دل بنا

مختلف جلوؤں کا مرکز عشق میں یہ دل بنا
یہ کبھی مجنوں کبھی لیلےٰ کبھی محمل بنا

کوئی بھی راہ طریقت میں مجھے سا رہ نورد
رہنما جس کا خیالِ دوریٔ منزل بنا

کس قدر ذوق فنا ہے مد و جزر عشق میں
جب بڑھا دریا بنا جب گھٹ گیا ساحل بنا

قابل عبرت ہے دنیا کی دو رنگی منعمو
تاجِ جمشید و فریدوں کاسۂ سائل بنا

زینتوں سے ہو گئی آراستہ بزمِ وجود
کون ایسا تھا یہاں جو رونقِ محفل بنا

اک طلسمِ بیخودی ہے دل و فورِ عشق میں
کچھ خبر اپنی نہیں اس درجہ میں غافل بنا

پوچھتے کیا ہو حقیقت مجھ سے دردِ عشق کی
میرا ہی دل تھا جو اس کے رہنے کے قابل بنا

سو رہے ہیں پاؤں پھیلائے شہیدانِ وفا
باغِ جنت کا نمونہ کوچۂ قاتل بنا

اس لئے کرتا ہے وہ زندہ کہ پھر ہم پھر مریں
ہم مسیحا جس کو سمجھے تھے وہی قاتل بنا

اُٹھ گیا پردہ حجابِ انقلابِ دہر کا
آئینہ نیرنگیٔ عالم کا میرا دل بنا

ناخنِ تدبیر سے بھی اب نہیں کھلتی گرہ
حادثاتِ دہر سے دل عقدۂ مشکل بنا

پر شکن ہو کر ہوا سے بحر کی روشن جبیں
بھول کر بھی تو نہ گھبرا اپنا لبِ ساحل بنا

غرقِ دریائے محبت کی تجھے کیوں فکر ہے
چاہنے والوں کی تربت اب لبِ ساحل بنا

سیکڑوں جلوے نظر آنے لگے ہیں برقِ طور کے
کون سی تجلی تھی یارب جس سے میرا دل بنا

اللہ اللہ کیا دیا پیرِ طریقت نے سبق
میکدے میں شادؔ جا کر عارفِ کامل بنا

متھلا پوری کے لوگ جوق در جوق زیارت کے آرزومند ہو کر سڑکوں اور کوٹھوں پر جمع ہو رہے ہیں۔ تمام زن و مرد رام لچھمن کے جوش جوانی اور صورت نورانی کے گیت گانے لگے۔ راجہ جنک نے شاہانہ اعزاز و اکرام کے ساتھ دونوں کو اپنے خاص باغ میں مہمان کیا۔

دوسرے دن رام لچھمن شہر کی سیر کو نکلے۔ ادھر سے راجہ جنک کی جانکی جی باپ کی اجازت سے پاربتی جی کی پرستش کے لئے اپنی ہمجولیوں کے ساتھ خراماں خراماں آ رہی تھی۔ ایک ہمجولی نے اطلاع دی کہ یہ وہی فرشتہ صورت شہزادے ہیں جو کل اس شہر میں آئے ہیں اور تمام زن و مرد ان کے شیدا نظر آتے ہیں اتفاق سے سیتا و رام کی آنکھیں چار ہوئیں۔ جانکی جی نے اپنے دلی جذبات رام کے سامنے خاموشی سے پیش کئے۔ دل کے اندر الفت کی آگ کو بڑھتی ہوئی محسوس کیا۔ اور سے یقین ہو گیا کہ اگر کمان نے اس جوان کی قوت کی پذیرائی نہ کی تو خدنگ اجل کا خود نشانہ ہوگی اور یہ موت اپنے حق میں معراج کا درجہ حاصل کرے گی۔ دوسرے دن علی الصباح مشیران دولت اور وزیران سلطنت بسوامتر کے پاس حاضر ہوئے اور راجہ جنک کی طرف سے پیغام دیا دونوں شہزادوں سے عرض کیجئے کہ دھنش یگ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرف بخشیں اور سیتا جی کی سوئمبر کو دیکھیں۔

سوئمبر کی رسم ادا کرنے کے لئے ایک بڑا فراخ میدان شہر کی جانب شرق تجویز کیا گیا تھا۔ بیچ میں کمان رکھی گئی تھی اور چاروں طرف سونے کے شہ نشین راجاؤں کے بیٹھنے کے لئے بنا دئے گئے تھے ان شہ نشینوں کے پیچھے تمام تماشائیوں کی نشست گاہیں تھیں۔ عورتوں کے لئے علیحدہ جگہ آراستہ کی گئی تھی رام چندر جی اپنے بھائی کو ساتھ لئے ...... شاہانہ کرو فر کے ساتھ دھنش یگ میں آئے اور اپنی جگہ رونق افروز ہوئے۔ جب سب اپنے اپنے مقام پر بیٹھ گئے تو راجہ جنک کے حکم سے سیتا جی سولہ سنگار کے عروسانہ لباس میں دلربایانہ انداز سے آ پہونچی۔ راجاؤں کی نظر اس حسن کی دیوی پر پڑتے ہی کمان پر پڑی۔

اتنے میں نقیب نے شاہی حکم سے باواز بلند اعلان کیا۔ "اے راج پوتو، بہادرو یہ کمان جو کسی سے کھینچا تو درکنار اٹھتی تک نہیں، راون سے مدمغ اور مغرور کا زہرہ اس کمان کو دیکھکر آب آب ہو گیا تھا اب تمہارے سامنے پڑی ہے۔ اپنا اپنا زور شجاعت دکھاؤ اور اسے توڑو اس کا انعام حسن و جمال کی کان ہمارے شاہجہاں پناہ کی دختر جانکی جی ہے"۔

یہ اعلان سنتے ہی ہر ایک کی رگ حمیت حرکت میں آئی۔ باری باری اٹھے اور امتحان گاہ قوت و دلیری میں امتحان دینے لگے لیکن ناکامیاب ہوئے۔ راجہ جنک یہ دیکھکر غیظ و غضب میں آیا اور کہا کہ "آج دنیا بہادروں سے خالی ہو گئی۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ یہ کمان زمین سے ہل نہ سکی۔ کیا سورج بنسیوں کے آسمان پر کوئی آفتاب درخشاں طلوع ہوا ہی نہیں افسوس کیا میری پیاری بیٹی کی قسمت میں بیاہ ہی نہیں لکھا ہے۔ مگر میں اپنے عہد سے باز نہیں آ سکتا اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی نامرد کے ہاتھ میں ہرگز نہ دوں گا کبھی نہ دوں گا"۔ تمام مجمع پر سکوت چھا گیا، خاموشی طاری ہو گئی۔ راجاؤں کے چہرے پر پسینے کی نہریں جاری

ہوگئیں، گردنیں جھک گئیں۔ کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر لچھمن جی کو طیش آگیا، اپنے مقام سے اٹھے اور راجہ جنک کی طرف مخاطب ہو کر کہا "راجہ زبان کو سنبھال جب تک رگھو بنس کی نسل دنیا میں موجود ہے ایسے الفاظ زبان سے نہیں نکال سکتا۔"

اگر بھائی کا اپنے حکم پاؤں + کماں کو نوکِ ناخن سے اٹھاؤں
وہاں پھینکواسے توس قزح پر + کروں دونوں کے ٹکڑے برابر

یہ بوسیدہ کمان کیا ہے، پہاڑوں کو جڑ سے ہلادوں اور زمین کا طبقہ الٹ دوں۔ راجہ یہ سنکر شرمندہ ہو کر معافی خواہ ہوا۔ ادھر رامچندر جی بسوامتر کی اجازت سے کھڑے ہوئے دامن کمر میں گردانا۔ عجب نظارہ تھا۔ شیر دل شہزادہ آگے بڑھا کمان کے قریب پہنچ کر ایک نظر کمان پر ڈالی، پھر اپنی منظور نظر سیتا پر۔ پھر ایشور کا نام لیکر کمان کو اٹھایا اور کھینچکر ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینکدیا۔

فلک گفت احسن ملک گفت زہ

شکست کمان کی آواز کے ساتھ ہی رامچندر کی جے جے کے نعرے بلند ہوئے باجے بجنے لگے کسی کی خوشی کی انتہا نہ رہی، بلاامتیاز مرد و عورت رامچندر جی پر پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ رامچندر جی کامیابی کے جوش میں کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے ادھر سیتا جی رام کے گلے میں جے مالا ڈالنے کو آگے بڑھیں جنھیں ہمجولیاں جھرمٹ میں لئے ہوئے تھیں سیتا جی نے بے تابانہ گلے میں مالا ڈالا طالب مطلوب کا مطلب بر آیا۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی اور دو ہستیوں کی قسمتیں جو پہلی ہی نظر میں وابستہ ہو چکی تھیں آنچل اور دامن کی گرہ سے اور استوار ہو گئیں اور رام و سیتا کی زندگی کے نئے ورق الٹے جانے لگے۔

اب ہم تاریخ کے تمام اوراق الٹ کر سری رام چندر جی کے اس مشہور معرکہ کے میدان میں اترتے ہیں جو لنکا کے بادشاہ راون سے پیش آیا۔ سری رگھبر کی خداداد شجاعت کا امتحان بھی نرالا ہے۔ مغرور اور سرکش راون ایک بن سے سیتا جی کو بھگا لیجاتا ہے۔ سری رامچندر جی کی رگ حمیت حرکت میں آتی ہے ناموس کا معاملہ ہے۔ شجاعت کے لئے غیرت لازم اور ملزوم ہے۔ شجاع بھی کون؟ سری رام چندر چھتری النسل مظہر اسرار وحدت، کثرت میں وحدت کی شان دکھانے والا، وحدت میں کثرت کی محفل جمانے والا۔

کوسل کی سلطنت کا عام دستور یہ تھا کہ راجہ ضعیف ہوا تو سلطنت کے کام میں کسی لائق بیٹے اور وزیر کو شریک کر لیتا۔ راجہ دسرتھ بھی جب بوڑھے ہوئے تو یوراج (ولی عہد) کی فکر ہوئی۔ بھائی بند، رشتہ دار، نوکر چاکر آ گئے سب کی نظر رام پر تھی۔ راجہ بھی یہی چاہتے تھے مگر رائے سب کی لی اور سب نے متفق اللفظ رام رام ہی کہا۔ راجہ شاد ہوئے بیٹے کو بلا کر خوشخبری دی اور اس رسم کی ادائگی اور جشن کی تیاری ہونے لگی۔

رنواس میں بھی اس کا چرچا ہوا، ہر طرف شادی رچی، مگر رانی کیکئی کے گھر ماتم تھا انھوں نے دیکھا کہ اگر رام ولی عہد ہوا تو کوشلیا کا راج اور میرا زوال ہوگا اور جب تک بھرت راج نہ پائیں میری کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ یہ سوچ کر راجہ سے کہا کہ مہاراج آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ دو باتیں جو تم کہو گی ہم پوری کریں گے یہ اس کا وقت آگیا اب قول پورا کیجئے۔ راجہ خالی الذہن تھے انہیں کیا خبر تھی کہ کیا کہا جائے گا۔ "ہاں، ہاں وہ کونسی بات ہے جو تم کہو اور پوری نہ ہو" کیکئی تڑپ کر بولی کہ

بھرت کو راج
رام کو بن باس

یہ سن کر راجہ کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ بیٹے کو بلایا ماجرا سنایا راج کا وارث پاؤں پر گر کر بولا مہاراج۔

قول مرداں جان دارد

زبان ہار چکے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ماں اور بی بی کے پاس گئے حال کہا اور بن باس پر تیار ہو گئے۔ سیتا اور لچھمن انہیں اکیلا کیوں چھوڑتے دونوں ساتھ ہوئے اور تینوں نکلے محل ویران اور شہر سنسان ہو گیا۔ راجہ اس صدمہ کی تاب نہ لا سکا وہ بھی تمام ہو گیا۔

رامچندر جی کی مقدس زندگی کے واقعات میں راون سے معرکہ پیش آنے کی کتاب کا گویا یہی دیباچہ تھا۔ رام لچھمن اور سیتا کوسل سے نکلکر پراگ (الہ آباد) اور وہاں سے وندھیاچل کے جنگلوں اور پھر چترکوٹ کی پہاڑوں میں مناظر قدرت سے عرفانی سبق حاصل کرتے دکن تک آئے اور ناسک میں ڈیرے ڈالدیئے۔ ایکروز رام لچھمن شکار کو گئے ہوئے تھے۔ سیتا جھونپڑی میں تنہا ہیں۔ راون فقیر کے بھیس میں ہو کر صدا دیتا ہے کہ بھوکا ہوں ایشور کے نام کچھ دیدے۔ سیتا جی ہاتھ بڑھا کر (سیدھا)۔ دال چاول آٹا وغیرہ دیتی ہیں وہ کہتا ہے کہ

غزل

از حضرت شاد صوفی مدظلہ

نہ کرد لطف اگر یار آشنا چہ کند | بہ پیشِ قدرتِ حق آلِ مصطفےٰ چہ کند
اگر وقوف بود پیش دوست بیگانہ | شکایتِ منِ دلدادہ بر ملا چہ کند
کسیکہ گشت بذاتش فنا بقا یابد | شعورِ کثرت و سودائے ماسوا چہ کند
پرست ساغر دل از مے ولائے حسین | لحاظِ رندیِ آشام پارسا چہ کند

ق

بگفت حُرّ جری دست بستہ با مولےٰ | کسے مقابلہ باہندہ در وغا چہ کند
اگر دعا بکنی قتل سازم اعدا را | خدا چو فضل کند فوج اشقیا چہ کند

اگر وفا نکند با من آں بت عیار | ببینم ایں کہ بمن فضل کبریا چہ کند
درون بحر و غا تیغ من چو موج شکست | اگر خدا نکند فضل ناخدا چہ کند
بصدق سجدہ ببازیم و اعتراف گناہ | خلوص ہر کہ ندارد ز دل دعا چہ کند

علاج دردِ دلم شاد وصلِ محبوب است
بہ خستگانِ محبت اثر دوا چہ کند

نقیر آتا ہیں۔ آدمی سے بہ چھوٹ۔ سیتا جی حصار سے باہر نکل آتی ہیں۔ راون کو موقع ملتا ہے اور سیتا کو اٹھا لے جاکر لنکا پہنچاتا ہے۔ وہاں محل اور باغ بنواکر اس میں لالا دلی کے پھول کی طرح رکھتا ہے روز جاتا اور عشق جتاتا دام پھیلاتا ہے کہ وہ جس سے سب کاٹتیں اور رام کی یاد میں رات گزارتی ہیں۔

رام لچھمن شکار سے واپس آنے میں سیتا کو غائب دیکھ کر ڈھونڈنے نکلتے ہیں۔ پہاڑ پہاڑ جنگل جنگل مارے پھرے۔ پاؤں میں چھالے پڑے کہیں پتہ نہیں لگا آخر حال کھلا اور یہ دونوں لنکا کو چلے۔ ناسک سے اتر کر راجہ سگریو کے علاقے میں پہونچے وہ ان پر مہربان ہوگیا اور کوشل کا راجہ بالی کر ان کو فوج دی ہنومان کو سپہ سالار بنا کر ان کے ساتھ کیا۔ سب نکلے سمندر کنارے پہونچے۔ پانی زمین کاٹ کر ہند و لنکا دو کئے ہوئے تھا۔ ہنومان نے پل باندھ کر ایک کیا فوج ادھر چھوڑ کر ادھر اترا اور سیتا کی خبر لینے لنکا میں پہونچا۔ بھیس بدل کر کسی طرح اوس محل میں گھسا۔ سیتا جی سے ملا۔ حال کہا۔ ان کے بیٹھے ہوے دل کو اٹھا کر لوٹا۔ رام سے سارا قصہ کہا۔ اب ادہر سے فوج چلی لنکا پر چڑہی۔ راون بھی نکلا۔ لڑائی چھڑی۔ اٹھارہ دن خون کی ندی بہی۔ لنکا میں جو تھا سو باون گز کا۔ مگر اب بالشتوں سے بڑھ کر نہ تھے سب ٹکڑے ٹکڑے ہوئے ایک بھی زندہ نہ بچا۔ رام کی خداداد قوت نے راون کا کام تمام کیا۔ لنکا میں آگ لگی سارا شہر جلا اور جلکر راکھ ہوگیا۔ رام لچھمن ہنستے ہوئے محل میں آئے۔ رام سیتا سے ملے خوشی کے آنسو برسائے رانی کا ڈولا اپنی فوج میں لائے۔ ہنومان کی پیٹھ ٹھونکی۔ رام ایسے شجاع تھے اور ایسی عارف محقق تھے کہ آج اپنی دسرت کے سپوت رام کو۔ پرانکار جوتی سروپ جوت کیا بلکہ اصل ذات سمجھ کر رام رام کہتے ہیں اور نجات کے طالب ہوتے ہیں فقط

عالم پس پردہ

نواب نظامت جنگ بہادر القاہیم

ہوٹوں کا ایک باریک پردہ ساری دنیا کو ہم سے چھپا سکتا اور دشمن کو ایسا کر سکتا ہے کہ گویا وہ ہے ہی نہیں۔ کیا ہو اگر ایک تاریک نقاب ذہن پر ڈال دیا جائے ـــــ جہل یا نامکمل علم کا تاریک نقاب؟ ہم اپنے علم و اطلاع کے لئے اپنے حواس خمسہ پر بہت زیادہ تکیہ کرتے ہیں اور وہ ہمیں صرف اس چیز کی خبر پہنچاتے ہیں جس کو وہ محسوس کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ علم سے یہ نہیں کہتے کہ ان کے محدود احساس سے پرے کچھ بھی نہیں ہے، با ایں ہمہ ہم ہمیشہ یہ یقین رکھتے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ ہمیں کچھ اسی قسم کا پیام استخراجاً پہنچا رہے ہیں۔ ہمارے حواس اپنے فرائض وفا کیشی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں اور اگر ہمیں وہ اس سے زیادہ اطلاع نہیں دیتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دے ہی نہیں سکتے۔ وہ صرف ایک مرئی مادی دنیا میں عمل کر سکتے ہیں اور ہمارے گردوپیش کے کسی غیر مادی وجود کے (اگر کوئی ایسا موجود ہو) محرم نہیں بن سکتے۔

وہ صرف ایک غیر مادی ذہن ہی ہے جو ایک غیر مادی عالم میں عمل کر سکتا ہے۔ لیکن کیا اس زندگی میں ہم سے اس کا شخصی تجربہ ممکن ہے؟ ہم سے مستند طور پر کہا جاتا ہے کہ بعض اشخاص کو ایسی چیزیں دیکھنے کی قوت حاصل ہے جو آنکھ سے نہیں دکھائی دیتیں ـــــ غیر مجسم صورتیں اور غیر مرئی وجود جو ان کے پاس اتنے ہی اصلی ہیں جتنے کہ خود ان کی اپنی شخصیتیں۔ ہم دنیادار لوگ، جن کو بہتر علم رکھنے کا ادعا ہے، ان تمام باتوں پر مسکراتے اور استحقاراً معنی خیز انداز میں اس کو "تلبیس نظری" کہکر موضوع کو ختم کر دیتے ہیں۔ ہمیں یہ لفظ ہوشیار السانون نے سکھا دیا ہے اور یہ اب ہماری ملک ہو گیا ہے مگر کیا یہ ہمارے دوسرے بہت سے بظاہر فرلیسانہ کلام کی طرح ہماری "کم علمی" کا نشانِ امتیاز نہیں ہے۔ اس میں فرض کر لیا جاتا ہے کہ جو کچھ ذہن دیکھ رہا ہے وہ صرف وہی تصویر ہو سکتی ہے جو اس کے اندر سے خلا میں اس طرح پھینکی گئی ہے جیسے پردے پر تصاویر ڈالی جاتی ہیں اور پھر اس کو خودی اس طرح دیکھتا ہے جیسے کوئی شے نی الخارج کو دیکھے۔ ایسا بھی ہوتا ضرور ہے لیکن اس واسطے کہ ایسا ہوتا ہے کیا ہم پر اس نتیجے کا استخراج لازم ہے کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں واقع ہو سکتا یا ذہن کے لئے کچھ اور ممکن نہیں ہے؟ پیغمبروں اور اولیاء نے مکاشفات دیکھے ہیں اور ہم سے کہا ہے مگر ہم ان پر ایمان لانے میں دشواری محسوس کرتے ہیں اور کوشش کر چکے ہیں کہ ان کے تجربوں کی توضیح سائنس کی روشنی میں کریں، یا یوں سمجھے کہ اپنی کم علمی کی روشنی میں کریں۔

لیکن خوشی کی بات ہے کہ چند دنوں سے ہمارے اذہان میں ایک تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ سائنس ہی کے راستے سے سیدھے رخ میں کسی قدر اور آگے بڑھنے کے بعد ہم نے یہ دریافت کر لیا ہے کہ ذہن میں بعض ایسی مخفی قوتیں ہیں جو بعض مواقع پر اپنا عمل کرنے لگتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ کسی کو ایک طرح کی نیند یا بے ہوشی کی حالت میں لاکر یعنی اس کے حواس خمسہ کے عمل کو معطل کر کے اس کے ذہن میں ایک زیادہ بلند اور زیادہ قوی قابلیت اور تیز تر محسوسیت برانگیختہ کی جا سکتی ہے جو معمولی حالات کی بہ نسبت زیادہ فاصلے پر عمل کر سکتی ہے۔ کوئی شخص اس حالت میں منتقل کئے جانے کے بعد یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک دور دراز کے مقام میں کیا ہو رہا ہے اور وہاں وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے اس کا تفصیل سے حال بیان کر سکتا ہے۔ آخر یہ کیسے ہوتا ہے؟ حواس کے توسط سے تو نہیں، اس واسطے کہ وہ سردست مقفل کر دئے گئے ہیں، بلکہ کسی ایسی پُراسرار قوت کے ذریعہ جو ذہن کو محض خیال کے ذریعہ نہیں، بلکہ حقیقی احساس کے ذریعہ کسی دُور کی شے تک پہونچنے کے لئے حاصل ہے اس قوت کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ سوال پیدا کر دیتی ہے کہ آیا ذہن کے لئے اس وقت بھی یہی عمل کرنا ممکن ہے

جب کہ اس کا تعلق اس جسم سے توڑ دیا جائے جس میں اس کو رکھا گیا ہے یہ سوال اس سوال کے مشابہ ہے کہ آیا برقی کا اس مشنری سے علاحدہ ہو کر رہنا ممکن ہے جس کا ہم اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ برق ہماری خدمت گزاری کر سکے ؟ کہتے ہیں کہ ہماری بیٹریاں اور ہمارے تار وغیرہ برقی پیدا کرتے ہیں" مگر کیا در اصل وہ ایسا ہی کرتے ہیں یا صرف برانگیختہ کرتے اور اس قوت کو بروئے عمل کر دیتے ہیں ؟ ۔

فطرت کی قوتیں ایک "مشیت اعلیٰ" کی ہدایت کے بموجب کروڑوں صورتوں میں کروڑوں مادی پیکروں و انقلابات میں اپنے وظائف کی تکمیل کر رہی ہیں اور اسی کا ایک ذرہ عارضی طور پر ہمارے اس جسم میں ایک خاص انداز میں یہاں کام کرنے کی غرض سے رکھ دیا گیا ہے کیا ہمیں یہ فرض کرنے کا کوئی حق ہے کہ اس عارضی جسمانی رفاقت کی وجہ سے ہماری روح اس جگہ آزادانہ نقل و حرکت کی اپنی ابتدائی قوت کھو چکی ہے جس کو اب ہم نامعلوم کہتے ہیں ؟ "صاف مبنی" کلارو دیانس بغیر حواس ظاہری کے کہیت دور تک آگے جاتی اور ہمیں مطمئن کرتی ہے کہ ذہن یا حواس ... جسم ظاہری یا کسی اور مادی کارندے کے توسط کے بغیر خواہ وہ کچھ ہی ہو مستقلاً عمل کرتا ہے جب ذہن کی قابلیت کا اس وقت یہ حال ہے کہ وہ جسم میں محبوس ہے یہ حال ہے تو اس وقت اس سے کیا کچھ نہ ہو سکے گا جب کہ وہ ان تحدیدات اور پابندیوں سے آزاد ہو جائے گا جو اس کی زندانی زندگی لازماً اس پر عائد کر رہی ہے ؟ اس بات کا اعتقاد دشوار نہیں ہے کہ عام ذہن اس آزادی کے بعد جو کچھ حاصل کر سکتا ہے وہ ان غیر معمولی اذہان کی قوتوں کے احاطے میں تہیں داخل رہتا ہے جن کی نسبت ہم بعض اوقات سنا کرتے ہیں ۔ ان لوگوں میں جو اس پردے کا کام نہیں کرتے تا ایک ایسی حس سادس کے ذریعہ وہ خود پس پردہ اور مخفی دیکھتے ہیں جو ان سب سے زیادہ قابل اور طاقتور ہے ۔

جس عہد میں ہم رہتے ہیں اس نے مذہب کی بڑی خدمت کی ہے ۔ اس کو آنے والی نسلوں کی ستائش و احترام کا جو چیز مستحق بنائے گی وہ یہ حقیقت ہے کہ اس میں مذہب اور سائنس (حکمت) ایک ہی زمین پر ملنے شروع ہوئے تھے گو اس وقت بھی ایک دوسرے کا انکار کرتے رہتے تھے تاکہ سائنس نے مناظر قدرت میں اپنی عادت مستمرہ سے بڑھ کر عمیق تر اور زیادہ روحانی معانی پڑھنے شروع کر دیئے فقط ۔

اسلام اور یورپ

(مسٹر محمد مارماڈیوک پکتھال)

یورپ میں اسلام کی حالت اور اہل یورپ کا قلب

ہم نے ان دنوں ہندوستان میں اشاعت اسلام یورپ کی نسبت بہت کچھ سنا ہے مگر خود یورپ نے اس کی نسبت کچھ نہیں سنا ۔ چند خوش فکر افراد کی از خود تبدیلی مذہب اور مبلغین کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ذریعہ اس قسم کے اشخاص کی ایک خفیف سی تعداد کے قبول اسلام نے جو ہمیشہ کسی نئی چیز کی جستجو میں رہا کرتے ہیں یورپ پر قطعاً کوئی اثر نہیں ڈالا ہے اور کوئی چیز منتقل و سربرآ نہیں ہے ۔ اول الذکر قسم کے نومسلموں کی اولاد کی پرورش اکثر ویا مسلمانوں کی سی نہیں ہوتی اور ثانی الذکر قسم کے نومسلموں کے قلب کی یہ کیفیت ہے کہ سماجی ماحول کے دباؤ کے مطیع بنکر اپنے پہلے مذہب کی طرف عود کریں یا کسی اور جدت کی آغوش میں جا چلے جائیں وہاں کوئی مغربی اروپائی مسلموں کا ایسا فرقہ نہیں ہے جو اس ملک کے دیسی باشندوں پر مشتمل ہو، البتہ صرف ہنگری میں ایک ایسا بہت ہی چھوٹا سا فرقہ ہے ۔ برخلاف ایں، اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہاں مطالعہ مذہب کا ذوق و شوق بڑھ گیا ہے سد جنگ کے انہدام کے ذریعہ مسلمانوں کی عالمگیر قوت کی کامل بربادی نے اسلام کی طرف ایک ایسی زیادہ منصفانہ روش کا راستہ کھول دیا ہے جو کبھی پہلے ممکن نہ تھی ۔ سائنٹیفک تخیل نے موروثی اعتقادات کی جانب سے لوگوں کی نظر کے پردے چاک کر دیئے ہیں ۔ صاحبان فکر و خیال کسی ایسے مذہب یا ایسے فلسفے کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں جس میں دنیا کی نسبت نو دریافتہ حقائق کے شمول کی قابلیت ہو اسلام کی حقیقت معلوم کرنے اور تعصبات سے پیچھا چھڑانے کی خواہش موجود ہے اور مسٹر برنارڈ شا اس رائے کے اظہار کے خطر میں بڑھ چکے ہیں کہ مستقبل کا مذہب اسلام یا اسلام جیسی کوئی اور چیز ہوگی ۔

حقیقی اسلام اور رواجی اسلام کا فرق

مسٹر برنارڈ شا کی یہ رائے ان مسلمانوں کے لئے بھی ایک ذریعہ طمانیت ہو گئی ہے جن کا تصور تعلیمات اسلامی جدید سائنٹیفک خیال کا اتنا ہی مخالف ہے جتنا کہ ازمنہ وسطیٰ کی نصرانیت کا تھا ۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غلط فہمی کا کام کر رہی ہے قرآن اور پیغمبر صلعم کے مذہب میں اس مذہب میں جس نے سیکڑوں برس تک تنہا انسانی ترقی کا علم تھام رکھا تھا جس کے تنہا انسانی معلومات کے بیش قیمت ذخائر کو بربادی سے محفوظ رکھا تھا، جس نے جہل و توہم سے جنگ کی تھی، جس نے مخلوقات کی نسبت آزادانہ سوچنے اور آزادانہ دریافت کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، اس مذہب میں جس سے جدید یورپ نے ترقی کا شعلہ حاصل کیا تھا اس مذہب میں جس نے احیائے علوم اور اصلاح نصرانیت کے لئے الہام فراہم کر دیا تھا میں کہتا ہوں کہ اس مذہب میں اور اس طریقے میں فرق ہے جس نے تین صدیوں سے زیادہ عرصے سے مسلم اقوام کو اپنا حلقہ بگوش بنا رکھا ہے جس نے قیادت و سیادت کے مقام سے انہیں نکال کر اطاعت و فرمانبرداری کی حالت میں اور روشن خیالی سے نکال کر جہالت و نادانی میں پہنچا دیا ہے ۔

بایں ہمہ ہم میں اکثر ایسے ہیں جو ان دونوں قسم کے اسلام میں تمیز نہیں کر سکتے ۔ ہم اپنے آبا و اجداد کے رسم و رواج کو جس میں ایسی بہت سی چیزیں مخلوط ہیں جو ہمارے پیغمبر صلعم کی تعلیمات میں نہ تھیں اور جو اس عہد کے لئے نامناسب ہیں اسلام کی ایسی شاندار تاریخ ماضیہ کے ساتھ گڈمڈ کر دیتے ہیں جو ایک ایسے مذہب سے حاصل ہوئی تھی جس میں ہر زمانے کے انسانوں کی رہنمائی کی صلاحیت موجود ہے ۔

مغربی وضع کی طریق تبلیغ سے بیزاری اور تبلیغ کی حقیقی تدبیر

اگرچہ حالات یہ ہیں تاہم میں یورپ کو ایسے داعیوں کے بھیجنے کا مشتاق نہیں ہوں جو نصرانی مشنریوں کے اطوار کی نقالی کریں ۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا اس

اس قسم کے شنوں کو غیر اسلامی سمجھتا ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ ہر مغربی سرزمین میں ایک خوش انتظام مسجد کے ذریعہ اور اس سے بھی زیادہ ان مسلمانوں کی رفتار و گفتار کے ذریعہ موثر اور باوقار انداز میں اسلام کی نمایندگی ہو جو اس ملک کو تعلیم یا تفریح کے لئے جایا کرتے ہیں۔ جب حقائق اہل یورپ کے آگے پیش ہو جائیں گے تو جن میں سمجھ ہوگی وہ خود ہی اپنا مذہب بدل لیں گے۔ لیکن جب تک کہ مسلمانان عالم کی وہی حالت رہے گی جو اس وقت ہے، اگر کوئی مغربی یورپی قوم کوئی ایسا مذہب اختیار بھی کرلے گی جو اپنے تمام لوازم میں اسلام کے مانند ہو تو بھی وہ اپنے آپ کو ہم سے الگ رکھنے کی خاطر اس کا کوئی اور نام رکھ لے گی۔ پس ہمارے کرنے کا حقیقی کام یہ نہیں ہے کہ یورپ کو نو مسلم بنائیں بلکہ خود اپنی ہی اصلاح کریں۔ اکثر اشخاص دن کے خوابوں میں فضول اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں اور اس مشکل کام میں ہاتھ ڈالنے سے گریز کرتے رہتے ہیں جو ان کے ہاتھ ہی کے پاس کہیں لگا ہوا ہے۔

اسلام کی دو شاخیں

میرا خیال ہے کہ ہمارے پیغمبر اسلام کے پیام سے بنی نوع انسان کو پہنچنے والے فائدوں کا دریا ٹھیک کے دو شاخہ ہوگیا ہے۔ یقیناً محض آج کے مسلمانان عالم کی حالت سے اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ بے تعصب مستشرقین اب اس امر پر متفق ہیں کہ موجودہ تہذیب اپنے آغاز میں نصرانیت سے زیادہ اسلام کی ممنون احسان ہے خصوصاً اپنے سائنٹیفک پہلو کے اعتبار سے۔ وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے یونانی، ایرانی اور ہندوستانی تحقیقاتوں کے نتائج کو محفوظ اور منضبط کیا اور انہیں یورپ حاضرہ کی رسائی میں پہنچادیا، وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے خالصتہً استقرائی طریق کا استعمال کرکے اصول جدیدہ پر سائنٹفک یا حکمی ترقی کی ابتدا کی نہیں، ایک غیر مسلم فاضل مصنف نے یہاں تک لکھا ہے کہ استدلال، استقرائی طریقہ جو طریقہ ماضر اور کیمیاوی ایجاد و اختراع کی شاہ کلید ثابت ہوچکا ہے، نہایت واضح طور پر تعلیمات قرآنیہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ ر محمد اقبال نے کہا ہے کہ اس سے اس بات کی توضیح ہورہی ہے کہ کیوں ہمارے پیغمبر خاتم المرسلین ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ نے انسان کو اس کو ساری آئندہ ترقیوں کی کنجیاں عطا فرمادی ہیں، خواہ وہ ترقیاں روحانی ہوں یا مادی، عمرانی ہوں یا سیاسی، آئندہ سے ہمیشہ انہی کی ساعی کا نتیجہ رہیں گی۔ اسلامی پیام کے سائنٹفک یا حکمی اور مادی حصے کو یورپ نے تھیک اس لمحہ اٹھالیا جب کہ مسلمان مولویت اور مدرسیت کے اسی مرض سے شل ہوکر ان کو ترک کر رہے تھے جس نے ازمنۂ وسطے میں یورپ کے دماغ کو مفلوج بنا دیا تھا اور یورپ نے اس کو اس طرح اٹھالیا ہے کہ کھویا نہ جاسکے۔ لہٰذا اسلام کا پیام بدبختی سے آج دو حصوں میں منقسم ہوگیا ہے، ایک تو وہ مذہبی ہے جس میں حکمی فکر و خیال اور مادی ترقی کا فقدان ہے، اور دوسرا وہ مادی جس میں مذہبی اقدار کے فقدان کی معیت ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں ناتکمل ہیں۔ اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ان دونوں کو کس طرح متحد کیا جائے۔

ہمیں کیا کرنا چاہیئے

مفتی اعظم مصر مرحوم شیخ محمد عبدہ نے ایک مرتبہ یہ کہا تھا کہ اہل یورپ کو اسلام سے جو نفرت ہے اس کے لئے عرب قابل ملامت ہیں۔ اس واسطے کہ یہ لوگ ہمارے مذہب کو ہمارے آئینے میں سے اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی میلی کھڑکی سے اندر نظر ڈالے" مگر اس کے لئے عرب ہی قابل ملامت نہیں ہیں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کے مستقبل کا انحصار مسلمانوں کے کردار پر ہے۔

اسلام کی عالمگیر قوت

اسلام کی عالمگیر قوت کے ہبوط و زوال نے ہمیں تاریخ کا ایک سب سے بڑا موقع فراہم کردیا ہے، ایک ایسا موقع جو شرمناک صلح حدیبیہ کے بعد جب کہ جنگ کی دیوار ڈھا دی گئی تھی اور دونوں طرف کے لوگ آپس میں آزادانہ گفتگو کرسکتے تھے، صدر اول کے مسلمانوں کو ملا تھا، اور ان دو سالوں کی نو مسلموں کی تعداد جن میں یہ صلح قایم رہی تھی قبل کے تمام سالوں کے نو مسلموں کی تعداد سے بہت بڑھی ہوئی تھی"۔ ہم کو اب مسلمانانِ صدر اول ہی کے ایمان و عمل کی پیروی کرنی ہے۔

(ختم شد)

غزل

از نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

رندوں کو غمِ بادۂ گلفام نہیں ہے — آنکھیں تو ہیں ساقی کی اگر جام نہیں ہے
جب تک خلشِ درد تھی اک گونہ مزا تھا — جب سے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے
چلنے کی اجازت ہی فقط تیغِ رواں کو — قاتل کی گلی رہگزرِ عام نہیں ہے
کیا جانے گیا لیکے کدھر ناوکِ قاتل — سینے میں خلش ہے دلِ ناکام نہیں ہے
بیخود مجھے بے جام کیا پیرِ مغاں نے — کہکر ترے حصے کا کوئی جام نہیں ہے
میں نے ہی ابھارا تھا نہیں قتل پہ لیکن — فہرست جو نکلی ہے مرا نام نہیں ہے
بیخوف کیا حُسنِ خداداد نے اُن کو — سو خون کریں روزانہ کچھ الزام نہیں ہے
میں خوش ہوں تصور بھی جسے بارِ گراں ہے — اُسکے لبِ نازک پہ مرا نام نہیں ہے
کچھ دام و قفس پر نہیں موقوف اسیری — بلبل کے لئے کیا رگِ گُل دام نہیں ہے
کٹتی ہے نہ گھٹتی ہے نہ ہٹتی ہے شبِ غم — اِس پر اثرِ گردشِ ایام نہیں ہے
ناداں ہیں جو دیتے ہیں جلیل آپکو الزام — اس دور میں کسکو ہوسِ جام نہیں ہے

تشکک اور متشککین

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

فلسفہ کی بنیاد جس وقت سے بھی پڑی، بحث واختلاف کا دروازہ بھی اسی وقت سے کھل گیا۔ طالیس یونانی سے لے کر برگساں فرانسیسی تک علت تکوین عالم سے متعلق صدہا نظریات قائم ہوتے چلے آئے ہیں، عموماً ایک دوسرے سے مختلف بلکہ اکثر مخالف ومتضاد۔ افلاطوں وارسطو، ڈیکارٹ واسپینوزا، لاک ولائبنز، بارکلے وہیگل، ان فلسفیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس پر اس کے حریفوں نے نہایت تشدد ومدے رد وقدح نہ کی ہو۔ لیکن اس قدر تخالف وتضاد کے باوجود کوئی شے ان سب فلسفیوں کے درمیان بطور قدر مشترک بھی رہی ہے۔ یہ مشترک شے کیا ہے؟ ان فلاسفہ کا یہ یقین کہ ہر حقیقت کا عقلی مدد سے انکشاف ان کے بس میں ہے۔ عالم کی تشکیل کا مدار ایک عنصر پر ہے یا زائد پر؟ عنصر حقیقی روح ہے، یا مادہ، یا دونوں؟ اس قسم کے سوالات کے جواب میں نفی یا اثبات کا جو بھی پہلو اختیار کیا جائے، بہرحال اتنا ہر فریق تسلیم کرتا رہا کہ اس نے عقل وفکر کی مدد سے رازہستی کو یقین کے ساتھ دریافت کرلیا ہے۔ گویا ان فلسفیوں میں مادئیین یا روحانئیین جو بھی ہوں وہ پہلے "مستیقنین[۵۲] (یا متحکمین)" ضرور ہوتے ہیں۔ مادیت، روحانیت، یا فلسفۂ الہیات کا کوئی سا بھی مذہب ہو، بہرحال یقین واعتقاد ہی کی کوئی نہ کوئی صورت ہوگی۔

غرض تفصیلات میں خواہ کتنا ہی اختلاف ونزاع ہو، تاہم فلسفہ کی تاریخ آغاز سے لیکر اس وقت تک تمام مذاہب فلسفہ میں یہ نقطۂ بحث عام ومشترک رہا ہے کہ انسان کی عقل میں رازجوئی اور حقیقت شناسی کی قابلیت ہے، اور انسان اپنی عقل کے زور سے علت العلل کی بابتہ صحیح نظریات ضرور قائم کرسکتا ہے۔ اتنا پتہ تو تاریخ سے چلتا ہے، باقی خود فطرت بشری کی بھی ساخت ہے کچھ اسی طریق فکر کے مطابق وموافق۔ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ابتدائے عمر میں انسان کو اپنے قوا پر کس درجہ اعتماد ووثوق ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو، تو وہ شاید دنیا کا کوئی کام انجام ہی نہ دے سکے۔ کچھ انسان کی سرشت ہی میں زود اعتقادی وعمل پسندی رکھ دی گئی ہے۔ ہاں جب اپنی کمزوری اور نارسائی کے بار بار تجربات ہوتے ہیں، جب کہیں جاکر اس میں اپنے متعلق بدگمانی پیدا ہوتی ہے، اور وہ خود اپنے اعمال وافکار کو تشکک وتنقید کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ شروع شروع وہ دوسروں کو جس راہ پر چلتا دیکھتا ہے، خود بھی اسی پر پڑ لیتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے، کہ اپنے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرلیتا ہے، اس طرف اس کا ذہن کہیں مدتوں ہی میں منتقل ہو سکتا ہے، کہ جس شے کو وہ رفتار سمجھ رہا ہے، وہ حقیقتاً رفتار ہے بھی، یا محض واہمہ کی نقش آرائی۔

دوسرے علوم وفنون کی طرح بالکل یہی حال فلسفہ کا ہوا مابعدالطبیعات کے میدان میں صدیوں کے بحث وجدال اور ہنگامہ آرائیوں کے بعد جب اختلاف کم ہونے کی جگہ روز بروز بڑھتا اور پھیلتا ہی گیا، تو آخرکار یہ رائے قرار پائی، کہ اب تک سارے سوالات، دیوار ودر، سقف ومحراب سے متعلق تھے، حالانکہ اگر عمارت کی استواری مقصود ہے تو پہلے بنیاد کی خبر لینا چاہیئے۔ یہ مسئلہ تو بعد کا ہے کہ دنیا میں عقلاً وجود حقیقی کس شے یا اشیاء کا ثابت ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ طے کرنا ہے کہ آیا انسان کے لئے عقل کی وساطت سے کسی حقیقت کا علم ممکن بھی ہے؟

بانی فلسفہ یونان طالیس سے لیکر دیمقراطیس تک، فیثاغورث، انکسامندر، انکسامینس، ہرقلطس، امپدقلس، انکساغورث وغیرہ، بیسیوں مشاہیر حکماء پیدا ہوتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک نے الہیات میں اپنا ایک ایک نیا نظریہ قائم کیا، اور جس طرح بت پرستوں کے بت الگ الگ ہوتے ہیں، ہر فلسفی اپنے لئے ایک ایک الگ فلسفہ تراشے ہوئے تھا، ایک جسے مانتا، دوسرا اسی کو جھٹلاتا، یہ جس کے آگے سر جھکاتا، وہ اسکی ہنسی اڑاتا۔ اس میں جزر کا آنا ناگزیر تھا، لوگ تناقضات فلاسفہ کو دیکھکر گھبرا اٹھے، اور الہیات کی جانب سے ایک بے اطمینانی بلکہ بدگمانی کی رو عام ہوگئی۔ اب تک ہر شے کی تنقید عقل کیا کرتی تھی، اب خود عقل پر تنقید شروع ہوگئی۔ اب تک سارے نظامات فلسفہ کا خلاصہ یہ تھا، کہ فلاں مسئلہ کی تحقیق عقل سے یوں ہوئی ہو فلاں مسئلہ عقل سے یوں ثابت ہوا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا، کہ خود عقل کے فیصلے کس حد تک ناطق تسلیم کئے جاسکتے ہیں؟ اور قوت عقل کے حدود کیا ہیں؟

تاریخ سے جہاں تک پتہ چلتا ہے، اس ردعمل کو جس گروہ نے سب سے پہلے باضابطہ شکل دی وہ لوگ یونان میں سوفسطائیہ کہلائے، ان کے سردار پروطوغورس وغورجیس ہوئے ہیں، ان کے مسلک کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

عالم موجودات نام ہے ایک سلسلۂ تغیرات کا، اور حواس سے جو کچھ محسوس ہوتا ہے، وہ اشیاء کا وجود نہیں، بلکہ صرف تغیر وحدوث ہے۔ پس اگر کوئی شے قدیم، واجب الوجود وقائم بالذات موجود بھی ہے، تو اس کا علم حواس کے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا، اور جب حواس کے ذریعہ سے اس کا علم ہی نہیں ہوسکتا تو اس کے علم کے لئے قوت عقلیہ وفکریہ پر کیونکر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اس لئے، کہ عقل، حواس سے الگ اور بے نیاز ہے کب، ہم جنھیں معقولات ومجردات سے تعبیر کرتے ہیں، وہ تو خود ہی محسوسات ومدرکات سے ماخوذ ومرکب ہوتے ہیں۔ پس حصول علم کے لئے جب حواس غیر معتبر ہیں، تو عقل کب رسا وقابل اعتماد ٹھہرتی ہے۔ اس کے علاوہ، جب انسان کے آلات ادراک تمامتر حواس ہی ہیں، اور یہ بدیہی ہے، کہ ہر شخص کے حواس دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، تو ہمارے سارے معلومات کی حیثیت محض اضافی ٹھہری، اور مختلف اشیاء کے وجود کا مفہوم ہم میں سے ہر شخص کے لئے الگ الگ ہوا۔

---

۵۱ اس مقالہ کے مطالعہ سے قبل اگر مقالہ "فلسفہ اور مذاہب فلسفہ" مندرجہ مبادی فلسفہ جلد اول پر ایک نظر کرلی جائے تو بہتر ہوگا۔

۵۲ "مستیقنین" ترجمہ ہے انگریزی فلسفی اصطلاح (Dogmatists) کا۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی مرحوم کے مشورہ وارشاد کے مطابق، پہلی بار اردو میں یہ اصطلاح لائی گئی تھی۔ بعد کو بعض حضرات نے (Dogma) کا ترجمہ "تحکم" سے کیا۔ ان کی اصطلاح میں (Dogmatists) کا ترجمہ "متحکمین" ہوگا۔ (۱۹۲۳ء)

ایک شے کسی کو سبز نظر آتی ہے، کسی کو زرد۔ زید کو چھوٹی معلوم ہوتی ہے اور عمرو کو بڑی۔ ہم ہیں کہ ایک شے کے وزن سے کچلے جا رہے ہیں، آپ ہیں کہ اس کو بلا تکلف ایک ہاتھ سے اٹھا لیتے ہیں۔ اب جب ہر قسم کے مدرکات و معلومات محض اعتباری نکلے، تو جن قضایا و کلیات کو ہم یقینیات کے درجہ میں رکھتے ہیں، ان کی حیثیت بھی اضافی ہی رہی۔ اور حقائق حقیقی معنی میں حقائق رہے ہی نہیں، بلکہ ان کے ما تحت حقیقت بھی، افراد مدرک کے اختلافات مزاج و حواس وغیرہ کے ماتحت و متناسب، ایک دوسرے سے مختلف قرار دینے پڑے۔

ان مقدمات کی بنا پر سوفسطائیہ نے کلیات ذیل قائم کئے :۔

(۱) دنیا میں وجود حقیقی کسی شے کا نہیں۔

(۲) اعدا اگر ہو بھی، تو ہمارے پاس اس کے علم کا کوئی ذریعہ نہیں۔

(۳) اور پھر بالفرض کوئی ذریعۂ علم ہو بھی، تو اس علم کو دوسرے تک نقل کرنا قطعاً ناممکن ہے۔

ان نتائج کے لحاظ سے سوفسطائیہ کے نزدیک، اشیاء کا حسن و قبح ذاتی ایک بے معنی لفظ تھا۔ ان لوگوں کا ایک معمول یہ ہو گیا تھا، کہ ابھی ایک شے کے اثبات پر زور و شور، شد و مد سے تقریر کرتے اور ابھی خود ہی ویسے ہی زور و قوت کے ساتھ اس کی نفی و ابطال کے دلائل دینے لگتے۔ اس گروہ سے فلسفیوں کی متانت و سنجیدگی مفقود ہو گئی۔ فلسفہ کے اصول، اور منطق کے قوانین ان کے نزدیک ایک تماشہ تھے، محض سامعین کی دلچسپی یا اپنے اظہار کمال کے لئے جب چاہتے، سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنے لگتے، اور حاضرین محفل سے خوب خوب داد و تحسین حاصل کرتے۔ گویا ان کا فلسفہ یہ تھا، کہ جب دنیا میں حق و صداقت بذات خود کوئی شے ہی نہیں، بلکہ جسے چاہے حق اور جسے چاہے باطل ثابت کیا جا سکتا ہے، تو پھر انسان اپنے جاہ و اقتدار سے کیوں دست بردار ہونے لگے؟ بس اسی نظریہ پر ان کا عمل تھا۔ مجلسوں اور محفلوں میں زبان آوری و طلاقت لسانی کے کمالات دکھاتے اور نام پیدا کرتے رہتے۔

سوفسطائیوں کے بعد ہی، یونان کی سرزمین پر، ان کے خلاف شدید ردعمل شروع ہوا۔ فلاطون و ارسطو، وغیرہ بیسیوں مشاہیر فلاسفہ یکے بعد دیگرے پیدا ہونے لگے، جنھوں نے ماہیت اشیاء پر تقریریں بڑے دم دعوے سے کیں۔ حقائق موجودات سے متعلق نظریات پر نظریات مدعیانہ لب و لہجہ میں پیش کئے، انکشاف اسرار ہستی کے بے باکانہ دعوے کئے، اور سوفسطائیت کا لقب، تحقیر و تذلیل کے موقع پر استعمال ہونے لگا۔ لیکن استقلال و ثبات، فلاسفہ و الٰہیئین کے اس دور کے نصیب میں بھی نہ تھا۔ کچھ روز کے زور و شور کے بعد یہ طوفان بھی گزر گیا۔

تشکک کی بنیاد، اپنے اصلی معنی میں، اسی وقت سے پڑتی ہے۔ ارسطو کے آخر زمانہ میں ایک شخص پرہو[1] پیدا ہوا، جس کا نام عربی مصنفین بیرون لکھتے ہیں۔ اس نے عقل انسانی کے واسطہ سے ادراک حقائق اشیاء کی قابلیت کا یکسر انکار کیا۔ وہ کہتا ہے کہ مسائل مابعد الطبیعیات میں مشغولیت انسان کے لئے مضر بھی ہے اور بے معنی بھی۔ مضر اس لحاظ سے کہ بجائے سکون و اطمینان قلب کے، ان سے قلب کی بے اطمینانی و اضطراب میں اضافہ ہوتا ہے، اور بے معنی اس حیثیت سے، کہ عقلی دلائل سے ہر مسئلہ کی نفی و اثبات دونوں کو یکساں قوت کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ پرہو کے نتائج افکار کا خلاصہ قضایائے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے :۔

(۱) ماہیت اشیاء کا علم ہو نہیں سکتا۔

(۲) اس لئے انسان کو اپنی قوت فیصلہ معطل رکھنا چاہیئے، یعنی کسی مسئلہ پر نفیاً یا اثباتاً کوئی سا بھی حکم نہ لگانا چاہیئے۔

(۳) اس تعطل قوت فیصلہ اور سکوت مطلق سے وہ سکون قلب و اطمینان خاطر حاصل ہو جائے گا جو حیات انسانی کا عین مقصود و مطلوب ہے۔

اجمال کی تفصیل بھی خود پرہو کی زبان سے سنیئے۔ کہتا ہے کہ ہمارے معلومات تمامتر دو چیزیں ہیں، محسوسات و معقولات۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ماہیت اشیاء کا علم کس ذریعہ سے ہونا ممکن ہے؟ کیا حواس کے ذریعہ سے؟ لیکن حواس تو بداہتہً صرف ظواہر اشیاء کو بتاتے ہیں، ماہیت سے انھیں سروکار نہیں۔ پھر کیا عقل کے ذریعہ سے؟ لیکن عقل تمامتر ہماری عادات اور ہماری سوسائٹی کے رسم و رواج کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اختلاف عادات ہی کا نتیجہ ہے، کہ ہر شخص کی عقل دوسرے سے مختلف ہوتی ہے پس ماہیت اشیاء کا علم، خواہ واسطۂ حواس ہو، خواہ واسطۂ عقل، دونوں واسطوں سے ناممکن ہے۔ ایسی حالت میں ایک دانشمند شخص کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ نظری طور پر اشیاء کے حسن و قبح پر حکم لگانے سے سکوت مطلق اختیار کیا جائے، اور عملی زندگی میں افعال کے ترک و اختیار دونوں سے احتراز رکھا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا، کہ تسکین خاطر حاصل رہے گی، جو فلسفہ و مابعد الطبیعیات کے مناقشات میں پڑ کر بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔

پرہو کا ایک شاگرد ٹائمن ہوا ہے، اس نے فلاسفہ کے خلاف اپنے استاد کے دلائل پر اس جرح کا اور اضافہ کیا، کہ یہ لوگ اوّلیات کو بلا دلیل و بے ثبوت کیسے صحیح تسلیم کرتے ہیں، درانحالیکہ ان کے اصول پر ہر شے کے تسلیم کرنے کے لئے کوئی منطقی دلیل ہونا چاہیئے۔ پھر اگر اوّلیات پر کوئی دلیل قائم کی گئی، تو وہ محتاج دلیل ٹھہرے اور ان پر اولیات کی تعریف ہی صادق نہ آئی۔ غرض دونوں صورتوں میں مستیقنین کے لئے کوئی مفر نہیں، اعتراض ان کے مسلک پر ہر صورت میں وارد ہوتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے متشککین اور سوفسطائیہ کے ڈانڈے الگ ہوتے ہیں۔ مستیقنین (یا متحکمین) حقائق اشیاء کے بارے میں ایجابی دعوے کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم فلاں فلاں مسائل کو عقل کی مدد سے قطعی طور پر ثابت کر سکتے ہیں۔ سوفسطائیہ کے مقابلہ میں اعتقاد و تحکم کی اسی قوت کے ساتھ سلبی پہلو اختیار کرتے تھے، اور کہتے تھے، کہ ہم فلاں فلاں مسائل کا بطلان قطعی طور پر کر سکتے ہیں۔ متشککین کا راستہ ان دونوں سے الگ تھا۔ ان کا مسلک لاعلمی کا تھا اور وہ کہتے تھے کہ اثبات و نفی کے ان دونوں طریقوں میں ادعائے علم مشترک ہے، ان کا کہنا تھا کہ ہم حقائق اشیاء کے منکر یا ان کے بطلان کے مدعی بھی نہیں، بلکہ صرف اتنا کہتے ہیں، کہ ہمیں ان کا علم نہیں۔ سوفسطائیہ علم عدم کے مدعی تھے، اور متشککین عدم علم کے۔

ارسیسلاس (۳۱۶ تا ۲۴۰ ق م) نے اکاڈمی کی بنیاد ڈالی۔ وہ اپنے تشکک میں نظری حیثیت سے، پرہو سے بھی ایک قدم آگے تھا۔ پرہو عدم علم کا قائل تھا، لیکن ارسیسلاس نے ایک دقیق نکتہ یہ پیدا کیا، کہ عدم علم کا دعوٰے، گو دعوے سلبی ہے لیکن ہے تو دعوے ہی اور دعوے کسی قسم کا، اور کسی صورت میں بھی ہو، تشکک مطلق کے منافی ہے۔ اس بنا پر ارسیسلاس یہ کہتا تھا کہ ہم حقائق اشیاء سے اس قدر لاعلم ہیں، کہ خود اپنی لاعلمی تک کا علم نہیں رکھتے! اور کچھ نہیں جانتے، یہاں تک کہ اپنے نہ جاننے کو بھی نہیں جانتے! اس پر اعتراض یہ ہوتا تھا، کہ اس تشکک محض اور ارتیاب مطلق کے ساتھ دنیا میں کے گھنٹے گزر کرنا ممکن ہے؟ اس کے جواب میں یہ متشکک کہتا ہے، کہ گو ہم نظری و اعتقادی حیثیت سے تشکک محض، اور ہر طرح کے یقین و ادعاء سے محترز ہیں، لیکن عملی زندگی کے اصول، نظری زندگی سے کسی قدر مختلف ہیں۔ یقین کامل نہ ہم عملی زندگی میں بھی کسی مسئلہ کا نہیں رکھتے، لیکن روزانہ

---

[1] سنہ ولادت تقریباً ۳۶۵ قبل مسیح

ضروریات کے لئے ہم اتنا بداہتہً سمجھ سکتے ہیں، کہ کسی مسئلہ کا ایک پہلو بمقابلہ دوسرے کے راجح ہے، اور عمل کے لئے بس اسی قدر رجحان کافی ہے۔

اس کے تقریباً ایک صدی بعد کارنیڈس پیدا ہوا، جو اپنے اعتقاد و اعمال میں قدمائے سوفسطائیہ سے غایت مشابہت رکھتا تھا۔ چنانچہ جب روم گیا ہے، تو پہلے دن عدل کے محاسن پر اس خوبی سے تقریر کی کہ تمام جلسہ نعرہ ہائے تحسین سے گونج اٹھا۔ لیکن دوسرے ہی دن اس نے اپنی پہلی تقریر کی تردید اس زور و قوت کے ساتھ کی کہ حاضرین دنگ رہ گئے۔ کارنیڈس کا ایک خاص کارنامہ یہ ہے، کہ اس نے اپنی پرزور نکتہ چینی سے حکماء رواقیین کے فلسفہ کی بنیادیں متزلزل کر دیں۔ وہ کہتا ہے کہ رواقیین اپنے خدا کو عالم کی روح قرار دیتے ہیں، پس خدا جب روح ٹھہرا، تو لازمی ہے، کہ وہ روح کے خواص بھی رکھتا ہو اور روح کا ایک خاصہ قابلیت احساس ہے، تو گویا خدا مختلف احساسات سے متحس ہوتا ہے لیکن احساسات سے متاثر ہونے کے یہ معنی ہیں، کہ اس میں قبول تغیرات کی صلاحیت موجود ہے، اور جو شے متغیر ہوتی ہے، وہ حادث ہوتی ہے۔ پس رواقیین کا خدا حادث ٹھہرا۔ حالانکہ خدا کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ازلی و ابدی ہو۔ اس کے علاوہ اگر خدا کا وجود ہے تو دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ محدود ہوگا، یا غیر محدود۔ اگر محدود ہے تو بداہتہً اس پر خدا ہونے کی تعریف صادق نہیں آتی اور اگر غیر محدود ہے، تو ضرور ہے کہ وہ ازلی، ابدی، ناقابل تغیر و ناقابل حرکت ہو یا دوسرے لفظوں میں وہ کوئی زندہ جاوید وجود نہ رکھتا ہو، کہ یہ صورت بھی شان کبریائی کے منافی ہے۔ اس کے علاوہ خدا یا تو نیک کردار ہوگا، یا ایسا نہ ہوگا۔ شق اول کے تسلیم کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ و برتر اخلاقی قانون کا پابند ہے، اور یہ پابندی صریحاً اس کی خدائی عظمت کی نفی ہے۔ لیکن اگر شق دوم صحیح ہے تو کون ایسی ہستی کو خدا تسلیم کرے گا، جو نیک کرداری کے وصف سے معرا ہو؟ غرض اس طرح رواقیین نے خدا کے متعلق جو جو تخیلات قائم کئے ہیں وہ سب (کارنیڈس کہتا ہے کہ) باہم متناقض اور ناقابل قبول ہیں۔

رواقیین کے یہاں ایک خاص مسئلہ یہ تھا، کہ جن محسوسات کی تردید کبھی ہمارے تجربہ میں نہیں ہوئی انھیں حقائق کے درجہ میں رکھنا چاہیئے، لیکن کارنیڈس دریافت کرتا ہے کہ اس دعوے کے معنی کیا ہیں؟ کیا ہمارے پاس کوئی معیار ایسا ہے، جس کی بنا پر ہم فیصلہ کر سکتے ہیں، کہ فلاں فلاں محسوسات کی تردید کبھی انسانی تجربہ میں نہیں آئی ہے؟ کیا حالت خواب و سرسام میں جو صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں ان کی بابتہ عین اسوقت ہمارا یہ یقین نہیں ہوتا کہ ان کی محسوسیت ناقابل تردید ہے؟ یا کیا اسی طرح ایک دیوانہ اپنے مجنونانہ محسوسات کو اسی قدر قطعی و یقینی نہیں خیال کرتا، جتنا کہ ایک صحیح الحواس شخص اپنے محسوسات کو؟ پھر جن محسوسات کو ہم غلط قرار دیتے ہیں، اور جن کو صحیح، کیا ان کے درمیان کسی خاص نقطہ پر کوئی حد فاصل قرار دینا ممکن ہے؟ دراصل، غلطی کے حدود صحت کے ساتھ، اور صحت کے حدود غلطی کے ساتھ ایسے پیوست اور گھلے ملے ہیں، کہ کسی خاص نقطہ پر ان دونوں کے درمیان خط تفریق کھینچ ہی نہیں سکتے۔ پس ایسی حالت میں کسی شے کو قطعی طور پر حقائق کے درجہ میں رکھنا بھی ممکن نہیں۔

لیکن اگر یقینیات کا علم، انسان کی دسترس سے باہر ہے تو اس متشکک نے کہا، کہ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ عملی زندگی میں، احتمالات و ظنیات سے فائدہ اٹھانے میں تامل کیا جائے۔ کارنیڈس کہتا ہے، کہ ظن و قیاس کے تین درجے قرار دینا چاہیئے۔ سب سے ابتدائی طبقہ میں وہ ادراکات داخل ہیں، جو بجائے خود صحیح معلوم ہوتے ہیں، لیکن ہمارے دوسرے ادراکات کے مطابق نہیں۔ اس سے اونچا یا طبقۂ اوسط ان ادراکات کا ہے، جن کی تائید ان کے متلازم و متعاصر ادراکات سے ہوتی ہو۔ اس کے بعد آخری اور سب سے بلند مرتبہ ان ادراکات کا ہے، جن کی تائید پر خود ان کے ادراکات متلازم و متعاصر کرے، اور ادراکات متلازم و متعاصر موجود ہوں۔ غرض اگرچہ انسان کو اعتقادی و نظری حیثیت سے، حقائق اشیاء کا علم ممکن نہیں، لیکن زندگی کی عملی ضروریات کے لئے بلحاظ ظن و قیاس تمام اشیاء میں ایک فرق مراتب و مدارج بالکل کافی ہے۔

کارنیڈس کے بعد تشکک کی قیادت انیسیڈمس کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے تشکک کی تائید میں دلائل ذیل قائم کئے:۔

(۱) اشیاء عالم کے خواص میں اختلاف۔ جو چیزیں ایک شخص کو ایک خاص صورت میں نظر آتی ہیں، وہی دوسروں کو اس سے بالکل مختلف محسوس ہوتی ہیں۔

(۲) اشخاص کے حواس و عقول میں اختلاف۔ جس کی بنا پر ایک ہی شے مختلف افراد پر مختلف اثرات ڈالتی ہے۔

(۳) (الف) ایک ہی شخص کے مختلف حواس کے درمیان اختلاف۔ جس کی بنا پر ایک ہی شے دیکھنے میں خوشنما معلوم ہوتی ہے، مگر چکھنے پر بالکل بدمزہ نکلتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی فرد کے حس باصرہ اور حس ذائقہ کے درمیان تخالف ہے۔

(ب) اس کے علاوہ ہم یہ پاتے ہیں، کہ ہر محسوس شے مختلف عناصر احساس سے مرکب ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سیب ہمارے سامنے رکھا ہے یہ چکنا ہے، گول ہے، سرخ و زرد ہے، خوشبودار ہے، شیریں ہے، وغیرہ۔ اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو یہ سیب ایک مفرد شے ہے، جو رنگ، شکل، وزن، ذائقہ، شم وغیرہ کی کوئی خاصیت اپنے اندر نہیں رکھتا، بلکہ مختلف حواس ان خواص کو اپنے لئے پیدا کر لیتے ہیں، اور یا اس کے خواص غیر محدود ہیں ان میں سے یہ چند خواص ہم کو اس لئے محسوس ہوئے ہوں، کہ ہم اسی قدر حواس رکھتے ہیں، اگر حواس کی تعداد زیادہ ہو تو خواص اشیاء بھی زیادہ تعداد میں معلوم ہونے لگیں۔ غرض محسوسیت اشیاء، دونوں شقوں میں، حواس ہی کے تابع ہے۔

(۴) ادراک اشیاء میں اشخاص کے اختلاف ماحول کے باعث تغیرات۔ جو شے بچپن میں ہمیں بھلی معلوم ہوتی تھی، جوانی میں اس سے نفرت ہو گئی۔ جو غذائیں بھوک کے وقت نہایت پر لطف معلوم ہوتی ہیں، حالت سیری میں کوئی لطف نہیں رکھتیں۔

(۵) ادراک اشیاء میں، اشیاء کے اختلاف ماحول کے باعث تغیرات۔ متحرک شے اگر بہت دور ہے تو ساکن نظر آتی ہے۔ لیمپ کی روشنی آفتاب کے سامنے تقریباً غیر مرئی رہتی ہے۔ ہاتھی کو فاصلہ سے دیکھو، چھوٹا اور حقیر سا جانور نظر آئے گا۔

(۶) کوئی ادراک خالص نہیں ہوتا، ہر ایک میں اجزاء غیر کی آمیزش ہوتی ہے۔ مثلاً آواز کہ اس کی تیزی یا دھیما پن، ہوا کی شدت و خفت پر مشروط ہے، یا اجسام کا وزن کہ ہوا میں زیادہ ہوتا ہے، پانی میں کم وغیرہ۔

(۷) اختلاف کمیت سے بھی کیفیات میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ شراب کا استعمال اگر حدود کے اندر ہو تو مفید ہے، بے اعتدالی کی حالت میں سم قاتل ہے۔ ریت کا ہر ہر ذرہ سخت ہوتا ہے، لیکن ریت کا تودہ نہایت نرم ہو جاتا ہے۔

(۸) ادراک صرف اشیاء کے تعلقات باہمی کا ہو سکتا ہے، نہ کہ ان کی ماہیت کا۔

(۹) عادات، ابتدائی تربیت، رسم و رواج وغیرہ کا اثر۔ ہم جس قوم میں پیدا ہوتے ہیں، اور جس سوسائٹی کے درمیان نشو و نما پاتے ہیں، اسی کے عقائد و خیالات، مذاق و مزاج، اطوار و عادات، غیر شعوری طور پر خود بخود اخذ کر لیتے ہیں۔ ایک عیسائی ہندوؤں کے خیالات پر ہنستا ہے، ایک پارسی یہودیوں کے رسم و رواج کی تضحیک کرتا ہے۔ ایک یہودی کو عیسائیوں کے معتقدات و عبادات عجیب سے معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس سب کی بنیاد اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی، کہ ابتدائے زندگی سے تعلیم و تربیت ہی ایسی ملی ہے۔ آج جس قوم یا مذہب کی کوئی بات عجیب معلوم ہو رہی ہے، اگر شروع سے اس کی باتیں مانوس ہوتیں، تو یہی عادات راسخ ہو گئی ہوتیں۔

مقدمات بالا سے انیسیڈمس، اس نتیجہ پر پہونچتا ہے، کہ ہمارے تمام معلومات ومدرکات محض ایک اعتباری یا اضافی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہم کسی شے کے متعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ فی الحقیقت کیا ہے۔

مستیقنین (یا متحکمین) کے سارے نظامات فلسفہ کا سنگ بنیاد مسئلہ تعلیل ہے فلاسفہ پہلے اسی کو ایک بدیہی حقیقت کی طرح فرض کرلیتے ہیں، کہ دنیا کی تمام اشیاء باہم قانون علت ومعلول سے وابستہ ہیں اور انسان کو ان کا علم ہوسکتا ہے، پھر اس کے بعد اسی بنیاد پر نتائج وکلیات کی عظیم الشان عمارتیں قائم کرتے ہیں۔ انیسیڈمس نے سرے سے اسی بنیاد کی بیخ کنی شروع کی، اور متعدد دلائل اس پر قائم کئے کہ قانون تعلیل کا تخیل ہی بے معنیٰ ہے۔ ان دلائل کی نوعیت کا اندازہ دو ایک نمونوں سے ہوگا۔

انیسیڈمس کہتا ہے کہ علت ومعلول کے درمیان زمانی حیثیت سے تین ہی رشتے ہونے ممکن ہیں۔ یا تو دونوں واقعات بالکل ہمزماں ہوں، یا علت موخر ہو اور معلول مقدم، اور یا علت مقدم ہو اور معلول موخر، ان میں سے شق دوم تو بداہتہً خارج از بحث ہے، جب علت کے بغیر اور اس کے وقوع کے قبل ہی معلول اپنا وجود قائم کرسکتا ہے تو ظاہر ہے، اسے اس علت کا معلول اور نتیجہ کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے؟ رہی شق اول، سو وہ اس لئے ناقابل قبول ہے کہ جب دونوں واقعات کا وقوع ٹھیک ایک ہی وقت میں ایک ہی ساتھ ہوا تو یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ فلاں شے فلاں سے پیدا ہوئی ہے؟ اور دونوں میں فلاں علت ہے فلاں معلول۔ اب صرف شق سوم باقی رہ جاتی ہے۔ اب فرض کیا، کہ دو واقعات الف اور ب ہمارے پیش نظر ہیں، ان میں سے الف کو علت اور ب کو معلول قرار دیا جاتا ہے اور یہ دعوے کیا جاتا ہے، کہ الف کا وجود ب کا وجود نہیں، اس وقت تو اسے علت سے موسوم کرہی نہیں سکتے (اس لئے کہ "علت بلا معلول" کے ایک بے معنی لفظ ہے) لیکن جوں ہی ب وجود میں آگیا، الف قطعاً بیکار ہوگیا، اس کی علیت مٹا جاتی رہی، اور اسے علت اب بھی نہیں قرار دے سکتے! گویا ایسا کوئی وقت ہی نہیں آیا، جب الف کو علت اور ب کو معلول قرار دیا جاسکے! پس علت ومعلول کا وجود، فلاسفہ ہی کے اصول منطق کی رو سے تینوں مفروضہ صورتوں میں ناقابل تسلیم ہے۔ اور ان تین کے سوا کوئی اور چوتھی شق تصور کی نہیں جاسکتی۔

اس کے علاوہ علت اگر تام ہے، تو اس سے معلول خود بخود پیدا ہوجانا چاہیئے، کسی اور شے کی اعانت کی حاجت باقی رہنی ہی نہ چاہیئے۔ حالانکہ فلاسفہ و الہٰیین کا اس پر اجماع ہے، کہ علت کے موثر ہونے کے لئے جس شے پر وہ عمل کررہی ہے، اس میں بھی قوت منفعلہ کا ہونا ضروری ہے۔

پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے، کہ آیا علت کے لئے صرف ایک ہی خاصہ ہوتا ہے، یا وہ متعدد خصوصیات رکھتی ہے؟ اگر شق اول صحیح ہے، تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس سے ہر حال میں، اور ہر موقعہ پر بعینہ یکساں نتائج نہیں ظاہر ہوتے؟ مثلاً آفتاب کی اگر ایک ہی خصوصیت گرمی تسلیم کی جائے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ نتائج کے ظہور میں ہر جگہ اور ہر وقت یکسانی دیکرنگی نہیں پائی جاتی۔ کبھی آفتاب چیزوں کو جلا دیتا ہے، کبھی اس سے صرف گرمی کا احساس ہوتا ہے، اور کبھی یہ بھی نہیں ہوتا، بلکہ صرف اسکی روشنی ہمیں محسوس ہوتی ہے وغیرہ، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ آفتاب کے متعدد خصوصیات ہیں، لیکن اگر یہ تسلیم کرلیا جائے تو چاہیئے یہ تھا کہ ان خصوصیات متعددہ کا ظہور ایک ساتھ ایک ہی وقت میں ہو، یعنی چاہیئے یہ تھا، کہ آفتاب جلانے، گرمی پہونچانے، روشنی پھیلانے کے کام ساتھ ہی ساتھ کرے۔ یہ نہو، کہ کبھی اس کی ایک قوت کا ظہور ہو اور دوسری کا نہو۔

اس سے بھی قطع نظر کرکے، عملی زندگی میں صدہا صورتیں ایسی پیش آتی ہیں جہاں یہ فیصلہ کرنا محال ہوجاتا ہے، کہ دو چیزوں میں علت کون ہے اور معلول کون۔ مثال کے لئے انجن اور انجن ڈرائیور کو لیجئے۔ ایک طرف یہ سب کو مسلم ہے کہ انجن کی حرکت کا باعث ڈرائیور ہے اور اگر ڈرائیور اپنی قوت کو روک دے، تو انجن میں مطلق حرکت نہیں رہ سکتی، لیکن دوسری طرف یہ بھی صریح مشاہدہ ہے کہ خود ڈرائیور کے جسم کو جو حرکت ہورہی ہے اس کا باعث محض انجن ہے، اور اگر انجن کی رفتار بند ہوجائے، تو ڈرائیور کا جسم بھی ساکن ہوجائے گا، ایسی حالت میں یہ فیصلہ کیونکر کیا جائے کہ ان دونوں میں فلاں علت ہے اور فلاں معلول؟

یہ چند مثالیں کافی ہوگئی ہوں گی، اسی طرح کے بیسوں دلائل اور ہیں، جن کی بنیاد پر انیسیڈمس نے تعلیل کے مسلم ومتعارف قانون کا ابطال کیا ہے۔

اس سے تقریباً ایک صدی بعد اگریپا پیدا ہوا، اس نے اپنے مشہور

[illegible]

نغمہ

از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

نعرۂ تکبیر بھی زاہد نثارِ نغمہ ہے — کسقدر اللہ اکبر؟ اعتبارِ نغمہ ہے
کیا سُریلی تھی صدائے حرفِ کُن روزِ ازل — آج تک رگ رگ ہماری بیقرارِ نغمہ ہے
عندلیبِ خوش نوا پر آنکھ ہے صیاد کی — نرگسِ شہلا سراپا انتظارِ نغمہ ہے
نالۂ دل ہمنوائے لحنِ مرغِ نخلِ طور — سیلِ اشکِ دیدۂ تر آبشارِ نغمہ ہے
کیا خبر کیا کہتی پھرتی ہے گلستاں میں صبا — پھول کی ہر پنکھڑی مستِ بہارِ نغمہ ہے
سازِ ہستی پر ہے اپنا تو مدارِ زندگی — ہوش میں لانا نہ لانا اختیارِ نغمہ ہے
آنکھ ہو تو کوئی دیکھے گوشِ عبرت سے سنے — نے میں ہر ہر روزنِ نے یک دیارِ نغمہ ہے
تفرقہ ہو اس طرح تو کیا جمے عشرت کا رنگ — دل ضعیف و ناتواں لب زیر بارِ نغمہ ہے

شعر دو ہیں حضرت غالب کے دیوان میں عزیز
یہ غزل میری اسی مے کا خمارِ نغمہ ہے

پیش دو کے دلائل کے قریب ہی قریب ذیل کے اصول خمسہ پر اپنے تشکک کی بنیاد رکھی:

(۱) اختلاف مفاہیم۔ یعنی الفاظ جو روزمرہ ہم استعمال کرتے ہیں، ان سے ایک شخص کے ذہن میں جو مفہوم پیدا ہوتا ہے، دوسرے کے ذہن میں بعینہٖ وہی مفہوم نہیں پیدا ہوتا۔ اس بنا پر حقائق کی تعلیم، تلقین و تبلیغ کا خیال ہی بے سود ہے۔

(۲) سلسلۂ علل کا لامتناہی ہونا۔ کسی شے کی اصل ماہیت اسی وقت دریافت ہوسکتی ہے، جب ہم اس کی آخری علت دریافت کرلیں، اور ایسا ہونا بداہتہً ناممکن ہے۔ ہم جس شے کو کسی واقعہ کی علت کہتے ہیں، وہ خود کسی دوسرے واقعہ کی معلول ہوتی ہے، اور یہ سلسلہ الیٰ غیر النہایۃ بڑھتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔

(۳) عقول و ادراکات بشری کا اضافی ہونا۔ ہم اشیاء کو صرف ان کے باہمی تعلقات اور مظاہر کے ذریعہ سے جان سکتے ہیں، ان کی ماہیت اصلی کی دریافت کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں۔

(۴) مقدمات کا نتائج پر مشروط ہونا۔ جن مقدمات کو ہم مسلم رکھکر کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ خود اس نتیجہ کی صحت پر مبنی و مشروط ہوتے ہیں۔ مثلاً انسان کے صاحب عقل ہونے کے ثبوت میں یہ کہا جاتا ہے، کہ وہ صاحب نطق ہے، حالانکہ نطق خود عقل و فہم کا نتیجہ ہے، نہ کہ عقل و فہم کی علت۔

(۵) اولیات کا بے دلیل ہونا۔ جن چند قضایائے اولیہ کی بنیاد پر ہم اپنے سارے فلسفے کی عمارت کا نظام کھڑا کرتے ہیں، وہ خود محتاج ثبوت ہوتے ہیں، اور خود ان پر کوئی دلیل قائم نہیں کہ انھیں بلا دلیل تسلیم کرلیا جائے۔ ہر جزو کا کل سے چھوٹا ہونا، اجتماع نقیضین کا محال ہونا وغیرہ اس قسم کے علوم متعارفہ بجائے خود دعوے ہیں، ویسے ہی محتاج دلیل جیسے وہ مسائل جو ان پر مبنی و متفرع ہیں۔

متشککین قدیم کا آخری سردار سکس‌ٹس امپریکس ہوا ہے۔ یہ بذات خود کچھ ایسا مجتہد الفکر نہ تھا، البتہ قدما جو کچھ سرمایہ چھوڑ گئے تھے، اسے اس نے بڑے آب و تاب کے ساتھ ایک جدید شکل میں دنیا کے سامنے پیش کردیا۔ اس کے فلسفہ کا خلاصہ مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:۔

حقائق اشیاء کا علم ہونے کے لئے یہ ضرور ہے، کہ پہلے حقیقت شناسی کا کوئی معیار مقرر کرلیا جائے، لیکن خود اس معیار کی صحت کا کیا معیار ہوگا؟ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نفس کا یہی مسئلہ کیونکر طے شدہ سمجھ لیا گیا ہے، کہ انسان کے لئے ادراک حقیقت ممکن ہے؟ آخر اس کا فیصلہ کس نے کیا ہے؟ کسی ایک شخص نے یا دنیا کے تمام اشخاص نے؟ اگر ایک شخص نے، تو وہ کون تھا؟ اور اسی پر قرعۂ انتخاب کیوں پڑا؟ اگر ساری دنیا نے، تو تمام افراد کی رائے کس طرح لی جاسکی؟ پھر، اگر بطور فرض مان بھی لیا جائے، کہ انسان کے لئے ادراک حقیقت ممکن ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کے کن قوا کے ذریعہ سے؟ کیا حواس کے ذریعہ سے؟ لیکن حواس تو ہر شخص کے دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، بلکہ خود ایک ہی فرد کے حواس عمر و زمانہ کے ساتھ متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ حواس سے جو علم ہوسکتا ہے، وہ محسوسات کا ہوگا۔ درانحالیکہ ماہیت اشیاء ان سے جداگانہ ایک چیز ہے۔ پھر کیا عقل کی وساطت سے؟ لیکن عقل تو ایک باطنی و غیر مادی قوت ہے۔ یہ عالم خارجی و مادی پر کیونکر حاوی ہوسکتی ہے؟ ان سوالات کے بعد ادراک ماہیت اشیاء کا دعوے ہر طرح مشکوک و مجروح ہوجاتا ہے۔

رواقیین کے یہاں ایک خاص مسئلہ یہ تھا کہ مظاہر طبعی کا وجود بجائے خود اس امر کی ایک زبردست دلیل ہے، کہ ان کے عقب میں اشیاء کی حقیقت پنہاں ہے، وہ





کہتے تھے۔ کہ علامات دو طرح کے ہوتے ہیں' ایک وہ علامات جو دوسرے مظاہر طبعی کے ساتھ وابستہ ہیں اور اپنی موجودگی سے صرف ان کی یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً آگ کی علت دھواں' یا۔ عدد کی علامت برق وغیرہ' دوسرے قسم کے علامات اس کے مقابل ایسے بھی ہوتے ہیں' جو کسی گزشتہ تجربہ کی یاددہانی نہیں کرتے' بلکہ کسی جدید وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں' مثلاً عام مظاہر طبعی' کہ خود ان کی تکوین اس امر کی دلیل ہے۔ کہ ان کے عقب میں حقائق اشیاء پوشیدہ ہیں۔ یہ رواقیہ کا عقیدہ تھا' اس پر سیکٹس جرح کرتا ہے' کہ کیا درحقیقت' اس آخرالذکر نوعیت کے علامات کا وجود ہے بھی؟ رواقیین کہتے ہیں کہ یہ علامات ظاہری' حقائق اصلی کے وجود پر دلالت کرتے ہیں' لیکن تا وقتیکہ ہم کسی شے سے فی نفسہ واقف نہ ہولیں' کیونکر بتاسکتے ہیں کہ فلاں شے اس کی علامت ہے؟ دلیل کی شناخت تو خود ہی مدلول سے واقفیت کی مستلزم ہے۔ اور تصویر کی صحت کا دعوے جب ہی کیا جاسکتا ہے' جب صورت سے واقفیت ہوئے۔ پس جب علامات میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وجود اشیاء کی دلیل بن سکیں' تو علامات یا مظاہر طبعی کی بناء پر حقائق اشیاء کے وجود کا نتیجہ نکالنا کس طرح درست ہوگا۔

منطقیین' تعریف پر بہت زور دیتے ہیں' سکٹس کہتا ہے کہ یہ مشغلہ ہی بے معنی ہے۔ جس شے کی تعریف مقصود ہے' وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا وہ ہمیں معلوم ہے' اور یا نامعلوم۔ اگر معلوم ہے تو اس کی تعریف کا بے سود ہونا ظاہر ہے۔ باقی اگر نامعلوم ہے' تو بھی ہمارے لئے کس حیثیت سے سودمند ہوسکتی ہے؟ اندھے کے سامنے روشنی' بہرے کے سامنے آواز' گونگے کے سامنے گویائی کی تعریفات کتنے ہی جامع و مانع پیش کی جائیں۔ کیا ان کے علم میں ان سے ذرہ برابر بھی اضافہ ہوگا؟

سیکٹس کی زندگی کے ساتھ ہی یونانی تشکک کا بھی خاتمہ ہوگیا' فلسفہ اور فلسفۂ تشکک دونوں کا آفتاب اپنے نصف النہار پر پہونچ کر ڈھلنے لگا۔ یونان و روم دونوں سے حریت فکری کی روح سلب ہوگئی' اجتہاد عقلی کی قوت باقی نہ رہی' اور عالم علوم میں جمود و سکون عام ہوگیا' نتیجہ یہ ہوا' کہ اب جو لوگ حکماء و فلاسفہ کے لقب سے متشہور تھے' وہ بھی سراسر تقلید و جمود کی بندش میں گرفتار' اور طرح طرح کی وہم پرستیوں میں مبتلا تھے۔ متشککین اب بھی سرے سے معدوم نہیں ہوئے' ان کی ایک اچھی خاصی

تعداد برابر پیدا ہوتی رہی' لیکن اب وہ جو کچھ کہتے تھے' وہ صرف قدماء کی صدائے بازگشت ہوتی تھی۔ اگریپا' مانٹین' چیران' سانچز' لی وآمیہ' گلینول' ہرنہا ئم' ہوئیٹ وغیرہ ایسے متعدد اشخاص بے شبہ ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے' جن کے سوانح و عقائد کی تفصیل سے تاریخ تشکک کے صفحات بآسانی پُر کئے جاسکتے ہیں' لیکن فلسفیانہ نکتہ سنجی و اجتہاد فکری کے لحاظ سے نہ ان لوگوں نے کوئی قابل ذکر تصنیف چھوڑی' اور نہ ان کے معتقدات کا فلسفہ کی تاریخ پر کوئی قابل لحاظ اثر پڑا۔ اوہام پرستی نام ہے افراط عقیدت کا' وہ جب دماغ میں جاگزیں ہونے لگتی ہے' تو تنقید و تشکک جو نام ہے تفریط عقیدت کا اس کے لئے پیشتر ہی سے جگہ خالی کردیتی ہے۔ تیسری صدی عیسوی سے لے کر سولھویں' سترہویں صدی تک یورپ عقلی حیثیت سے برابر توہم پرستیوں کا مرکز بنا رہا' اور اس طویل مدت میں فلسفۂ تشکک محض ایک قالب بے روح ہوکر رہا۔

اٹھارہویں صدی میں ڈیوڈ ہیوم نے اس قالب مردہ میں از سر نو روح پھونکی۔ جس طرح یونان میں پرہو اس وقت عالم وجود میں آیا تھا' جب سارا ملک افلاطون و ارسطو' دیوجانس و اقلیدس' زینو و اپیکورس کے نظریات متناقض کا تماشاگاہ بنا ہوا تھا' اسی طرح یورپ میں ہیوم کا تشکک اسی وقت چمکا' جب فلسفہ و مابعد الطبعیات کی ساری فضاء پر بیکن و ڈیکارٹ' ہابس و لاک' لائبنیز و اسپینوزا' کے نظریات کی گھٹا میں چھا چکی تھیں۔ قدماء متشککین کی طرح ہیوم کی تصانیف آج ناپید نہیں' اور نہ اسے اپنے خیالات کی شرح کے لئے اغیار کی ترجمانی کی حاجت ہے۔ اس لئے اس کے نظریات کی تلخیص' کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔

ذہن انسانی جن معلومات کے مجموعے سے عبارت ہے' وہ نوعی حیثیت سے دو عنوانات کے ماتحت رکھے جاسکتے ہیں۔ ایک محسوسات' یعنی ہماری وہ بسیط کیفیات ذہنی' جو ہمارے حواس ظاہرہ و جذبات کے براہ راست معلول یا محکوم ہوں' مثلاً سننا' دیکھنا' سونگھنا' چلنا پھرنا' محبت کرنا وغیرہ' دوسرے تصورات' یعنی وہ کیفیات ذہنی جو بسیط حالت میں نہیں ہوتے' بلکہ محسوسات سے مرکب و ماخوذ ہوتے ہیں۔ دماغ کی قوت متصورہ بظاہر غیر محدود معلوم ہوتی ہے اور بیک نظر یہ خیال ہوتا ہے' کہ انسان جو کچھ چاہے تصور کرسکتا ہے۔ لیکن دراصل تصورات محسوسات سے

غزل

از مولوی امین الحسن صاحب بسمل

انھیں ذرا بھی تکلف ہوا نہ آنے میں
کرامتیں ہیں محبت میں دل کے جانے میں

اسطرح سے ہمیشہ مجھے جواب وہ دیں
بڑے مزے کا ہے اقرار مسکرانے میں

جنون اور بڑھا شوق ہوگیا دونا
نقاب بن گئی مشاطہ منہ چھپانے میں

سرورِ عیش فراواں تھا گھر تھا رشکِ ارم
وہ جلوہ پاش تھے جبتک غریب خانے میں

شریف روتے ہیں قسمت کو لوگ ہنستے ہیں
یہ کس طرح کا ہے اندھیر اس زمانے میں

یہ التفات نہو مشق ناز کی خاطر
کوئی غرض تو نہیں ہے مرے بلانے میں

وہ صبر و شکر کا بندہ ہے آسماں سے کہو
کمی ذرا نہو بسمل کے آزمانے میں

مقید و محدود ہوتے ہیں، اور بڑے سے بڑے صاحب فکر و تصور انسان کے بس میں بھی اس سے زائد کچھ نہیں کہ اپنے محسوسات ہی میں رد و بدل، حذف و اضافہ، ترمیم و تنسیخ کرکے کوئی تصور قائم کرلے، جو بظاہر پہلے سے نامعلوم ہوگا، لیکن حقیقتۃً سرے سے کوئی نیا تصور خلق کرنا ذہن انسانی کے دسترس سے بالکل باہر ہے۔ چنانچہ وہ تصورات جو محسوسات سے نہایت بعید اور بالکل غیر متعلق ہوتے ہیں، غور کیا جائے، تو وہ بھی محسوسات ہی سے ماخوذ ہوں گے۔ مثلاً خدا کا تصور جو ہم نے قائم کیا ہے تحلیل کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس میں ہم اپنی ہی ذات کا عکس، علم، حکمت، رحمت، قدرت وغیرہ کمالات کا غیر محدود اضافہ کرکے دیکھتے ہیں۔ اسی لئے ہر شخص کا خیالی خدا دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ثبوت یہ ہے، کہ جن چیزوں کے متعلق ہمارے دماغ میں محسوسات نہیں ہوتے، ان کے بارے میں ہم کوئی تصور بھی قائم نہیں کرسکتے، مثلاً اندھے کے ذہن میں روشنی کے متعلق، اور بہرے کے ذہن میں آواز کے متعلق کوئی بھی تصور نہیں پیدا ہوتے۔

ان تصورات کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہوتی، کہ محسوسات سے ماخوذ ہوتے ہیں، بلکہ اپنی تکوین میں ایک خاص ترتیب کے بھی پابند ہوتے ہیں، یعنی ہر تصور ایک سلسلہ کی مختلف کڑیوں کی طرح، کسی دوسرے تصور سے وابستہ و متسلک ہوتا ہے۔ یہ ترتیب و وابستگی ذیل کے قوانین ثلثہ کے تابع ہوتی ہے [۱]

(الف) قانون مماثلت۔ ہر تصور اپنے مماثل تصور سے وابستہ ہوتا ہے۔

(ب) قانون مقارنت۔ جو تصورات، زمانی یا مکانی حیثیت سے، ایک دوسرے کے مقارن و متصل ہوتے ہیں، ان میں باہم وابستگی پیدا ہو جاتی ہے۔

(ج) قانون تعلیل۔

سوال یہ ہے کہ کیا ان قوانین، خصوصاً قانون تعلیل، کا علم ہمیں بلا حواس ظاہری کی وساطت کے، محض جبلتہً ہو جاتا ہے، یا مثل دوسرے تصورات کے یہ تصور بھی محسوسات ہی سے ماخوذ ہوتا ہے؟ فلاسفہ عموماً شق اول اختیار کرتے ہیں، لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ کیا ایسا ہونا کسی حالت میں بھی ممکن ہے؟ ہم ایک گیند پر جب چوگان کی ضرب لگاتے ہیں، تو وہ تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگتا ہے، لیکن یہ علم ہم کو حسی تجربے ہی کی مدد سے حاصل ہوا، نہ ہم اس کا تجربہ حواس کی وساطت سے کرتے، نہ کبھی اس نتیجہ پر پہونچ سکتے، کہ چوگان کی ضرب، گیند کی حرکت کی علت ہے، خواہ محض چوگان اور گیند کی ساختوں پر غور کرتے کرتے اپنی ساری عمریں گزار دیتے! اس سے ظاہر ہے کہ قانون تعلیل کا تصور بھی دوسرے تصورات کی طرح محض محسوسات ہی کی وساطت سے پیدا ہوتا ہے، اور اگر ہم بالفرض کائنات کی کسی شے کا کبھی تجربہ نہ کریں، تو علت و معلول کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہی نہ ہو۔

اس کے بعد دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ نسبت تعلیل کا تصور، کن محسوسات سے ماخوذ ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے، کہ جس شے کو ہم قوت، باعث، علت، یا سبب کہتے ہیں، وہ بذات خود حواس ظاہری سے محسوس کرنے کی چیز مطلق نہیں۔ جو کچھ ہم اپنے حواس سے دیکھتے ہیں وہ اسقدر، اور صرف اس قدر ہے کہ فلاں شے فلاں کے بعد ہی وقوع میں آئی، لیکن اس کا جواب، کہ کون شے اس کے وقوع کا باعث ہوئی، ہمارے حواس سے ہمیشہ مجہول رہنے والا ہے۔ یہ بے شبہ ہم اپنی تمام زندگی میں پاتے ہیں، کہ برف کے ساتھ سردی اور آگ کیساتھ گرمی ہمیشہ پائی جاتی ہے، لیکن اس مسئلہ کا حل کہ ان دونوں چیزوں میں یہ لزوم کیوں ہے، ہمارے تجربۂ حسی و تجربۂ عقلی دونوں کی دسترس سے باہر ہے۔ لیکن یہ پہلے طے ہو چکا ہے کہ کوئی تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ حواس ظاہری یا باطنی سے ماخوذ نہو۔ پس تو کیا ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ تعلیل کا یہ تصور، جو ہر دو منقولہ متذکرہ میں سے کسی کے ماتحت نہیں آتا، سرے سے ہمارے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوتا؟ مگر اس کے وجود سے انکار کرنا، مطالعۂ باطن اور اپنے شعور کے ایک بدیہی نعرے کی تردید کرنا ہے۔

غرض یہ ایک نہایت ہی غامض و پیچیدہ سوال ہے، اور دقتوں سے نکلنے کا کوئی راستہ بظاہر نظر نہیں آتا، لیکن درحقیقت اس قدر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے حل کا ایک طریقہ ابھی باقی ہے، وہ یہ ہے کہ قانون تقوّد سے مدد لی جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے، کہ ہم جب کسی واقعہ کے معلول کے وقوع کے متوقع رہتے ہیں، سو اس توقع کی بنیاد ہمیشہ صرف عادت پر ہوتی ہے، فرض کیا کہ اس وقت ہمارے سامنے ایک نیا واقعہ پیش کیا گیا ہے، تو محض اس پر نظر کرتے رہنے سے بڑے سے بڑا حکیم، یا بڑے سے بڑا ذہین شخص یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اس کے کیا کیا معلول ہوں گے، تاوقتیکہ عملاً اسے اس کے کسی معلول کے وقوع کا تجربہ نہ ہو چکا ہو۔ اب اگر وہ واقعہ بار بار ہمارے سامنے پیش آتا رہے اور اس کے متعاقب و متوالی کوئی دوسرا متعین واقعہ بھی ہمیشہ ظاہر ہوتا رہے تو کچھ عرصہ کے بعد ہمارے ذہن کو یقین کامل ہو جاتا ہے کہ اول الذکر کے وقوع کے بعد آخر الذکر بھی قطعاً واقع ہوگا۔ آگ یا برف جب شروع شروع بچے کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو وہ بالکل قیاس نہیں کرسکتا کہ آگ کے چھونے [۵] کے بعد ہی گرمی اور برف کے چھونے کے بعد ہی سردی محسوس ہوئی، تو اس کا ذہن اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ آگ اور برف گرمی اور سردی کی علت ہیں، یا بالفاظ دیگر جب اول الذکر اشیاء کا وجود ہوگا، تو ان کے متعاقب آخر الذکر کیفیات بھی لازمی طور پر پیدا ہوں گی، اور انھیں کو وہ ان علل کے معلولات سے موسوم کرنے لگتا ہے۔ پس تصور علیت کا اصلی ماخذ، حواس ظاہری یا باطنی کا کوئی تجربہ نہیں، بلکہ صرف وہ عادت ہے جو توالی اشیاء کے متعدد و پیہم تجربات کے بعد ذہن میں راسخ ہو جاتی ہے۔ یہاں تک جو گفتگو ہوئی اس کے ماحصل کو مقدمات ذیل کی شکل میں رکھ سکتے ہیں:-

(۱) ہر تصور کے لئے لازمی ہے، کہ اس کا ماخذ حواس ظاہری یا باطنی کا کوئی تجربہ ہو، اور تجربہ حسی کے بغیر کوئی تصور پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔

(۲) اجسام و اذہان کے سارے دائرے میں کسی ایک تجربے کی بھی مثال نہیں ملتی، جس سے نسبت تعلیل کا تصور پیدا ہوتا ہو۔

(۳) توالی اشیاء کے متعدد و پیہم تجربات کے بعد ذہن ایک واقعہ کے بعد دوسرے کے وقوع کا خود بخود متوقع رہنے لگتا ہے۔

(۴) اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ علت و معلول بننے کی خصوصیت کسی شے میں فی نفسہ موجود نہیں، بلکہ یہ محض ہماری ذہنی عادت کا اثر ہے، جو مختلف اشیاء میں رشتۂ تعلیل کے تصور پر ہمیں مجبور کرتا ہے۔ تصور تعلیل کی یہ تحلیل ہیوم کے نظام تشکک کا سنگ بنیاد ہے۔ جب یہ ثابت ہوگیا، کہ علت و معلول کا لزوم، اشیاء کے اقتضاء طبعی کا نہیں، بلکہ محض ہماری عادت ذہنی کا نتیجہ ہے، تو ظاہر ہے کہ ہم کائنات کی جن دو چیزوں کو بھی علت و معلول قرار دیتے ہیں، وہ حقیقت نفس الامری کی بنا پر نہیں، بلکہ محض اپنے تعود ذہنی کی بناء پر قرار دیتے ہیں، اور اس کے تسلیم کرلینے کے بعد مستیقنین کے سارے نظام فلسفہ کی بنیادیں تنزلزل ہو جاتی ہیں۔

ہیوم گو معتقدات میں پرہو کی طرح متشکک محض تھا، لیکن اعمال میں

[۱] اس مسئلہ کی مزید توضیح، راقم ہذا کے رسالۂ "فلسفۂ جذبات" (طبع ثالث ۱۳۴۳ف) کے باب ۶ میں ملیگی۔

[۵] ان کے چھونے سے گرمی یا سردی محسوس ہوگی۔ مگر اسی بچہ کو جب اس کا متعدد بار تجربہ ہو لیتا ہے کہ

بخلاف بریرہو کے تشکک مطلق کا قائل نہ تھا۔ نظری حیثیت سے اسکی تعلیم یہ تھی، کہ انسان کے پاس حقیقت شناسی کا کوئی معیار نہیں، اور اس لئے ہر مسئلہ کے نفی و اثبات دونوں پر مساوی قوت کے ساتھ دلائل قائم کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن عملی حیثیت سے وہ خوب سمجھتا تھا، کہ اس کی یہ تعلیم فطرت بشری کے کسقدر مخالف واقع ہوئی ہے۔ اور اسکی مطابقت میں عملدرآمد کرنا کس درجہ دشوار بلکہ محال ہے۔ اس بنا پر وہ اس کا قائل ہوا ہے، کہ اعتقاد وعمل کے درمیان مطابقت نہ صرف غیر ضروری ہے، بلکہ فطرت بشری کی جو ترکیب واقع ہوئی ہے، اس کے لحاظ سے یہ غیر ممکن ہے، کہ انسان تشکک وارتیاب کے عقائد کے ماتحت دنیا میں ایک ساعت بھی گزار سکے۔ اس مفہوم کو اس نے اپنی تصانیف میں بار بار جس طرح ظاہر کیا ہے، اس کا نمونہ دکھانے کے لئے یہاں چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ ایک جگہ اپنے عقیدۂ تشکک کو تفصیل سے بیان کرکے خاتمہ پر لکھتا ہے:۔

اگر اس موقع پر مجھ سے دریافت کیا جائے، کہ آیا میں دل سے اس استدلال کی صحت کو تسلیم کرتا ہوں، جس کے ثبوت پر اسقدر زور دے رہا ہوں، اور آیا میں درحقیقت ان متشککین میں سے ہوں، جو اس امر کے قائل ہیں کہ دنیا میں ہر شے مشتبہ ہے، اور ہماری عقل کسی معاملہ میں حق وباطل کو کسی حد تک بھی دریافت نہیں کرسکتی۔ تو میرا جواب یہ ہے، کہ یہ سوال سراسر بے معنی ہے، اور یہ کہ نہ میں، اور نہ کسی دوسرے شخص نے کبھی بھی اس عقیدہ کو عرصہ تک دل سے یقین کیا ہے۔ فطرت نے ایک قطعی وناقابل تردید قوت کے ساتھ ہمارے لئے رائے قائم کرنا ویسا ہی لازم قرار دیدیا ہے، جیسا کہ سانس لینا، یا اشیاء خارجی کو محسوس کرنا، اور جس طرح ہم حالت بیداری میں اس پر مجبور رہیں، کہ دماغ سے کام لیتے رہیں، اور آفتاب کی روشنی میں اپنی آنکھوں کے گرد وپیش کی اشیاء کو دیکھیں، بالکل اسی طرح ہمیں اس سے بھی چارہ نہیں کہ ہم مختلف واقعات کو اپنے گزشتہ محسوسات سے ان کے عادی تعلقات کے متناسب مدارج یقین میں رکھیں۔ پس جو شخص تشکک مطلق کی تردید کرتا ہے، وہ ہوا سے لڑتا ہے، اور اپنے دلائل وبراہین کے ذریعہ سے ایک ایسی قوت تسلیم کراتا ہے، جو خود فطرت نے پیشتر ہی سے ہمارے نفس میں ودیعت کر رکھی ہے، اور جس سے ہم گریز کرہی نہیں سکتے"

کچھ دور آگے چل کر کہتا ہے:۔

بس اسی طرح متشکک باوجود اس علم کے کہ وہ اپنے عقائد کو دلائل سے نہیں ثابت کرسکتا، پھر بھی یقین واستدلال سے کام لئے ہی جاتا ہے۔ اور اسی طرح وہ مادہ کے وجود کو ناگزیرانہ تسلیم کرتا ہے، گو وہ اس کے ثبوت میں اپنے فلسفہ سے کوئی دلیل نہیں لاسکتا ہے۔ فطرت نے یہ شے ہمارے پسند وانتخاب کے بس میں رکھی ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ معاملہ اس درجہ اہم تھا، کہ اس نے اسے ہمارے مشتبہ دلائل ونظریات کے اعتماد پر مطلق نہیں چھوڑا ہے۔ ہم اس سوال پر تو بلاشبہ غور کرسکتے ہیں، کہ وجود مادہ پر ہم کن اسباب کی بناء پر یقین رکھتے ہیں؟ لیکن یہ دریافت کرنا، کہ مادہ کا وجود ہے یا نہیں؟ سراسر عبث ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ایسا ہے جس کی صحت ہمیں تمام استدلالات میں لامحالہ فرض کرنا ہوتی ہے"

ایک اور موقع پر تشکک کو مرض اور عدم التفات کو اس کا علاج قرار دیکر فطرت بشری کی کمزوریوں کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:۔

عقل وحواس سے متعلق یہ تشکک وارتیاب ایک مرض ہے، جس سے شفاء کامل کبھی حاصل نہیں ہوسکتی، اور جو ہر لحظہ ہم پر طاری ہوتا رہے گا خواہ ہم اسے کتنا ہی دور رکھیں، اور بعض اوقات بظاہر اس کے پنجے سے بالکل آزاد معلوم ہوتے ہیں۔ حواس وعقل کی صحت کو کسی دلیل سے ثابت کرنا ناممکن ہے، اور جوں جوں ہم اسکی زیادہ سعی کرتے ہیں، اتنا ہی زیادہ انھیں زیادہ مورد اعتراض بناتے ہیں۔ یہ تشکک وارتیاب چونکہ ان مسائل پر غور وخوض ہی کا نتیجہ ہے، اس لئے جتنا زیادہ ہم ان کی تردید یا تائید میں غور کرتے جاتے ہیں اسی قدر اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس مرض کا واحد علاج ان مسائل کی طرف سے بے توجہی وبے التفاتی ہے۔ مجھے اس علاج پر پورا اعتماد ہے، اور اس بنا پر میں اسے بطور علوم متعارفہ کے تسلیم کئے لیتا ہوں کہ اس وقت ناظرین کی خواہ کچھ ہی رائے ہو، مگر ایک گھنٹہ کے بعد انھیں قطعاً یقین حاصل ہو جائے گا کہ عالم خارجی وباطنی دونوں کا وجود ہے"

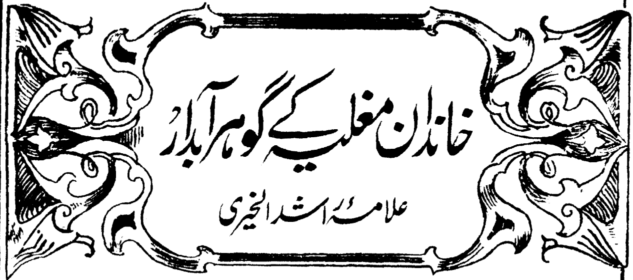
تصریحات بالا سے ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا، کہ ہیوم کس حد تک قدماء کا مقلد تھا، اور کس حد تک ان کا مخالف۔ وہ یہاں تک قدماء متشککین کا بالکل ہمزبان تھا، کہ عقل انسانی کے پاس حقیقت شناسی کا کوئی معیار نہیں، لیکن قدمائے یونان اس سے جو نتیجہ دنیا سے بےتعلقی اور عملی بےحسی کا نکالتے تھے، ہیوم[۵] اس سے متفق نہ تھا۔ وہ کہتا تھا، کہ گو ہماری عقل کو حقائق اشیاء کا ادراک نہیں ہوسکتا، لیکن اضافیات کا تو کامل علم حاصل ہو جاتا ہے۔ پس ہمیں اسی پر قانع ہوکر اپنی پوری توجہ اسی پر صرف کرنا چاہیے۔ قانون تعلیل کی بنیاد بے شبہ صرف ہماری ایک عادت ذہنی پر ہے، اشیاء کے اقتضائے طبعی پر نہیں، لیکن اس سے اس قانون کے وجود پر کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ جوں کا توں قائم ہے، اور ہم مجبور رہیں، کہ عملی زندگی میں اس کی اہمیت کو بدستور ملحوظ رکھیں۔

ہیوم کے بعد جرمنی میں کینٹ نے فلسفہ تشکک کی جگہ فلسفہ انتقادیت کا صور جس بلند آہنگی سے پھونکا، اور گزشتہ صدی میں انگلستان میں اسپنسر وہکسلی نے "لاادریت" کی جس سرگرمی سے منادی کی، اس کی تفصیل ایک مستقل علیحدہ مضمون کی محتاج ہے۔ فقط

---

۵ ہیوم کی سوانح عمری سے اس واقعہ کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد جب اس نے حد سے زیادہ رنج کیا، اور اس کے دوست مسٹر بوائل نے اس پر ایک گونہ اظہار حیرت کیا تو ہیوم نے اس کے جواب میں اس کو لکھا کہ "گو میں اپنے نظریات کو علمی وفلسفی دنیا کی دلچسپی کے لئے پیش کرتا ہوں، لیکن میں دیگر معاملات میں عام افراد سے چنداں مختلف خیالات وجذبات نہیں رکھتا"





سنا ہے پردۂ دنیا پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ انسانی صورتیں بداعمالیوں میں مسخ ہو جاتی تھیں۔ یہ سزا ہمارے واسطے آج بھی جاری ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت کا طریقہ دوسرا تھا آج دوسرا۔ اس وقت کی تکلیف جسمانی تھی آج کی روحانی، مگر آج کی سزا اس وقت سے زیادہ سنگین ہے اس لئے کہ ہمارے روشن کارنامے سیاہی سے بدل گئے اور دنیا ہمارے اسلاف کے زرین اعمال کو مٹا کر زندگی کے تمام جرائم ہمارے سر تھوپ رہی ہے۔ حسنات سیئات سے بدل گئیں اور جنھوں نے زندگی کی ہر حیثیت میں انسانیت کے ڈنکے بجا دئے، جن کے خطِ حیات نے تاریخ کو معطر کیا اور دنیا کو مہکا دیا جن کے تاج شاہی سے انصاف و حق کے چشمے پھوٹے وہ آج اپنے جوہر گنوا کر اپنی تسمیم انگیزیاں خاک میں ملا کر اس قابل رہ گئے کہ جوان ان کا مضحکہ اڑائیں اور لڑکے ان کو "عیش پسند" اور "معمار" کہہ کر پکاریں۔

کس قدر قیامت خیز وقت ہے کہ ہمارے معصوم بچوں کو زندگی کی ضرورتیں طوق و سلاسل بن کر یہ بتانے اور پڑھانے کیواسطے گھسیٹیں کہ "جہانگیر دی جوئی" اور شاہ جہاں دی "۔ ان کی عمر بھر کی کاوش اور محنت کا نتیجہ ان ہی الفاظ کے اعادہ اور یقین پر ہو اور ہم ان فرشتہ صفت انسانوں کے احسانات بھول کر ان کی زندگیوں کو جو آبدار گوہروں سے مزین ہیں ایک آدھ صفت میں محدود کر دیں۔ سخت ضرورت ہے کہ اسلامی تاریخ کا قلم ہمارا اپنا ہو، نصاب ہمارا اپنا اور تصنیف ہماری اپنی تاکہ ہمارے بچے اپنی صورتیں حقیقت کے آئینہ میں دیکھیں اور بے بنیاد الزامات سے دماغ کو محفوظ رکھیں۔

پچیس سال ہوئے ہوں گے میں نے ایک مضمون بہ عنوان عدل جہانگیری "عصمت" میں لکھا۔ یہ مضمون ہندوستان کے اکثر پرچوں میں نقل ہوا اور اس کا فلم بھی تیار ہو گیا، مگر مضمون نقل کرنے والوں نے تو خیر غلطی سے یا شرارت سے دو چار جگہ رنگ ہی بدلا تھا، فلم والوں نے یہ غضب ڈھایا کہ اصل جوہر ہی خاک میں ملا دیا۔

جب جہانگیر کی بابت ہم نے تاریخ میں خود بھی پڑھا اور دوسروں کو بھی پڑھتے دیکھا کہ سلطنت ایک شراب کی پیالی پر نور جہاں بیگم کے ہاتھ فروخت کر دی، جب اسکی اصل تصویر سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ یہ وہ بادشاہ تھا جس کے عدل و انصاف کے گیت زمین و آسمان گا رہے تھے۔ خاندان مغلیہ کے شہنشاہ وہ تھے جو دنیا کے سامنے انسانیت کی تفسیر کر گئے، یہ وہ تھے جن کے دل بادشاہ ہو کر دولتِ فقر سے مالا مال تھے اور جن کے ایمان اور صداقت کی دنیا ہمیشہ قسم کھائے گی۔ جہانگیر کے جس واقعہ کا ذکر میں نے کیا ہے اس کے مختصر حالات یہ ہیں جو اسی کی زبان سے اچھے معلوم ہوں گے۔

رات کا ابتدائی حصہ آہستہ آہستہ گزر رہا تھا نور جہاں بیگم نے قلبار کو دستر خوان چننے کا حکم دیا کہ کسی فریادی نے گھنٹہ بجائی۔ میں اور بیگم دونوں تھکے ہارے تھے کیونکہ اسی شام کو شکار سے واپس ہوئے تھے، گھنٹی کی آواز نور جہاں کو ناگوار ہوئی مگر میں باہر نکلا۔ قلعہ کے دروازہ پر ایک عورت سر سے پاؤں تک سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی دکھائی دی۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہی۔ میں سمجھا شاید رعب نے زبان بند کر دی ہے لیکن اسپر بہت دیر تک یہ کیفیت طاری رہی میں نے غور سے دیکھا تو اس کا جسم کانپ رہا تھا لیکن یہ بھی غصہ کی حالت تھی جو مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ میں نے دریافت کیا "کیا ہے؟" عورت اسکے بعد کچھ دیر اور خاموش رہی اور پھر کہا

"تیرا کوتوال سعد اللہ خاں آج آدھی رات کو میری بہو کی عزت لے گا۔ تین روز سے اس کی کشتیاں روپوں اشرفیوں کی کشتیاں ریشمی کپڑوں کے تھان اور گہنوں کی پوٹلیاں لا رہی ہیں۔ میرا بچہ چھ روپیہ مہینہ کا برقنداز ہے۔ اسکی بھی پرسوں بدلی ہو گئی۔ ہم غریب لوگ دولت کے ڈھیر کیا جانیں ہمیں کھانی اور موٹا جھوٹا پہننا۔ اب آج ہماری عزت کا فیصلہ ہے لیکن ہماری آبرو اگر گئی تو ہمارا صبر تجھ پر پڑے گا۔ بادشاہ میں نے بڑے بادشاہ کو بھی دیکھا ہے۔ تو میرے سامنے کا بچہ ہے تیری حکومت کی ہم نے سیوا کی ہے اس لئے نہیں کہ ہماری عزتیں خاک میں مل جائیں۔ جہانگیر! ظالم کے پنجے سے میری بہو کو بچا لے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو تو اور تیرا کوتوال مجھ کو میری بہو اور چار برس کے پوتے کو قتل کر دو مگر ہماری عزت نہ لو۔ بادشاہ! میں تیرے قدموں میں سر رکھتی ہوں، اگر مجھ کو آج رات کی مہلت دے دی تو صبح سورج نکلنے سے پہلے ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے میں نے ساڑھے چار روپیہ کی گاڑی سیکری کی کرنی میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ بچہ کی ہنسلی نا موں تمام صراف کو دی مگر وہ اس وقت نہیں چلتا، بیل تھکے ہوئے ہیں پھر دم لے کر چلے گا۔"

یہ کہکر بڑھیا میرے قدموں میں گر پڑی مجھ میں اب یارائے ضبط نہ تھا، اس کے بیان کے ساتھ میرے آنسو نکل رہے تھے۔ میں نے اس کا سر اٹھایا اور مکان کا پتہ پوچھ کر اندر جانے لگا تو بڑھیا کا غصہ اور تیز ہوا اور اس نے کہا

"بادشاہ! یہ کلجگ نہیں کر جگ ہے، ہم پر جو گزرے گی بھگتیں گے مگر تجھ کو بھی اس کا بدلہ جلد ملے گا۔ میں جاتی ہوں مگر یہ کہہ جاتی ہوں کہ آتماکی بددعا خالی نہیں جاتی۔"

بڑھیا چلی گئی اور اب میری حالت عجیب تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اگر سعد اللہ خاں سامنے ہو تو اسکی بوٹیاں چبا جاؤں اور اپنا دل چیر کر بڑھیا کے ہاتھ میں دیدوں کہ دیکھ لے۔ اس کی گالیاں اور غصہ میرے واسطے پیام رحمت تھے کہ شاید مخلوق خدا کی کوئی خدمت کر سکوں۔ اس وقت دل نے گوارا نہ کیا کہ سعد اللہ کو سزا دینے سے پہلے کسی کی صورت دیکھوں یا اپنی دکھاؤں۔ اسی حالت میں بھوکا پیاسا قلعہ سے باہر نکل گیا اور کچھ دیر ٹہل کر بڑھیا کی گھر کی طرف روانہ ہوا۔

آدھی رات قریب تھی خدا کے بندے بہت سے سو چکے تھے اور بعض سونے والے تھے میں ایک گلی کے نکڑ پر بیٹھا تھا کہ گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو سعد اللہ اور اس کے ساتھ ایک سائیس۔ میں بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔ چھوٹی چھوٹی

دیواروں کے گھر پر پہونچکر گھوڑا رکا اور سعد اللہ اچک کر چھت پر چڑھ گیا۔

اب میری کوفت اطمینان سے بدلی اور مجھے اس خیال سے خوشی ہوئی کہ شکار ہاتھ آگیا۔ میں نے سائیس سے کہا کہ گھوڑا اسی طرح لگادے۔ وہ کہنے لگا "خاں صاحب اندر رگئے ہیں بھاگ جا"۔ میں نے سائیس کو لات ماری اور گھوڑا خود لگاکر اوپر چڑھا۔ جھانک کر دیکھا تو سعد اللہ بڑھیا کو کوٹھری میں بندکر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا۔ میں آہستہ سے اترا اور صرف اتنا ہی کہا "سعد اللہ نمک حرام"۔

اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے وہ میری طرف بڑھا اور قدموں میں گرنا چاہتا تھا کہ میں نے پورے زور سے اس کے مونہہ پر طمانچہ مارا اور گھسیٹتا ہوا باہر لایا۔ گھوڑے کی رسی سے مشکیں باندھیں اور ساتھ لیا۔

جب باقاعدہ سزا ہوچکی تو میں نے ایک دربار منعقد کیا جس میں تمام امرا موجود تھے، بڑھیا کو بھی بلایا وہ بھی شریک ہوئی۔ سعد اللہ کی نمک حرامی اور شیفتگی کا ذکر کرنے کے بعد میں نے اپنا تاج شاہی بڑھیا کے قدموں میں ڈال کر کہا۔

"میا تیری بہو کی عصمت اس تاج سے زیادہ قیمتی ہے" اس کے بعد اشرفیوں کا ایک خوان دیکر رخصت کیا۔

شہنشاہ شاہدرہ میں آرام کر رہا ہے۔ سعد اللہ خاں کی لاش چیل کووں کو دی گئی۔ بڑھیا اور اسکی بہو اکبر آباد میں خاک ہوئے۔ مگر بادشاہ کے الفاظ زندہ ہیں اور جب تک عورت کی عصمت کے قدردان اس دنیا میں زندہ ہیں زندہ رہیں گے

(۲)

شاہ جہاں جسے کوئی معمار کہتا ہے کوئی بیوی کا نوحہ خواں، حکومت کی باگ ہاتھ میں لے چکا۔ جہاں آباد میں بیگم کا بازار اب بھی مشہور ہے۔ فرخندہ بیگم کی حویلی مسمار ہوگئی اور نہ معلوم اس کے ساتھ کیا کیا منہدم ہوا لیکن بیگم کا بازار کہنے کو اب بھی موجود ہے۔

فرخندہ اور حمیدہ دونوں حقیقی بہنیں اس محلہ میں رہتی تھیں۔ حمیدہ کے ہاں لڑکی تھی اور فرخندہ کے ہاں لڑکا۔ دونوں بہنوں میں بٹیا بیٹی کا بنج ہوا مگر منگنی ہوئی تھی نکاح نہ ہوا تھا کہ حمیدہ کا شوہر مرگیا اور مفلسی چھاگئی۔ نوبت رفتہ رفتہ یہاں تک پہونچی کہ حمیدہ دو دو دانوں کو محتاج ہوگئی اور فاقے گزرنے لگے۔ محلہ چھوڑ پرمحلہ جا بسی۔ افلاس کی مصیبت چھپنے والی نہ تھی۔ کنبہ والوں نے حقیر سمجھ کر تعلقات ختم کردئے۔ برخلاف اس کے فرخندہ کے ہاں دولت و عزت کی فراوانی ہوئی اور گھر پر ہاتھی جھومنے لگا۔ دوپہر کے وقت ایک روز جب زور شور سے گرمی پڑ رہی تھی، فرخندہ پٹا پٹی کے پردوں اور خس کی ٹٹیوں میں آرام کرا رہی تھی، لونڈیاں پنکھوں میں اور پچپی والیاں پاؤں دبانے میں مصروف تھیں۔ ایک بڑھیا عورت میلا چکٹ برقع جس میں لون باندھنے کو جگہ نہ تھی، کھلے جوتیاں پہنے سیٹر میٹر کرتی داخل ہوئی۔ بہتیرا ماماؤں نے روکا مگر وہ یہ کہتی ہوئی پردہ اٹھا اندر گھس گئی کہ فرخندہ کہاں ہے۔ اس کے چیخنے سے فرخندہ بیگم کی آنکھ کھل گئی۔ دولت کی آگ نے ماں کے پیٹ کو جھلس دیا اور ماماؤں کو بلاکر کہا کہ "تم نے کس کی اجازت سے اس عورت کو گھسنے دیا؟"

عورت۔ "آپا میں ہوں حمیدہ۔ ان بیچاریوں کا کیا قصور، میں خود ہی گھر آئی یہ تو منع کرتی رہیں"۔

فرخندہ۔ "تم تو ہمیشہ ہی کی بدتمیز ہو۔ یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے۔ مفلسی کے ساتھ تمیز بھی غارت ہوئی، یہ آیا وایا کیا لگائی ہے۔ کہو کیسے آئیں"۔

حمیدہ۔ "بیگم صاحب میں یہ کہتی ہوں کہ تمہاری بہو اب ماشاءاللہ سیانی ہوگئی اپنی امانت لو اور مجھے چھٹکارا دلوادو"۔

فرخندہ۔ "منہ سنبھال کر بات کرو، کس کی بہو کیسی بہو۔ کیا برابر والیوں کی لڑکیاں مرگئی ہیں یا میں پاگل ہوگئی ہوں جو تجھ فقیرنی کی لڑکی لوں۔ جاؤ رستہ لو اور اب ادھر کا رخ نہ کرنا"۔

حمیدہ۔ "تو میں کسی اور سے کردوں؟"

فرخندہ۔ "شوق سے، منع کون کرتا ہے، اپنے ہی جیسا کوئی فقیر قلندر ڈھونڈہ لو"

حمیدہ خاموش اٹھ کر سیدھی ہوئی۔ چند روز بعد فرخندہ کے شوہر کو موت نے آدبایا اور وہ صاحبی ختم ہونی شروع ہوئی۔

آدھی رات کے سناٹے میں جب حمیدہ اور اسکی جوان لڑکی ایک ٹوٹے ہوئے گھر میں اس طرح رات بسر کر رہے تھے کہ پنکھا تک جھلنے کو نصیب نہ تھا، حمیدہ کے آدھے کواڑ والے گھر پر یہ صدا بلند ہوئی۔ "مائی کچھ اللہ کے نام کا"۔

بڑھیا یہ سنتے ہی دروازہ پر آئی اور کہا "قلندر، ہم دونوں ماں بیٹیاں خود صبح سے بھوکے ہیں اللہ کے نام پر تو جان بھی قربان تھی"

قلندر۔ "مجھے جو بھیک ملی ہے وہ کافی ہے۔ لاؤ میں بھی یہیں بیٹھ کر کھاؤں، تم دونوں بھی میرے ساتھ شریک ہوجاؤ"۔ بڑھیا نے قلندر کو اندر بلا لیا اور تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔

بڑھیا نے کہا "سائیں اب لیٹ جائیے یہ لونڈیا آپ کی چپی کی کر دے گی۔ شاید آپ کی دعا سے اس کے دن پھر جائیں اور تقدیر جاگ اٹھے۔

قلندر لیٹ گیا۔ لڑکی نے پاؤں دبائے۔ بڑھیا نے اپنی داستان سنائے جلتے وقت قلندر نے کہا "اچھا تو یہ میری بیٹی ہے۔ بھیک مانگ کر اس کا پیٹ بھردوں گا، صبح کیواسطے یہ بچا کھچا کھانا موجود ہے" یہ کہکر جھولی الٹ دی۔ بڑھیا نے اٹھا کر رکھ لی۔ صبح کو بڑھیا اُ

لڑکی نے کھانا دیکھا تو اس میں ایک اشرفی موجود ہے۔ دونوں بلغ باغ ہوگئے۔

آدھی رات کے قریب قلندر پھر آیا اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ فقیر ٹھہرتا، لڑکی پاؤں دباتی، چلتے وقت وہ جھوی الٹ دیتا اور چلا جاتا۔

سال ڈیڑھ سال میں حمیدہ کے پاس اشرفیوں کا ڈھیر ہوگیا۔ ٹوٹا ہوا مکان بارہ دری سے اور فقیرانہ تمول سے بدلی اور دن عید رات شبرات ہونے لگی۔ اُدھر فرخندہ بیگم شوہر کے بعد کچھ ایسی مصائب میں مبتلا ہوئی کہ دانت کرید نے کو تنکا نہ رہا۔ حمیدہ کی کیفیت دیکھکر اس کے مونہہ میں پانی بھر آیا اور بیٹی کا تقاضا کیا۔ آخر جس طرح حمیدہ گئی تھی اسی طرح فرخندہ نے آکر شادی کی تاریخ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ حمیدہ نے کہا "میں تو اپنی بیٹی فقیر کو دے چکی وہی اس کا باپ ہے۔ اس کو پورا اختیار ہے، میں اب کچھ نہیں کرسکتی"

فرخندہ بیگم نے اسی روز جاکر دعوے دائر کردیا۔

صاحب قران ثانی تخت شاہی پر جلوہ افروز ہے، امرا گرد سادست بستہ حاضر ہیں۔ دونوں بہنوں کی شکایت سننے کے بعد شاہی الفاظ اس طرح گونجے۔

لڑکی تو اس فقیر کو پہچانتی ہے جس نے تجھ کو بیٹی بنایا"

لڑکی۔ "جہاں پناہ! میں نے اس سال دیڑہ سال میں کبھی اسکی صورت نہیں دیکھی، میں صرف اس کے پاؤں دباتی تھی، اس کی پنڈلیاں اگر لاکھ پنڈلیوں میں ہوں تو پہچان لوں گی"

بادشاہ نے حکم دیا کہ شہر کے تمام قلندر جمع کیے جائیں ایک بھی باقی نہ رہے۔

حکم کی تعمیل ہوئی اور لڑکی نے تمام قلندروں کی پنڈلیاں دیکھ کر کہا

"میرے باپ کی پنڈلی ان میں نہیں ہے"

اب بادشاہ کے حکم سے تمام اراکین دربار نے اپنی پنڈلیاں دکھائیں، مگر لڑکی نے وہی الفاظ کہے۔

تخت طاؤس کے بیٹھنے والے بادشاہ نے کھڑے ہوکر اپنی پنڈلی سامنے کی اور کہا "اب یہ پنڈلی رہ گئی ہے اس کو دیکھ"

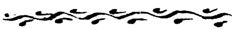
لڑکی نے پنڈلی کو غور سے دیکھا، بوسہ دیا اور سینہ سے لگاکر کہا

"میرے باپ کی پنڈلی یہی ہے"

بادشاہ نے اپنی بیٹی کی طرح اس لڑکی کی شادی کی اور کئی ہزار کی جاگیر جہیز میں دی۔

یہ تھا خاندان مغلیہ کا وہ تاجدار جس کو مخلوق خدا کا درد اس لئے در در بھیک منگواتا تھا کہ رعیت کا کوئی شخص کسی پر ظلم نہ کررہا ہو، غریب بھوکا نہ سوتا ہو، اور امیر یا طاقتور اپنی دولت اور طاقت کے زعم میں مفلس اور کمزور کو فنا نہ کررہا ہو۔

تاج محل کا سیاح عمارت کے حُسن ظاہری کے ساتھ ہی شہنشاہ کے حُسن باطنی کو بھی سامنے رکھے کہ یہ شاہ جہاں ہے جس نے راتوں کی میٹھی نیندیں اس طرح اپنی رعیت پر قربان کی ہیں۔



حیدرآباد کی علمی سرگرمیاں

آصفجاہ سادس نواب میر محبوب علیخاں غفرانمکان کے عہد میں

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی

آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں غفران مکان کا عہد حکومت ۱۸۶۹ء سے لیکر ۱۹۱۱ء تک رہا۔ تین سال کی عمر میں آپ تخت نشین ہوئے، اور بیالیس سال کی پُر امن اور شاندار حکومت کے بعد ۴۶ سال کی عمر میں آپکا انتقال ہوا۔ ہندوستان کے لیے یہ زمانہ عام طور پر اور خصوصًا حیدرآباد کے لئے امن وامان اور خوشحالی کا تھا۔ ہند کے سیاسی مطلع پر سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب آفرین طوفان کو گزرے ہوئے گیارہ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس زمانہ کا سکون درحقیقت اسی طوفان کے بعد کا نتیجہ تھا۔ اس بڑے قومی حادثے کے بعد ہندوستان کی کمر ایسی ٹوٹی کہ کسی خانہ جنگی کے لئے کھڑا ہونا ناممکن ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اہل ہند کو کسی بیرونی دخل درمعقول کا مقابلہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس لئے ہندوستان کی رہی سہی خواہش جنگ وجدل اب جا چکی تھی۔ برما میں جو ایک چھوٹی سی جنگ ہوئی اس کا اثر افواج ہی تک محدود رہا۔ خوف تھا تو صرف نئے انگریز حاکموں کو جو کسی بیرونی قوت خصوصًا روس کے حملے کے خوف سے متوحش تھے۔

حکومت دہلی کی سیاسی قوت تو اورنگ زیب کے زمانے کے بعد ہی ٹوٹ چکی تھی۔ علم وادب کے مرکز کا جو ایک امتیاز اس کو حاصل تھا۔ وہ دُرّانی، نادرشاہ اور مرہٹوں کے حملوں کا انتشار آفرینی کی وجہ سے خود ہی کھسکنے لگا تھا۔ اس پر فیض آباد اور لکھنؤ کے نشوونمانے رہا سہا سب گھسیٹ لیا۔ غدر سے پہلے پہلے شمالی ہند کا آخری علم دوست دربار لکھنؤ تباہ ہو چکا تھا اور وہاں کے اہل علم وفضل شاعر وادیب، ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے درباروں میں جا رہے تھے۔ گر غدر کے ہنگامے نے دہلی کے ساتھ لکھنؤ کی قسمت کا بھی آخری فیصلہ سنا دیا۔ لکھنؤ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ اختر غدر کے بعد بھی تیس سال تک زندہ رہے اور مٹیا برج (کلکتہ) میں صرف ان کے دربار کے متوسل شاعروں اور عالموں کو ان کی زندگی تک سایہ ملا۔ ۱۸۸۷ء میں شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی یہ آس بھی جاتی رہی۔ لیکن پانچ چھ سو سال کی ہندالمانی شائستگی نے علم وفن ادب وشعر کا جو سرمایہ چھوڑا تھا وہ آسانی سے مٹنے والا نہ تھا۔ اس کے حامل تباہ اور پریشان ہوکر ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی دیسی ریاستوں کے عارضی سایۂ عاطفت میں جا چھپے۔ ان ریاستوں میں سب سے زیادہ قابل ذکر ریاست رامپور رہی۔ دہلی اور لکھنؤ سے اسکی قربت کے سبب اور حکمران وقت نواب کلب علی خاں کی علم دوستی کی بدولت دہلی اور لکھنؤ کے تقریبًا تمام عالم اور شاعر یہاں چلے آئے لیکن ۱۸۸۷ء میں نواب کے انتقال نے یہ سہارا بھی چھین لیا۔ اہل علم (یہ) متاع سمیٹ سمیٹ کر یہاں سے بھی چل کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے۔ داغ کے جیسے چند خوش قسمتوں پر آسمان مہربان تھا۔ ہندوستان کے سارے درباروں کا چکر کاٹتے ہوئے یہ حیدرآباد پہنچ گئے۔ لیکن امیر کے جیسے بہت سے اہل علم فکر ومعاش کی پریشانیوں سے آخر دم تک خلاصی نہ پا سکے۔

حیدرآباد نے مغل شہنشاہیت کے علاوہ بیجاپور اور گولکنڈے کے دکنی درباروں کے حقیقی وارث کی حیثیت سے علم وفن کی سرپرستی اور ہندوستانی ادب کی قدر افزائی کی روایات کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ یہ سلسلہ آصفجاہ اول نواب میر قمرالدین خاں سے چلتا ہے۔ نواب خود شعر وسخن کا ایک پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ ان کے زمانے ہی میں دکن کی اجڑی ہوئی سلطنتوں کے تمام بچے کھچے شاعر اور عالم حیدرآباد آ گئے تھے۔ غدر سے پہلے کی لامرکزیت نے حیدرآباد کے حکمرانوں کو بیشتر سیاسی مہموں اور فوجی کارروائیوں میں مصروف رکھا۔ عاشق علی خاں ایما، محمد مرتضیٰ مہدی، عارف الدین خاں عاجز، مہر علی مہر، مرزا عطا ضیا، فضلی شاہ، احمد یار خاں یار، خواجہ عبدالمنعم خاں قادر، سوہن حل مہتاب، لالہ لچھمی نرائن شفیق، اورنگ آبادی شاہ تجلی، شاہ میر مہاراجہ چندولال شاداں، حضرت فیض، حضرت شاہ خاموش، محمد صدیق قیس، صفا مہ لقا بائی چندا، بدرالدین خاں لائق (نواب سکندر جاہ کے میر سامان) رائے بالا پرشاد رابطہ، مولانا شوقی، ملا واحدی،

محمد عثمان مبین، جیسے باکمال شاعروں اور عالموں سے یہ دربار کبھی خالی نہیں رہا۔

لیکن حیدرآباد کو حکمی علوم اور شعر وادب سے خاص لگاؤ اس طرح پیدا ہو گیا تھا کہ اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے دکن کے امرا میں بعض نہایت روشن خیال اور علم دوست امیر پیدا ہو گئے۔ نواب ناصرالدولہ کے زمانہ میں مسند وزارت پر مہاراجہ چندولال شاداں جیسے علم وفضل کے قدرداں وزیر متمکن تھے۔ شاداں خود فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ اس لئے انھیں شعر وسخن کا بے حد ذوق تھا۔ اسی علمی شغف نے مہاراجہ کو مجبور کیا کہ وہ ذوق کے استاد شاہ نصیر کو لکھنؤ سے حیدرآباد کھینچ کر بلائیں۔ شاہ نصیر کے قیام کے زمانہ میں بیسوں مشاعرے ہوئے اور سینکڑوں لوگوں نے شاہ نصیر کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ اسی زمانہ میں دکن کے مشہور امیر کبیر نواب شمس الامرا ثانی نواب محمد فخرالدین خاں (امیر پائیگاہ) کو حکمی علوم کا ذوق ہوا جسکی تکمیل کے لئے آپ نے ریاضی، طبعیات، کیمسٹری، ہیئت جرثقیل، فلسفہ، علم الانظار کی کتابیں انگریزی سے ترجمہ کرائیں۔ یہ چھ رسالوں کا مجموعہ "ستہ شمسیہ" (۱۲۵۳ھ) کے نام سے مشہور ہے۔ اردو میں جدید علمی علوم کی ترویج کی یہ اولین کوشش تھی ان میں اصطلاح سازی کی دقتوں پر جس خوبی سے قابو حاصل کیا گیا ہے آج بھی قابل تقلید ہے۔

غرض آصفجاہ سادس کے عہد میں حیدرآباد علم وفن خصوصًا شعر وسخن کے چرچوں سے پُر تھا۔ سیاسی امن وامان اور معاشی فراخی جو قوموں کے لئے اس طرح کی زندگی میں سب سے بڑے معاون ثابت ہوئے ہیں، حیدرآباد میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ اندرونی اور بیرونی کوئی غیر معمولی خلل، اس زمانہ میں واقع نہیں ہوئی صرف رود موسیٰ کی طغیانی کا ایک حادثہ تھا جس میں حیدرآباد کو ناقابل تلافی علمی نقصان پہونچا۔ نہیں معلوم کہ قدیم دکنی شعر وادب کی کتنی گرانمایہ کتابیں اس حادثہ کی نذر ہو گئیں۔ تاہم حضرت غفران مکان کی ذاتی داد ودہش نے مالی نقصانات کی بہت کچھ تلافی کر دی۔

غدر کے زمانہ میں بھی حیدرآباد نواب افضل الدولہ کی پیش بینی اور مشہور با تدبیر وزیر نواب میر تراب علی خاں، سرسالار جنگ اول کے حسن انتظام کی بدولت ہر قسم کے ہیجانات سے محفوظ رہا۔ لیکن شمالی ہندوستان کے لئے اس واقعہ کے اثرات بعید انقلاب آفریں ثابت ہوئے۔ قدیم سیاسی حکومت کے اٹھنے کیساتھ ہی ایک نئے اور اجنبی نظام کی بنیاد پڑنی ضروری تھی۔

ہندوستان میں ایسے افراد کی کمی نہیں تھی جو اگلی عظیم الشان سلطنت کا کروفر دیکھ چکے تھے۔ سیاسی بساط کے الٹ جانے کی وجہ سے قدیم شائستگی کی موت کا جو پیغام آیا تھا، اس سے ان کے قلوب کچھ کم متاثر نہیں تھے۔ اس پر قومی غلامی کا احساس اور کچھ انگریز حاکموں کی مسلمانوں کی طرف شبہ کی نظریں۔ ایسے امور تھے کہ ہر احساس والے کے دل پر کاری ضرب لگا رہے تھے۔ سلطنت کی تباہی کے بعد سے اگلے علوم وفنون کا بھی خدا ہی حافظ نظر آرہا تھا۔

یہی امور تھے جنھوں نے دہلی کے اجڑے کھنڈروں اور "آثار الصنادید" سے غیر متوقع طور پر چند غیر معمولی حساس ہستیوں کا ایک مجمع پیدا کر دیا۔ جس کے قائد قابل احترام سرسید احمد خاں تھے۔ سرسید کی جماعت قومی اصلاح کی ایسی عظیم الشان تحریک لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ فطرتاً اس سے علم وفن اور شعر وادب کی کئی شاخیں پھوٹ نکلیں اس قابل احترام جماعت کے آخری فرد کے پیوند زمین ہونے سے پہلے پہلے بہت سی تحریکیں بار آور ہو چکی تھیں۔ اور ہماری قوم ایک نئی شاہراہ پر کھڑی نظر آرہی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی اکھاڑ پچھاڑ سے بھی حیدرآباد براہ راست متاثر نہیں ہوا۔ اس لئے یہاں یہ تحریک انقلاب کی صورت میں رونما نہیں ہوئی۔ بلکہ یہاں اس نے ایک تدریجی ارتقاء کی شکل اختیار کی۔ اس کا سہرا یقیناً دور اندیش بادشاہ وقت اور باتدبیر وزیر کے سر ہے۔

آصف جاہ رابع کے عہد تک ریاست کا نظم ونسق قدیم مغلیہ اساس پر مبنی تھا۔ ریاست کے چاروں طرف جب نئے نظام کا رواج ہوا تو ریاست کو ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اور ہندوستانی نظم کے ساتھ یکسانیت کے خیال نے اپنے نسقی نظام کو بھی بدلنے پر مجبور کیا۔ لیکن یہ کام اس نے بتدریج کیا۔ اور اس کا آغاز اسی عہد سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عہد جدید حیدرآباد کا سنگ بنیاد ہے۔

غرض اس طرح نواب میر محبوب علی خاں کو پہلے پہل نئے نظم ونسق کو سلطنت میں رائج کرنا پڑا۔ اور اس جدید تعمیر میں نواب میر تراب علی خاں سر سالار جنگ اول کی آئین بندی اور فراست سے بڑی مدد ملی۔ نئی اصلاحات کو مملکت میں جگہ دینے کے لئے حکومت نے سررشتوں کی ہیئت میں بتدریج تبدیلی شروع کی۔ اور اصلاحات کو نافذ کرنے کے لئے دو کام کئے۔ ایک طرف تو اہل ملک کو یورپ یا ہندوستان کے محکمہ جات میں بھیج کر کام سکھایا۔ دوسرے ہندوستان کے سربرآوردہ عہدہ داروں کو حکومت ہند سے اپنے پاس مستعار لیا، یا ان کا تقرر اپنے پاس براہ راست کر دیا کیونکہ شمالی ہندوستان کے عہدہ دار اس وقت سے پہلے جدید انگریزی نظم ونسق سے کافی طور پر واقف ہو چکے تھے۔ اس طرح تھوڑے عرصہ میں سلطنت کے اکثر محکموں میں تبدیلیاں کر لی جا سکیں۔

اس عہد میں ملکی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے نجم الغنی مولف "تاریخ حیدرآباد" لکھتے ہیں۔

"مہمات ریاست اور امور حکومت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں، نواب میر محبوب علی خاں کے عہد میں مناسب اصلاحیں نہ ہوئی ہوں تعلیمات، طب، فوج، پولیس، تعمیرات عامہ، غرض وہ تمام خصوصیات، جو آج کل مہذب سلطنت کے لئے ضروری ہیں، ریاست حیدرآباد میں مکمل صورت میں موجود ہو گئے۔" (ج ۵ صفحہ ۱۶۱ د)

فوج اور پولیس میں نئی اصلاحیں ہوئیں، فوج کو کرنل افسر الملک جیسے زبردست سپاہی اور مدبر کی قیادت نصیب ہوئی۔ تعمیرات عامہ کا محکمہ قائم ہوا مالگزاری آمدنی کی نئی تنظیم عمل میں آئی اور محکمۂ عدالت کی اصلاح برطانوی ہند کے طریقہ پر کی گئی۔ ان امور سے ہمیں یہاں تفصیل سے بحث کرنی نہیں ہے۔ علمیت کا جو سنگ بنیاد اس عہد میں رکھا گیا ہے صرف اسی سے ہم یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں۔

حیدرآباد میں قدیم نظامیہ طرز کی تعلیم عرصہ سے رائج تھی۔ کئی مدرسے اور مکتب قائم تھے جس کے تعلیم یافتہ خاص قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، لیکن اس عہد میں علمی اور نظری سفتی اور ادبی، دونوں طرز کی جدید تعلیم کی ابتدا ہوئی۔

فنی تعلیم کے لئے انجنیری اور طب کے وہ مدرسے قائم ہوئے جو چند سال پہلے جامعۂ عثمانیہ کے فنی کالجوں کے قائم ہونے تک ملک میں فنی تعلیم کی ترویج کا واحد ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ ریاست کے فنی محکموں کے لئے فارغ التحصیل لوگوں کی ایک قابل قدر تعداد انہی مدرسوں سے فراہم ہوتی تھی۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ نام پلی کے اسٹیشن کے روبرو، مدرسۂ انجنیری مسٹر مکرجی کی صدارت میں اس فن کے طلبہ کی ترتیب میں ہمہ تن مصروف تھا۔ دوسری طرف خیریت آباد میں طب کا وہ ادارہ قائم اور میجر فرحت علی کی نفیس ضبط کے تحت کارگزار تھا جو سالہا سال تک ملک اور اہل ملک کے سخت ترین دردوں کا درماں بنا رہا۔ دکن کے دور دراز مقامات سے اس فن کے طلبہ اس مدرسہ میں علم یا لیبد کی مشق کے خیال سے آکر شریک ہوتے تھے۔

انگریزی کی اعلیٰ تعلیم اور سائنس کی ابتدا نظام کالج کی تشکیل سے ہوئی۔ جو اپنے انگریز پرنسپلوں کی سخت نگرانی میں ملک کے لئے شائستہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا قابل لحاظ سرمایہ فراہم کرتا رہا۔ پروفیسر عبدالرحمٰن خاں جو حیدرآباد میں سائنٹفک تعلیم کی ترویج اور ترقی کے سلسلہ میں کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے، برسوں اس کالج کے سربرآوردہ رکن، اور عملوں کے ناظم رہے۔

مظاہرات کے مطالعے اور ہیئت کی عملی تعلیم کے لئے بیگم پیٹھ میں رصدگاہ نظامیہ قائم ہوئی جو آج بھی ہندوستان کی بہترین رصدگاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ بالآخر ایک اہم تر ادارے کا ذکر ضروری ہے۔ مشرقی علوم اور السنہ کی تعلیم کے لئے دارالعلوم کا مدرسہ اور کالج قائم ہوا جس کے تعلیم یافتہ درحقیقت آج تک بھی ملک کو علم ادب اور علمی فنون کی روشنی سے منور کر رہے ہیں۔ ادبی، علمی، صحافتی شعبوں کے لئے حال تک بھی یہی دارالعلم کارگزار فراہم کیا کرتا تھا۔ یہ مدرسہ گو اب ایک جدید اور وسیع تر ادارے میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت اور حیات مستعار ختم کر چکا ہے لیکن اس کے فارغ التحصیل جیسے مولانا عبدالقدیر حسرت (صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ) مولانا جمال الدین نوری مرحوم پروفیسر نظام کالج، پروفیسر غلام نبی فہیم، ادیب طفلی کے موجد مرحوم غلام مصطفےٰ ذہین، قدیم صحیفہ نگار مولوی اکبر علی، اور تعلیمی خدمتگزار مولوی محمد مرتضےٰ مرحوم سکرٹری حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس، عربی زبان کے ادیب مولانا محمد جعفر، اور ملک کے مایۂ ناز شاعر سید رضی الدین حسن کیفی، جیسی برگزیدہ ہستیاں اس مشرقی کالج کی آغوش میں تربیت پاکر نکلی ہیں۔

اس کے علاوہ قدیم درس نظامیہ کا علمبردار مدرسہ نظامیہ (شبلی گنج) تھا۔ جس کے بانی، نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم صدر الصدور امور مذہبی کی خدمات کی یاد ہمارے ذہنوں میں آج تک زندہ ہے۔

مذہبی علوم کی جو خدمات اس سرزمین نے ادب کے عہد زریں میں کی ہیں وہ ناقابل محو ہیں۔ لیکن گزشتہ صدی کے آخری زمانے میں بھی مولانا غوثی، مصنف "تفسیر غوثی" ملا واحدی، صاحب "تفسیر واحدی" مولوی محمد عثمان بیگ مصنف "لازم الاسلام" کے علاوہ صاحب "تاریخ رشید الدین خانی" اور "تاریخ خورشید جاہی" جیسے صاحب ذوق اہل قلم کی کمی نہیں تھی۔ لیکن شعر وسخن کے چرچوں سے حیدرآباد کبھی خالی نہیں رہا۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے زریں عہد ادب سے لیکر اس وقت تک ہر زمانہ میں بیسیوں قابل قدر شاعر پیدا ہوتے رہے۔ زیر بحث دور کے قریب ایک طرف حضرت فیض کے شاگرد سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے تو دوسری طرف حضرت تمکین کے تلامذہ کی بھی کمی نہیں تھی۔ حال تک بھی حضرت فیض کے مزار پر مشاعرے کی وہ محفلیں

منعقد ہوتی تھیں جن میں ملک کے تمام سربرآوردہ شعرا جمع ہو کر اپنی سخن سنجیوں کی داد دیتے۔ ان دلچسپ صحبتوں کی تصویر کسی قابل مصور کے موقلم کی محتاج ہے۔ مہاراجہ شاد بھی اکثر ان مشاعروں میں شرکت فرما چکے ہیں۔ اس عہد سے پہلے بشیر محمد خاں ایمان اور محمد صدیق فیض دکن میں شعر و سخن کے بڑے مُسلّم الثبوت اساتذہ گزرے ہیں۔ ایمان کے کمال فن کے تمام معاصرین معترف تھے۔ عورتوں میں مہ لقا بائی چندا کا دیوان انگلستان کے کتب خانے میں اب بھی نہایت حفاظت کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔

ریاست کے مشہور وزیر مہاراجہ چندو لال شاداںؔ کا نام بھی شعر و سخن کے سرپرستوں کی پہلی صف میں آتا ہے آپ خود بھی اچھے شاعر تھے اور دار السلطنت کو ہندوستان کے بہترین شعرائے سے بھر دینا چاہتے تھے۔ مشہور استاد شاہ نصیر آپ ہی کی طلب پر حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ غدر کے زمانے کے سرپرستِ شعر و سخن نواب کلب علی خاں والی رامپور کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد جب داغؔ دہلوی حیدرآباد آگئے، اور حضرت غفران مکان نے ان سے مشورہ کرنا شروع کیا تو "الناس علی دین ملوکہم" کے مصداق، شعر و سخن کا خاص ذوق ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ اس زمانہ میں شعر و سخن کا ذوق اعلیٰ طبقہ کے لوازم حیات میں داخل ہو گیا تھا۔ داغؔ کے اثر نے ان کی طرز کے بعض اچھے شاعر دکن میں پیدا کئے۔ خود حضرت غفران مکان کے کلام پر داغؔ کا نمایاں اثر ہے۔ کیفیؔ جو آئندہ زمانہ میں دکن کے سب سے بڑے شاعر بننے والے تھے پہلے ہیں مسکینؔ کے روش پر چلتے رہے جن سے انھیں تلمذ حاصل تھا بعد میں وہ بھی داغؔ کے دبستان کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ لیکن یہ رجحان صرف اسالیب کی حد تک رہا۔ کچھ تو تخلص کی مناسبت سے اور کچھ مسکینؔ کی پیروی کی بدولت رندانہ مرع آخر تک ان کی غزل کے مخصوص فضا میں رہے اور کسی زمانے میں بھی یہ رجحان طبع نہ بدل سکا۔

داغؔ کے دبستان کے دوسرے شاعر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ ہیں جو آج تک بھی اس خاص طرز کو نہایت کامیابی کے ساتھ نباہ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ داغؔ کی اس عالمگیر شہرت اور ان کی طرز کی ہر دلعزیزی میں اس قدر دانی کو بھی بہت دخل ہے جو حضرت آصف کے دربار میں ہوئی۔ مسٹر رام بابو سکسینہ، مؤلف "تاریخ ادبیات اردو" اس قدر دانی کے متعلق لکھتے ہیں "حیدرآباد میں داغؔ دنیوی خوش حالی کے معراج کمال پر پہونچ چکے تھے۔ اردو کے کسی دوسرے شاعر کی یہ قدر و منزلت ہوئی اور نہ کسی نے یہ انعام اکرام پائے" (دیکھو "ہسٹری آف اردو لٹریچر" صفحہ ۱۸۷ سنہ ۱۹۲۷ء رام نارائن لال الٰہ آباد)

داغؔ کی کامیابی نے ہندوستان بھر میں ان کے سینکڑوں مقلد پیدا کر دئے تھے۔ چنانچہ عصر حاضر کے سب سے بڑے شاعر اقبالؔ بھی ابتدائی زمانے میں داغؔ کے انوکھے انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

دکن کے اکثر شاعر داغؔ کی ہمنوائی کا دم بھرنے لگے تھے لیکن جلال الدین توفیقؔ ہی ایک ایسے شاعر ہیں جو داغؔ کے اس عالمگیر اثر اور ان کی مقبول عام طرز سے متاثر نہ ہوئے۔ وہ عزلت پسند اور صوفی منش انسان تھے اور ان کی شاعری ان کی زندگی کا آئینہ رہی متصوفانہ نکتہ سنجیوں میں دردؔ کے بعد ان کے پلے کا شاعر کوئی نہیں ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت شادؔ، آصفؔ سے تلمذ رکھتے ہیں لیکن آپ کی مضطرب طبیعت اور ارتقا پذیر ذہنیت نے آپ کو کسی ایک طرز پر تمام و کمال حصر کرنے سے باز رکھا۔ داغؔ اور آصفؔ کے معرکۃ الآرا مشاعروں میں آپ نے شرکت کی ہے۔ اب بھی جبکہ حیات کی سخت کش مکش نے شعر و سخن کے ذوق سے طبیعتوں کو مردہ بنا رکھا ہے، شادؔ کا دربار جدید اور قدیم دونوں طرز کے شعرا کا مرکز اور مامن بنا ہوا ہے۔ راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ، دکن کے امرا میں خاص رتبہ کے شاعر ہیں۔ باقیؔ کی رباعیات کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس طبقہ کے ایک اور شاعر نعمان الدولہ دلؔ ہیں۔ باقی شاعروں میں ڈاکٹر احمد حسین مائلؔ، محمد عبد الحی بازغؔ، میر نوازش علی شمعہؔ اور سید ابراہیم عفوؔ کا ذکر بھی ناگزیر ہے جن کے رشحات سے موجودہ دور سے پہلے تک دکن کے تمام ادبی رسائل مستفید ہوتے رہے۔

داغؔ کی افسانہ نما کامیابی نے ان کے معاصر اور اردو کے سربرآوردہ نغز نگار

غزل

از مولوی ابو الاشرف مجید صاحب آغائی ابو العلائی

مانا کہ حسن پردہ درِ این و آں نہ تھا
پھر بھی نگاہ شوق سے کوئی نہاں نہ تھا

کیوں دل کی بحرِ عشق میں سنتے چلا تھا میں
کچھ ناخدائے کشتیٔ عمرِ رواں نہ تھا

تھے چار تنکے ہو گئے کیوں نذرِ برق و باد
اللہ! شاخِ گل پہ تو کچھ آشیاں نہ تھا

ایسی جبیں جھکی کہ درِ دل پہ رہ گئی
گویا نظر میں اور کوئی آستاں نہ تھا

دنیائے اضطراب تھی تاخیرِ نامہ بر
وہ آگیا جواب کہ جس کا گماں نہ تھا

کیوں چلتے چلتے حشر میں پھر رک گئی زباں
رودادِ دردِ عشق تھی، رازِ نہاں نہ تھا

یوں کشتیٔ امید رہی بحرِ عشق میں
لنگر نہ تھا کبھی تو کبھی بادباں نہ تھا

خود رفتگی کچھ ایسی رہِ عشق میں رہی
اندیشۂ نشیب و فرازِ جہاں نہ تھا

محرومیاں نصیب کی حد سے گزر گئیں
بجلی گری وہاں کہ جہاں آشیاں نہ تھا

ہر ہر قدم پہ عشق میں دشواریاں سہی
تیرا خیال وجہ تسلی کہاں نہ تھا

تھے رہروانِ راہ محبت تو سینکڑوں
لیکن مجیدؔ اپنا کوئی رازداں نہ تھا

شاعر امیر مینائی کو بھی یہاں کھینچا۔ لیکن داغ کی خوش نصیبی ہر ایک کے حصے کی بات نہ تھی۔ یہاں آنے کے چند سال بعد ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔ لیکن آپ کی ناکامی آپ کے شاگرد اور آپ کے فرزند کیلئے زینہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ اول الذکر آج ریاست کے ایک جلیل القدر عہدہ پر سرفراز ہیں۔ اور آخر الذکر امور مذہبی کی نظامت جیسے ذمہ دار عہدہ کو سنبھال رہے ہیں۔

شعر و سخن کے اس اجمالی ذکر کو ختم کرنے سے پہلے نظم طباطبائی اور ضامن کنتوری کا ذکر بھی ضروری ہے۔ نظم "ٹیابرج" کے زوال کے بعد دکن کے افق پر طلوع ہوئے اور ذوق سخن کی قابل اعتنا خدمات انجام دیں۔ داغ کے انتقال پر نظم اور ضامن ہی صف اول کے شاعر رہ گئے تھے۔

جس طرح قدیم طرز کی شاعری کا آخری مامن حضرت غفران مکان کا دربار تھا اسی طرح جدید طرز کی شاعری سے بھی پہلے پہل یہی عہد روشناس ہوا۔ کیفی کی سعی نے ان کی زندگی ہی میں علی شبیر اور عہد طفولیت کے باقی غلام مصطفےٰ ذہین اور اردو کے سب سے بڑے رباعی گو شاعر امجد جیسے قابل قدر شعرا کی ایک مبارک نسل دکن میں پیدا کر دی تھی۔ اردو کے چند بہترین مورخ او تذکرہ نویس بھی، حیدرآباد نے اسی زمانہ میں پیدا کئے۔ اسی طرح لاہور کے بک ڈپو اور دلی کی سائنٹفک سوسائٹی کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ یہاں فنی ادب کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ مرزا مہدی خاں کوکب اردو کے اولین فنی مصنفین میں سے ہیں۔

لیکن شعر و سخن کی سرگرمیوں اور علم و ادب کی سرپرستیوں سے زیادہ اہم دربار آصفی کا کارنامہ علی گڑھ کی اصلاحی تحریکات کی امداد ہے۔ جدید تعلیم کی اشاعت کے لئے علی گڑھ کالج کے قیام میں حکومت کی طرف سے جو شاہانہ امداد دی گئی تھی، اس کالج کی بنیادوں کو استوار کرنے میں خاطر خواہ مدد ملی۔ اس کے علاوہ اس جماعت کے اراکین کی فرداً فرداً بھی مدد کی گئی۔ انھیں بڑی بڑی ملازمتیں دی گئیں اور وظیفے مقرر کئے گئے۔ جس کی بدولت یہ گروہ فکر معاش سے بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ اس تحریک کے بانی مبانی آنریبل سر سید احمد خاں، اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے سبب ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد میں قیام پذیر نہ ہو سکے۔ تاہم انھیں جب کبھی مالی یا اخلاقی مدد کی ضرورت ہوئی، ریاست کی طرف سے نہایت فراخ دلی کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹایا گیا۔ علی گڑھ میں بیٹھکر یہ اپنے حلقے کے کارکنوں کو منتخب کر کے حیدرآباد بھیجتے رہے۔ چراغ علی، مہدی علی، مشتاق حسین جو سر سید احمد خاں کے دست و بازو تھے، ریاست کے بڑے سے بڑے عہدوں پر عرصہ تک فائز رہے۔ اس تحریک کے ادبی کارکنوں میں سے حالی بھی سر سید کی طرح یہاں مستقل طور پر قیام پذیر نہ ہو سکے لیکن ان کی معاشی فکروں کو وظیفہ کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے دور کر دیا گیا۔ اور وہ اطمینان کے ساتھ شعر و شاعری کی اصلاح میں منہمک رہے۔ شبلی دائرۃ المعارف کے ناظم کی حیثیت سے عرصہ تک یہاں رہے۔ حافظ نذیر احمد کو تعلقداری کی اہم خدمت دی گئی تھی۔ اردو زبان کی واحد مستند لغت "فرہنگ آصفیہ" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، خانوادۂ آصفی کے اس ساتویں بادشاہ کے نام سے منسوب ہے۔ اس کے مصنف مولوی سید احمد دہلوی کو اس کام کے لئے ریاست سے وظیفہ مقرر تھا۔

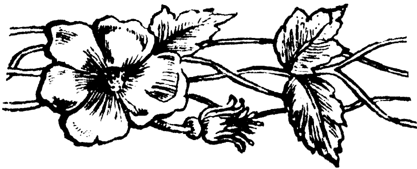
مذکورۂ بالا بزرگوں کے علاوہ سید علی بلگرامی اور مولوی عزیز مرزا مختلف ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز رہے۔ مشہور فسانہ نگار سرشار بھی یہاں رہ چکے ہیں۔ جدید اردو ناول کے بانی اور تاریخ اسلام کے مصنف مورخ مولانا عبدالحلیم شرر بھی ملازمت کے سلسلہ میں کئی دفعہ یہاں آئے۔ یہاں سے واپس جانے کے بعد بھی طرح طرح سے ان کی مدد کی جاتی رہی۔ ان کی تاریخ اسلام، حیدرآباد کی امداد ہی سے لکھی گئی۔

اس طرح اس عہد میں ہندوستان کے تقریباً تمام سر برآوردہ شاعروں اور ادیبوں کا کسی نہ کسی طرح ریاست سے تعلق رہا۔ ان برگزیدہ تعلقات نے عہد آصفجاہ سادس میں دار السلطنت کو ہندوستان بھر میں نہ صرف قابل رشک بنا دیا تھا بلکہ یہاں کی علمی مصروفیتوں میں ایک غیر معمولی چہل پہل پیدا کر دی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت حیدرآباد اکناف ہند کے کسی قابل اعتنا عالم اور ادیب کو، دار السلطنت سے باہر نہ رہنے دے گی۔

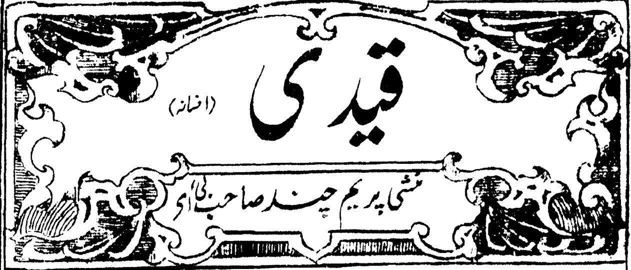
صحافت اور معیاری رسائل کے معیار میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ رسالۂ "حسن" جو حسن بن عبداللہ کی ادارت میں دار السلطنت سے شائع ہوتا تھا اپنے بلند پایہ مضامین اور لاثانی مضمون نگاروں کی وجہ سے دنیائے صحافت میں اس عہد کی یاد ہمیشہ تازہ رکھے گا۔ اس کے مضمون نگاروں کی خدمت میں ایک اشرفی کا ہدیہ پیش کیا جاتا تھا۔ یہ سر سید کے مشہور جریدے "تہذیب الاخلاق" کا معاصر اور سر عبد القادر کے رسالے "مخزن" کا ہم پایہ تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کا پہلا رسالہ "افسر" بھی اسی عہد کی پیداوار ہے۔ اس کے علاوہ "صحیفہ" اور "دبدبۂ آصفی" "ادیب" "معلم نسواں" "محبوب الکلام" "دکن ریویو" "افادہ" "ذخیرہ" اس عہد کی صحافتی مصروفیتوں کے اچھے نمونے ہیں۔ یہ صرف معیاری رسالوں کی فہرست تھی، معمولی رسالے بیسیوں کی تعداد میں شائع ہوتے تھے۔ فنی رسالے جیسے "مدیکل جرنل" "فنون" وغیرہ جو اس زمانے میں شائع ہو رہے تھے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علمی رجحانات عملی اور فنی ادب کی طرف بھی ہونے لگے تھے۔ "معلم نسواں" اردو کا پہلا رسالہ ہے جس کے مد نظر صنف لطیف کی تربیت اور اصلاح تھی۔

رسالوں کے علاوہ بیس کے قریب اخبار نکلتے تھے جن میں سے چند جیسے "سفیر دکن" "ہزار داستان" "مشیر دکن" روزانہ تھے اور باقی ہفتہ وار۔ ہفتہ وار اخباروں میں "دکن پنچ" "اخبار آصفی" "جام جمشید" "محبوب گزٹ" "جلوہ محبوب" "ملک و ملت" "دکھنی" معیار کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں کسی سے کم نہیں تھے۔

یہی گوناگوں واقعات ہیں جن کی وجہ سے عہد آصف جاہ سادس کو ایک غیر معمولی امتیاز حاصل ہو گیا ہے۔ اس علمی چہل پہل کا تمام تر دار و مدار حضرت غفران مکان کے علمی ذوق و ادبی شغف پر تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ علم و ادب کی جدید اصلاحی تحریکات کو کامیاب بنانے میں بہت بڑا حصہ حیدرآباد کا ہے۔ اس عہد کی علمی و ادبی تاریخ کے لئے حیدرآباد کی یہ مساعی، زریں ورق ثابت ہوں گی۔







چودہ سال کی مسلسل روحانی کوفت اور جسمانی اذیتوں کے بعد آیوناف سیبیریا کے ادکتاسک جیل سے نکلا۔ مگر اس طائر کی طرح نہیں جو صیاد کے قفس سے بے پر و بال ہو کر نکلا ہو، بلکہ اس شیر کی طرح جسے کٹگھرے کی دیواروں نے کہیں زیادہ خونخوار اور غضبناک بنا دیا ہو۔ اسکی روح کے اندر ایک آتش سیال موج زن تھی جس نے اس کے تناور جسم اور متناسب اعضاء اور لہراتی ہوئی آرزوؤں کو اپنی حدت سے پامال کر دیا تھا۔ مگر اسی پامالی نے آج آیون کے وجود کے ایک ایک ذرہ کو ایک ایک شعلہ بنا دیا تھا، بیتاب، مہلک اور ہیبتناک۔

جیلر نے اس کا وزن لیا۔ داخلہ کے وقت وہ ۲ من ۳۰ سیر تھا۔ آج صرف ایک من ۵ سیر۔ آیون جیل میں دیگر انقلابی قیدیوں کے خلاف بہت محتاط اور متحمل تھا۔ اس لئے جیل کے عملے اس سے ہمدردی کرتے تھے۔

جیلر نے تشویش کے انداز سے کہا۔ تم بہت کمزور ہو گئے آیون۔ تمہیں آئندہ بہت احتیاط سے رہنا پڑیگا۔ تم باہر جا رہے ہو اور تمہیں اب ہر ایک قسم کی آزادی حاصل ہو گی مگر خدا کے لئے اپنی صحت کا خیال رکھنا۔

آیون نے اپنے ہڈیوں کے ڈھانچے کو فاتحانہ نظروں سے دیکھکر کہا۔ "آپ کے اس مشورہ کے لئے مشکور ہوں لیکن میں بالکل تندرست ہوں۔ آپ میری جانب سے ذرا بھی اندیشہ نہ کریں۔"

"تمہاری حالت اچھی نہیں ہے، تھوڑی سی بے احتیاطی بھی خطرناک ہو سکتی ہے۔"

"دل کی آگ جب تک نہ بجھے گی۔ آیون مریگا نہیں مسٹر جیلر۔ سو سال تک نہیں"

آیون بالعموم اسی طرح کی بہکی بہکی باتیں کیا کرتا تھا۔ جیلر نے پروا نہ کی۔ اس کے پرانے امانتی سامان منگوائے گئے۔ اور اس کے سپرد کر دئے گئے۔ کئی کوٹ تھے، کچھ نقد روبل اور نوٹ، کئی تفریح کی کتابیں۔ مگر آیون اپنے ساتھ کوئی چیز نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے صرف ایک سوٹ کافی ہے۔ وہ ساری چیزیں جیل کے کمتر درجہ کے ملازموں کو تقسیم کر دے گا۔

جیلر نے کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا، مسٹر آیون آپ سرکاری ملازموں کو رشوت نہیں دے سکتے۔"

آیون نے ہنسکر کہا۔ "یہ رشوت نہیں ہے مسٹر جیلر۔ اب انھیں رشوت دیکر مجھے ان سے کیا لینا ہے۔ اب یہ ناراض ہو کر میرا کیا بگاڑیں گے اور خوش ہو کر میرا کیا بنائیں گے۔ یہ ان احسانات اور خاطرداریوں کا شکرانہ ہے جن کے بغیر چودہ سال تو کیا، میرا یہاں چودہ گھنٹے رہنا مشکل ہو جاتا۔ شاید کوئی دن آئے کہ ان نیکیوں کا میں اس سے بہتر صلہ دے سکوں۔ فی الحال یہی حاضر ہے۔" جیلر اس کا کیا جواب دیتا۔ آیون نے اپنے لئے صرف ایک سوٹ رکھ لیا۔ باقی سب چیزیں وارڈروں اور مہتروں اور چوکیداروں کو دیدیں۔ پھر سب سے ہاتھ ملا کر خوش خوش ریلوے اسٹیشن چلا

(۲)

پندرہ سال پہلے آیون موسکو کے ایک شریف، متمول خاندان کا چراغ تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں اچھی تعلیم پائی تھی، جفاکش تھا، فیاض تھا، غیور تھا، بیباک تھا، دل آئینہ کی طرح صاف، وفا کا پتلا، ضعیف کی حمایت میں جان پر کھیلنے والا، جس کی ہمتیں خطرے کے مقابل شمشیر برہنہ ہو جاتی تھیں، اس کی جماعت میں ہیلن نام کی ایک حسینہ تھی، ذہانت کی پتلی، طلوع سحر کی طرح شگفتہ اور گل تر کی طرح نازک۔ آیون سیر و شکار کا دلدادہ تھا۔ ہیلن رقص و ترنم پر مائل۔ آیون کی نگاہ میں روپے محض اس لئے تھے کہ دونوں ہاتھوں سے اڑائے جائیں۔ ہیلن نہایت جزرس، آیون کو یہ حال قید سا معلوم ہوتا۔ ہیلن اس دریا کی بط تھی۔ دونوں میں طبعی مناسبت کا نام نہ تھا مگر یہ ضد ہی ان میں فطری کشمکش بن گئی تھی، جس نے بالآخر محبت کی صورت اختیار کی۔ آیون نے شادی کی درخواست کی اور ہیلن نے منظور کر لی مگر اسی اثنا میں دونوں سیاسی کشمکش میں کھنچ گئے۔ ہیلن کی ہمدردیاں شروع سے احرار کی جانب تھیں۔ آیون بھی اس کا ہمخیال ہو گیا۔ دونوں ایک ہی ہیجان کے زیر اثر سیاسی آزادی کے لئے جد و جہد کرنے لگے۔ آیون خاندانی رئیس تھا۔ بہت بڑے علاقہ کا ہونے والا مالک۔ اس کے لئے ایسی حریت جبری قربانی سے کم نہ تھی جہاں شخصی جائداد اور ملکیت کی گنجایش نہ تھی۔ اس لئے جب کبھی وہ اس تحریک سے کچھ دل شکستہ ہو جاتا تو ہیلن کی دلیلیں اس میں تازہ ہمت پیدا کر دیتیں، اور وہ اس کی جرأت اور ایثار سے مرعوب ہو کر اپنے ضعف پر نادم ہو جاتا۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔

انھیں دنوں اس ضلع کا ایک نیا مجسٹریٹ آیا جس کا نام روماناف تھا۔ نہایت جابر، احرار کا جانی دشمن۔ اس نے آتے ہی آتے کئی اخبارات کے ایڈیٹروں کو مغویانہ مضامین لکھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا اور سزائیں دیدیں۔ کاشتکاروں کی انجمنیں توڑ دیں، شہر کی میونسپلٹی معطل کروا دی اور جب اس کے احتجاج میں جلسے ہوئے تو پولیس کے مجمع پر گولیاں چلوائیں جس سے کئی بیگناہوں کی جانیں گئیں۔ شہر میں مارشل لا جاری ہو گیا۔ سارے علاقہ میں کہرام مچ گیا۔ عوام بازاروں میں اور سڑکوں پر نکلتے ڈرتے تھے کیونکہ پولیس ہر ایک کی تلاشی لیتی تھی اور فرضی اسباب پر جرمانے وصول کر لیتی تھی۔ ایک ہنگامہ برپا تھا۔

ہیلن نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ "یہ ظلم تو اب نہیں سہا جاتا آیون۔ اس کا کچھ علاج ہونا چاہئیے۔" آیون نے پرسوال نظروں سے دیکھا۔ "علاج! ہمارے امکان میں کیا ہے؟"

ہیلن سفاکانہ انداز سے مسکرائی۔ "تمہارے امکان میں سب کچھ ہے، میں اسے قتل کر دوں گی۔" آیون نے حیرت سے اسکی طرف دیکھا۔

"تم سمجھتی ہو وہ بڑی آسانی سے قتل کیا جا سکے گا؟ وہ بند گاڑی میں نکلتا ہے، اور اس کے آگے پیچھے مسلح سواروں کا ایک دستہ ہوتا ہے۔ ریل میں بھی وہ رزرو گاڑیوں میں سفر کرتا ہے۔ غیر ممکن ہے ہیلن بالکل غیر ممکن!"

ہیلن چار پانچ منٹ تک چاء بنانے میں مصروف رہی۔ اس کا باپ ایک گرجا گھر کا پادری تھا بہت کم استطاعت۔ ہیلن کو اپنے ذاتی کام اپنے ہاتھوں کرنے پڑتے تھے۔ چاء بنا کر اس نے دو پیالے

میز پر رکھدیئے اور بڑی بڑی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر کر بولی۔ "یہ سب صحیح ہے آگون' لیکن پھر بھی میں اسے قتل کر سکتی ہوں۔ جانتے ہو میں کیا کروں گی؟ میں اس سے راہ و رسم پیدا کروں گی، اس کے دل میں اپنا اعتبار جماؤں گی، اسے اس دھوکہ میں ڈالوں گی کہ میں اسے بہت پیار کرتی ہوں۔ ظالم سے ظالم' خونخوار سے خونخوار مرد بھی حسینوں کے لئے اپنے دل میں ایک نرم جگہ رکھتا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں رومناف کی یہ بیرحمی اور سنگدلی ناکام محبت کا غبار ہے اور کچھ نہیں۔ اسے کسی عیارہ نے چرکا دیا ہے اور اس کا دل کدورت اور نفرت سے پُر ہو گیا ہے۔ نفسانیت ناکام ہو کر خونخوار ہو جاتی ہے۔ مگر ایک حسینہ کے لئے اسے قابو میں کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ ایسوں کو تو وہ چٹکیوں میں اپنے پیروں پر گرا سکتی ہے۔ تم جیسے سیلانیوں کا رام کرنا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اگر تم تسلیم کرتے ہو کہ میں بدصورت نہیں ہوں تو یقین مانو میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہوں گی بتلاؤ میں حسین ہوں یا نہیں؟

آگون نے اس کا بوسہ لے کر کہا۔ "تم یہ مجھ سے پوچھتی ہو ہیلن، میں تو تمہیں دنیا کی حسین ترین عورت سمجھتا ہوں"۔

ہیلن نے منہ پھیر کر کہا۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تم احمق ہو آگون۔ اس شہر میں، نہیں ہماری جماعت میں ہی' مجھ سے بدرجہا نظر فریب لڑکیاں موجود ہیں۔ ہاں تم اتنا کہہ سکتے ہو کہ تم بدصورت نہیں ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو میں تمہیں دنیا کا سب سے خوبرو نوجوان سمجھتی ہوں، میں ایک نہیں، سو نام گنا سکتی ہوں جو تم سے کہیں زیادہ قبول صورت ہیں مگر تم میں کوئی ایسی چیز ہے جو تمہیں میں ہے اور وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی۔ خیر میرا پروگرام سنو۔ پندرہ دن تو مجھے اس سے ربط ضبط پیدا کرنے لگیں گے۔ پھر ایک دن ہم اور وہ دونوں رات کو پارک میں جائیں گے اور تالاب کے کنارے بنچ پر بیٹھیں گے۔ تم اسی وقت آ دُگے اور بس' قصہ تمام ہو جائے گا۔ اس شیطان سے دنیا کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا"۔

جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں آگون ایک رئیس کا لڑکا تھا اور انقلابی سیاسیات سے اسکی ہمدردی تھی۔ ہیلن کی صحبت کے اثر سے نتیجہ ذہنی ہمدردی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ مگر ذہنی ہمدردی صرف زبان سے کام لیتی ہے' جان کو خطرے میں نہیں ڈالتی۔ اس نے علانیہ تو اعتراض نہیں کیا۔ مگر معترضانہ انداز سے بولا۔ "لیکن یہ تو سوچو ہیلن' اس طرح کا قتل کوئی انسانی فعل ہے؟"

ہیلن نے تیکھے پن سے کہا۔ "جو دوسروں کے ساتھ انسانیت سے نہیں پیش آتا وہ انسانی برتاؤ کا مستحق نہیں۔ صدہا بیگناہ اس کے ہاتھوں قید کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ کتنی جھوٹی شہادتیں روز بنائی جاتی ہیں۔ اور کتنے مہمل اسباب پر لوگوں کی جائدادیں ضبط کر لی جاتی ہیں۔ ایسے آدمی کے ساتھ کسی طرح کی رعایت جائز نہیں۔ تم نہ جانے کیوں اتنے ٹھنڈے ہو۔ میں تو اسکی حرکتوں کا خیال کرتی ہوں تو میرے خون میں ابال آ جاتا ہے' آگون۔ معلوم ہوتا ہے جیسے میرے بدن میں آگ لگ گئی ہے۔ جس وقت اس کی سواری نکلتی ہے تو میرا ایک ایک ذرہ غصہ اور قتل کے جذبہ سے جھنجھنا اٹھتا ہے۔ اگر میرے سامنے کوئی اسکی کھال بھی کھینچ لے تو مجھے رحم نہ آئے۔ اگر تم اپنے اندر ایسی ہمت نہیں پاتے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں خود سب کچھ کر لوں گی۔ ہاں دیکھ لینا میں کتنی صفائی سے اس بجس کتے کا خاتمہ کر سکتی ہوں۔ حسینہ کے نازک ہاتھ بھی پستول چلا سکتے ہیں"۔

ہیلن کا خوبصورت چہرہ قاتلانہ حرارت سے تمتما اٹھا۔

آگون نے بھی گرم ہو کر کہا۔ "نہیں نہیں' یہ بات نہیں ہے ہیلن۔ میرا منشاء یہ نہ تھا کہ میں اس کام میں تمہارا شریک نہ ہوں گا۔ آگون تمہاری مرضی سے جہنم میں بھی ہنستا ہوا چلا جائیگا۔ لیکن میں پھر یہ کہوں گا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے اور ہمیں بہت ہوشیاری سے کام لینا پڑے گا"۔

ہیلن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھکر پوچھا۔ "اگر اس اثنا میں میں کوئی ایسی حرکت کروں جو تمہیں پسند نہ آئے تو تم مجھے معاف کر دو گے؟"

آگون نے خودفراموشی کی حالت میں کہا۔ "میں تم سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتا ہیلن۔ تم ناحق یہ سوال پوچھتی ہو"۔

اس کے دو دن بعد سے ناٹک شروع ہوا۔ آغاز یوں ہوا کہ ہیلن ایک پولیس افسر کی زیادتیوں کی شکایت کرنے کے بہانے سے رومناف سے ملی۔ اور اسے یقین دلایا کہ اسپر کتنا بیجا شبہہ کیا جا رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ یونیورسٹی میں اسکی صحبت اس نمائش کے چند نوجوانوں سے ہو گئی تھی، مگر ڈگری لینے کے بعد اس نے ان سے قطع تعلق کر لیا ہے اور وہ امن سے زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ رومناف کارکردہ آدمی تھا' اس نے اپنی دانست میں اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور کتنے ہی ایسے اسرار سربستہ کی تحقیق کر لی جو خفیہ پولیس والوں کے بہت سر مارنے پر بھی نہ معلوم ہو سکے تھے۔ دونوں اپنے اپنے داؤ گھات میں تھے۔ آخر عورت غالب آئی۔ اس آدھ گھنٹہ میں ہی رومناف اس کے حسن و ادا کے سحر اور اس کے خلوص کے جادو سے متاثر ہو چکا تھا۔

چلتے وقت رومناف نے کرسی سے کھڑے ہو کر کہا۔ "مجھے امید ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات نہ ہوگی"۔

ہیلن نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "یور آنر نے جس توجہ سے میری عرضداشت سنی ہے اس کے لئے آپ کی بے حد ممنون ہوں۔ کل آپ میرے یہاں چاء پییں۔

ربط ضبط بڑھنے لگا۔ روز کا واقعہ ہیلن آگون سے من و عن بیان کر دیتی تھی۔ رومناف سچ مچ بڑا فیاض طبع اور صاف گو واقع ہوا تھا۔ وہ رحم دل اور

غرتیمند بھی تھا بشرطیکہ اسے یقین ہو جائے کہ اس کا رحم بے موقع نہیں ہے۔ وہ تعلیم یافتہ آدمی تھا اور اپنے زمانہ میں اس نے یونیورسٹی میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ سیاسیات کے اصولوں سے بھی وہ ماہر تھا اور جانتا تھا کہ سختی ہی ہر ایک سیاسی بیماری کی دوا نہیں ہے۔ یہ کئی سال سے انسانی فطرت کے تاریک پہلو کا مطالعہ کرتے کرتے اور اس خاص ماحول میں رہتے رہتے جہاں شرافت اور بیدار مغزی کی رسائی نہیں ہے وہ یکا استبداد پسند حاکم ہو گیا تھا۔ اور انقلابیوں سے تو اسے حقیقی نفرت تھی جنھیں وہ انسانیت کے درجے سے گری ہوئی مخلوق سمجھتا تھا۔ جو اصولوں اور طریقوں کے اختلاف کو بدنیتی پر محمول کرتے ہیں اور اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ دنیا میں مثالی آدمیوں کا ہمیشہ قحط رہا ہے اور رہے گا۔ بہت عرصہ کے بعد اسے ایک ایسی عورت سے شناسائی ہوئی جو اس کی دفتری اور عدالتی دنیا سے باہر کے مسائل اور حقائق کی باتیں کرتی اور جیا کا نہ انداز سے اس کے عیوب بھی اس پر روشن کر دیتی۔ چنانچہ اس قلیل عرصہ میں ہی ہیلن اس کے مزاج میں امید سے زیادہ دخیل ہو گئی تھی اور کسی غیر محسوس اثر سے شہر میں پولیس کی سرگرمیاں اعتدال پذیر ہوتی جاتی تھیں۔ دو ہفتے گزر گئے۔ اس کے بعد دو ہفتے اور گزر رہے اور آخر وہ مقررہ دن آگیا۔

اس دن آئون اور ہیلن اسی مسئلہ پر بحث کرتے رہے۔ آئون پر شدید اعصابی کیفیت طاری تھی، کبھی اتنے دون کی لیتا گویا روناف کا قتل معمولی کھیل پر گولی چلانا ہے، کبھی اتنا محتاط ہو جاتا گویا اس کے سامنے صلیب کا تختہ ہے۔ نامعلوم کی ہیبت اس کے حواس کو مفلوج کر رہی تھی۔ ہیلن بھی کچھ مغموم اور افسردہ خاطر تھی۔

ہیلن نے آج کے لئے خاص طور پر ہیٹ و سگریٹ بنوائے تھے اسے نکالتی ہوئی دردناک لہجہ میں بولی۔ "انسان کو بعض اوقات کتنے ناگوار فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں آئون"۔

آئون نے ارتے ہوئے دل سے کہا "اسی کا نام زندگی ہے"۔

"اس کا نام زندگی نہیں۔ اس کا نام دوزخ ہے"

"دنیا میں ابھی کچھ دن اور اسکی ضرورت رہے گی"

کاش آئون اس کے ان کنایوں کی تہہ تک پہونچ جاتا! اسکی جانب سے اگر ذرا بھی تامل کا اظہار ہوتا تو ہیلن بھی کھل پڑتی، مگر آئون میں اتنی فراست نہ تھی اور ہیلن میں اتنی جرأت نہ تھی۔

دونوں خوب گلے مل کر رخصت ہوئے۔ کون جانے یہ آخری ملاقات ہو، دونوں کے دل بھاری تھے اور آنکھیں نم۔

آئون نے کہا "میں ٹھیک وقت پر آجاؤں گا"۔

ہیلن نے کچھ جواب نہ دیا۔ دل کہیں اور تھا"

آئون نے پھر کہا "خدا سے دعا کرنا ہیلن۔

ہیلن نے جیسے روتے ہوئے گلے سے کہا "مجھے خدا پر بھروسہ نہیں ہے۔ پھر بھی دعا کرنا۔ خدا حافظ۔"

دس بج گئے تھے۔ ہیلن اور روناف پارک کے ایک کنج میں بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تیز برفیلی ہوا چل رہی تھی اور چاند کسی موہوم امید کی طرح ہلکے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔

ہیلن نے ادھر ادھر وحشت آمیز نظروں سے دیکھکر کہا "اب تو دیر ہو رہی ہے۔ یہاں سے چلنا چاہیئے"۔

روناف نے بنچ پر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو ایسی دیر نہیں ہوئی ہے ہیلن۔ زندگی کے یہ لمحے معلوم نہیں خواب تھا یا حقیقت، لیکن ان میں تازہ گلاب کی مہک ہے جس نے میری ساری زندگی کو معطر کر دیا ہے"۔

ہیلن بے چین ہو کر اٹھی اور روناف کا ہاتھ پکڑ کر بولی "میری طبیعت آج کچھ اچھی نہیں ہے۔ چلو مجھے میرے گھر پہونچا دو۔ اُدھر سے چلے جانا۔ یا کہیں اور چلو۔ یہاں بیٹھنے کا جی نہیں چاہتا"۔ ...

روناف نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بغل میں بٹھاتے ہوئے کہا "لیکن میڈم تو گیارہ بجے مانگی گئی ہے"۔

ہیلن کے مونہہ سے چیخ سی نکل گئی "گیارہ بجے!"

"ہاں اب گیارہ بجا ہی چاہتے ہیں۔ ذرا دیر اور بیٹھو۔ بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہو تو میرے زانو پر سر رکھکر لیٹ جاؤ۔ آج تو ابھی کچھ بات چیت ہی نہیں ہوئی۔ تم نے میری زندگی کی رفتار میں جو تبدیلی پیدا کر دی ہے اسے سوچ کر میں حیرت میں آجاتا ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں تم اس دن میری خوش نصیبیوں کی دیوی بن کر آئی تھیں ہیلن۔ نہیں ابتک میں نے خدا جانے کیا کیا قہر ڈھائے ہوتے۔ اس ملاطفت کی پالیسی نے فضاء میں کتنا خوشگوار تغیر پیدا کر دیا ہے کہ اس وقت میں خواب میں بھی اسکی امید نہ کر سکتا تھا۔ مہینوں کی استبدادیت میں جو کچھ نہ کر پایا تھا وہ دنوں میں حاصل ہو گیا اور اس کے لئے میں تمہارا مشکور رہوں ہیلن۔ بیحد مشکور رہوں مگر افسوس یہی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نتائج کی پروا نہیں کرتی۔ وہ صرف مارنا جانتی ہے، دوا کرنا نہیں جانتی۔ زار کے مشیروں میں ابھی سے چہ میگوئیاں ہونے لگی ہیں اور مجھے یہاں سے واپس بلانے کی تجویز در پیش ہے۔ ان کے خیال میں میں بہت ناکام افسر ہوں۔ حالانکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ جب تک ہز مجسٹی زار کے کانوں تک سارے حالات نہ پہونچا دوں، یہاں سے جانے کا نام نہ لوں، ورنہ ابتک جو کچھ کیا ہے وہ سب مٹی میں مل جائے گا"۔

دفعتاً فارج کی چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی بجلی کی طرح چمک اٹھی اور ریوالور چھوٹنے کی آواز آئی۔ اسی وقت روناف نے جست مار کر آئون کو پکڑ لیا اور زور سے چلایا "قتل! قتل!"

پارک میں کئی سنتری تعینات تھے۔ سب کے سب فوراً لپکے اور آئون کو گرفتار کر کے اسٹیشن کی طرف چلے۔ دم کے دم میں خدا جانے کہاں سے ٹاؤن پولیس اور سوار پولیس اور مسلح پولیس اور خفیہ پولیس کے پرے کے پرے آپہونچے۔ پولیس کے انسپکٹر نے روناف کا بیان لکھا اور اسے مسلح لاری پر بٹھا کر اس کے محل پہونچایا۔

روناف نے ہیلن سے ہاتھ ملا کر کہا "یہ آئون تو وہی شخص ہے جو تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں تھا"۔

ہیلن نے مری ہوئی آواز میں کہا "ہاں ہے تو۔ لیکن مجھے اس کا مطلق گمان نہ تھا کہ وہ انقلابی ہو گیا ہے۔ گولی میرے سر پر سے سن سن کرتی ہوئی نکل گئی۔

"یا خدا"

"میں نے دوسرا نشانہ چلانے کا موقعہ ہی نہ دیا"۔

"مجھے تو اس نوجوان کی حالت پر افسوس آرہا ہے ہیلن۔ یہ بدنصیب سمجھتے ہیں کہ ان ابلہانہ حرکتوں سے وہ ملک کی اصلاح کریں گے۔ اگر میں مر ہی جاتا تو میری جگہ کیا مجھ سے بھی زیادہ جابر اور ظالم آدمی نہ آجاتا۔ اور کیا یہ سلسلہ کبھی منقطع ہو سکتا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ تم مطلق پریشان نہ ہونا ہیلن۔ مجھے کسی طرح کا رنج یا غصہ یا خوف نہیں ہے"۔

دوسرے ہی دن مجسٹریٹ کے اجلاس میں مقدمہ پیش ہوا۔ اور ہیلن سرکاری گواہ تھی! آئون کو معلوم ہوا دنیا اندھیر ہو گئی ہے اور وہ اس کی اتھاہ گہرائیوں میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ مقدمہ سشن سپرد ہوا۔ وہاں بھی ہیلن موجود تھی۔

اور اس چودہ سال کے قید سخت میں جس چیز نے ساری اذیتیں اور صعوبتیں اس کے لئے آسان کر دیں وہ ایک شعلہ تھا جو ہمیشہ اس کے اندر جلتا رہتا تھا۔ وہ ہیلن کے کانوں میں ان مشتعل، طوفانی، جگر دوز کلمات کو سیسہ کی طرح داخل کر دینا چاہتا تھا جو طلراً

کے سیلاب کی طرح اس کے اندر متلاطم رہتے تھے اور جن کے مدمیں کبھی جزر نہ ہوتا تھا ہیلن کو جسمانی ایذا پہونچانے کا اس کے دل میں بھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ وہ اپنی مردانیت کو ایک کمزور عورت کے قتل سے شرمندہ نہ کریگا۔ شاید قتل کو وہ اُس دغا کی کافی سزا نہ سمجھتا تھا۔ وہ اسے کچلی ہوئی ناگن کی طرح تڑپتے اور اینٹھتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اسکے وہ الفاظ ہیلن کی روح پر زہریلے آتشیں سیلاب کی طرح گریں گے اور اگر اس میں غیرت کا احساس فنا نہیں ہوگیا ہے تو اس کے جسم کا ایک ایک عضو بچھنے والے بچھوے کی جاں گسل ننگا فوں کی جاں کندنی محسوس کریگا۔

ان چودہ سالوں میں اس نے جو اذیتیں جھیلی تھیں انھیں، وہ چند کلمات کے اندر گویا ان کی روح نکال کر پیوست کر دینا چاہتا تھا۔ ہیلن کے لئے اب اُس کے دل میں کہیں ملامت یا ورد یا عفو کی گنجائش نہ تھی۔ اور وہ الفاظ کیا تھے ؟"ہیلن، تم نے میرے ساتھ جو دغا کی ہے شاید وہ نسوانی عیاریوں کی تاریخ میں بھی بے مثال ہے۔ میں تو محض تمہارے اشاروں کا غلام تھا۔ تم نے ہی مجھے رو مناف کے قتل پر آمادہ کیا تھا۔ اور تم نے ہی میرے خلاف شہادت دی۔ محض اپنی سیہ کاریوں میں آزاد ہو جانے کے لئے۔ میرے خلاف کوئی دوسری شہادت نہ تھی۔ رو مناف اور اسکی ساری پولیس فرضی شہادتوں سے مجھے ماخوذ نہ کرسکتی تھی۔ مگر تم نے محض اپنے نفس سیہ کی تشفی کے لئے، محض رو مناف کے مکروہ آغوش میں اپنے زناکارانہ ہوس کو پورا کرنے کے لئے، یہ ستم ڈھایا۔ مگر دیکھ او مکارہ۔ آج آئون۔ تیری ان ساری مکاریوں اور ہوس رانیوں کا پردہ فاش کرنے کے لئے تیرے سامنے کھڑا ہے۔ تیری ساری حرام کاریاں اسکی ہمتوں کو پامال نہیں کرسکیں۔ تو نے قوم کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا قوم کا بیڑا تو نے یوں غرق کر دیا۔ تو اپنے کو قوم پر نثار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن نفس کی پہلی ہی ترغیب میں تو اپنے سارے اصولوں اور ارادوں کو پس پشت ڈال کر نفس کی غلامی کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ اختیار اور اقتدار کا پہلا ہی ریزۂ استخواں دیکھکر تو دُم ہلاتی ہوئی اس پر ٹوٹ پڑی۔ تف ہے تیری نفس پروری پر! لعنت ہے تیری زندگی پر!!

(۳)

شام کا وقت تھا، مغرب کے افق پر دن کی چتا جل کر ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اور رو مناف کے شاندار محل میں ہیلن کا جنازہ لے چلنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، شہر کے معززین جمع تھے۔ اور رو مناف سیاہ بادہ پہنے، جنازے کو پھولوں سے آراستہ کر رہا تھا، اور انھیں اپنے آنسوؤں سے تر کرتا جاتا تھا۔ اسی وقت آئون وحشت کی تصویر بنا ہوا، لاغر، تر دلیدہ مو، خمیدہ، بدہیئت آکر کھڑا ہوگیا۔ کسی نے اسکی طرف دھیان بھی نہ دیا۔ سمجھے کوئی سائل ہوگا، جو ایسے موقعوں پر خیرات کے لئے آجایا کرتے ہیں۔

جب شہر کے راہب اعظم نے دعائے مغفرت ختم کرلی اور خانقاہ کی دختران مریم نئی زندگی کے خیر مقدم کا نغمہ گا چکیں تو آئون نے جنازہ کے پاس آکر اپنے نفس کی ساری خباثت اور تندی اور دریدہ دہنی کو لفظوں میں بھر کر کہا "ساری دنیا کی دختران مریم اور راہبوں کی آہ و زاریاں بھی اس ملعون عورت کو جہنم سے نہیں بچا سکتیں۔ وہ بیوفا تھی، دغا شعار تھی، خبیث النفس تھی۔۔۔۔۔۔"

کئی آدمیوں نے ادھر اُدھر سے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھکے دیتے ہوئے پھاٹک کی طرف لے چلے۔ اس وقت رو مناف نے آکر اسے اس نرغہ سے نکالا اور اسے علیحدہ لے جاکر پوچھا "دوست! کیا تمہارا نام کلاڈیس آئوناف ہے؟ ہاں تم وہی ہو۔ مجھے تمہاری صورت یاد آگئی، حالانکہ تم بہت تبدیل ہوگئے ہو۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے، ذرہ ذرہ معلوم ہے۔ ہیلن نے مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی۔ اسے زندگی بھر اس کا افسوس رہا۔ وہ کتنی بار اس واقعہ یاد کرکے پھوٹ پھوٹ کر روئی ہے کہ شاید تم سن سکتے تو تمہارے اندر کا آتش کدہ بھی سرد ہو جاتا۔ ہمیشہ تمہارا ذکر کرتی رہتی تھی، بڑی محبت اور عزت سے۔ اس کی زندگی کی یہ سب سے بڑی تمنا تھی کہ تمہارے سامنے گھٹنے ٹیک کر عفو کی خواستگار رہو۔ مرتے مرتے اس نے وصیت کی کہ تمہارا پتہ لگا کر اس کا یہ پیغام تم تک پہونچاؤں۔ جس وقت وہ آنکھوں میں آنسو بھرے تمہارے روبرو آتی تو تم پتھر بھی ہوتے تو پگھل جاتے۔ کیا اس وقت بھی وہ تمہیں التجا کی صورت بنی کھڑی نظر نہیں آتی؟ ذرا ایک کر اس کے خنداں چہرے کو دیکھو ماتیو آئون۔ تمہارا جی اب بھی اس کا بوسہ لے لینا چاہے گا۔ مجھے ذرا بھی حسد نہ ہوگا۔ دیکھو تو اس کی معصومیت اسکی کیسی بلائیں لے رہی ہے۔ وہ ان پھولوں کے بیچ میں لیٹی ہوئی، آہ! کتنی حسین معلوم ہوتی ہے۔ اس کی صرف ایک تمنا رہ گئی ماتیو آئون، وہ تمہارا عفو ہے۔ عاشق کا دل بے انتہا فیاض ہوتا ہے ماتیو، بے انتہا فیاض۔ مجھے یقین ہے کہ جسے تم نے ایک بار سچے دل سے پیار کیا تھا اس کی اس التجا کو رد نہ کروگے۔"

یہ کہتا ہوا رو مناف آئون کا ہاتھ پکڑے، صدہا متجسس نگاہوں کے درمیان جنازے کے پاس پہونچا اور تابوت کا اوپری تختہ کھسکا کر ہیلن کا چہرہ اسے دکھایا۔ ہیلن اب بھی اپنی ساری دلربائیوں کے ساتھ جن پر اب پاکیزہ روحانیت سکرا رہی تھی، متین، پرشکوہ، لیٹی ہوئی تھی۔ گویا التجا کے الفاظ اس کے لب پر مترنم ہیں۔ مارے شرم کے باہر نہیں نکل سکتے۔ آئون کے دل سوزاں پر موت کے سکون انگیز مرہم کا برقی اثر ہوا۔ اس کی نظروں میں وہ مبارک دن پھر گیا جب اس نے ہیلن کو آغوش محبت میں لیا تھا اور اس پر اپنی جان نثار کی تھی۔ اس ایک لمحہ کی روحانی راحت کے لئے کیا وہ پھر چودہ سال کی سختیاں جھیلنے پر آمادہ نہ ہو جائے گا؟ اس کے دل سے کدورت اور منافرت کا غبار کسی غیبی اثر سے مٹتا جا رہا تھا اور اس میں پھر وہی محبت امڈتی آتی تھی جو سب کچھ نثار کرتی ہے اور صلہ نہیں چاہتی۔ کیا اب بھی اسکی زندگی کے بہترین لمحے وہ نہ تھے جو ہیلن کے ساتھ گزرے تھے؟ اور کیا ان چند لمحوں کی لازوال مسرت کو وہ ان چودہ برسوں میں بھی فراموش کر سکا تھا؟ اس کے دل میں چھائے ہوئے ابر میں سے دفعتاً ہیلن چاند کی طرح طلوع ہوگئی۔ اور آئون تابوت کے پاس جاکر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بولا "اے پاک خدا! تو پیاری ہیلن کو جوار رحمت میں جگہ دے۔"

اور جس وقت وہ تابوت کو کندھے پر رکھے ہوئے چلا تو اس کا نفس شرمندہ تھا، اپنی کم ظرفی پر، اپنی تنگدلی پر، اپنی ارزاں پسندی پر، جس نے اس لافانی محبت کی مبارک یادگاروں کو فراموش کرکے انتقام اور منافرت کے جذبات پیدا کئے۔ اور جب لحد میں تابوت رکھدیا گیا تو وہ وہاں بیٹھ کر خدا جانے کب تک روتا رہا۔ کیا سوچ کر، کون جانے۔



وقائع نگاری

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

اسلامی نظم ونسق میں خبر رسانی کی جو اہمیت تھی اس کے مدنظر اس وقت اس کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے موجودہ زمانے میں حکومت ملک اور اہل ملک کے حالات اور خیالات سے واقفیت رکھنے کے لئے جو کام سی آئی ڈی کا سررشتہ انجام دیتا ہے وہ دراصل قدیم وقائع نگاری اور سوانح نویسی کی دوسری شکل ہے۔

اسلام میں وقائع نگاری کی ابتدا آغاز اسلام ہی سے پائی جاتی ہے جس وقت آنحضرت صلعم ہجرت کے لئے غار حرا میں تشریف فرما تھے تو اس وقت عبداللہ ابن ابوبکر صدیق رضہ کو اس امر پر متعین کیا گیا تھا کہ وہ تمام دن مکہ میں رہیں اور رات کے وقت غار کے پاس آکر قریش کے حالات سے مطلع کیا کریں۔ اس کے بعد جب آپ مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہوگئے اور جنگ بدر میں دیگر قیدیوں کے ساتھ حضرت عباسؓ آپ کے عم محترم بھی قید وبند میں آگئے تھے تو انہیں رہائی کے بعد یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ علی حالہ مکہ میں قیام کریں اور قریش کے حالات سے مطلع کیا کریں۔

آنحضرت صلعم کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کی جانب خاص توجہ کی گئی اور خبر رسانی کے سلسلہ کو ترقی دی گئی۔ آپ نے ہر فوج کے ساتھ پرچہ نویس لگا رکھے تھے جس کے باعث فوج کی معمولی سے معمولی بات بھی آپ سے پوشیدہ نہیں رہتی تھی آپ نے اس کا انتظام اس قدر باقاعدہ اور منظم فرمایا تھا کہ کسی واقعہ کے رونما ہونے کے بعد جلد سے جلد اس کی اطلاع ہو جاتی تھی چنانچہ ایک مرتبہ عمرو معدی کرب نے اپنے افسر کی شان میں گستاخانہ کلمہ کہدیا۔ حضرت عمرؓ کو فوراً اس کی خبر ہوگئی اور اسی وقت انھوں نے عمرو معدی کرب کو تحریر کے ذریعہ تنبیہ کی دی چنانچہ ان کو پھر کبھی ایسی جرأت نہیں ہوئی۔

خلفائے راشدین کے بعد عہد بنی امیہ میں اس کے متعلق مزید اہتمام کیا گیا اور نہایت باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ خبر رسانی کے جو مختلف ذرائع اختیار کئے گئے تھے ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ پرندہ کو خون میں تر کرکے بادشاہ کے پاس روانہ کیا جاتا کہ کسی غم کی خبر سے خلیفہ مطلع ہو جائے۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے جب شہر قنسرین میں ایک محل "رصافہ" نام تعمیر کیا تو اس کو یہ خواہش ہوئی کہ ایک روز اس طرح خلوت میں بسر ہو کہ کوئی غم کی بات نہ سنی جائے مگر دو پہر نہ ہونے پائی کہ ایک پرندہ جو کسی قلعہ سے خون آلود کرکے غم کی خبر سنانے کیلئے بھیجا گیا تھا آ پہنچا۔ اس کو دیکھکر ہشام نے کہا افسوس ہم کو ایک دن بھی بے فکری کا نہیں ملتا۔

بنی عباس کے زمانہ میں بھی سلطنت کی وسعت کے مدنظر خبر رسانی کا بھی وسیع انتظام کرنا لازمی تھا چنانچہ اس کا معقول انتظام تھا۔ اس عہد کے عروج کے زمانے کے قطع نظر ہم زوال کے زمانے کے بعض واقعات تحریر کرتے ہیں جس سے اس امر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عروج کے زمانہ میں اس کا کیا کچھ انتظام نہ ہوگا۔

خلیفہ الناصر لدین اللہ (۵۷۵ھ تا ۶۲۲ھ) نے اس امر کا خاص انتظام کیا تھا کہ پرچہ نویس خفیہ طور پر اس کو حالات سے مطلع کیا کریں خلیفہ کے انتظام اور اس کی خاص دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ دور دور کے واقعات کا بالکل صحیح علم ہو جاتا تھا حتے کہ خلیفہ کے اس خبر رسانی ذریعہ کے باعث اکثر کم فہم و خوش عقیدہ لوگ خلیفہ کو صاحب دل اور روشن ضمیر تصور کرنے لگے تھے۔

بعض واقعات سے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں وقائع نویسوں کے کارگزاری کی بخوبی صراحت ہو سکتی ہے۔

خوارزم شاہ کا ایلچی اپنے بادشاہ کا مخفی خط سر بمہر لیکر حاضر ہوا۔ ناصر نے اس کو دیکھتے ہی کہدیا مجھے اس خط کے مضمون کی اطلاع ہے تم واپس چلے جاؤ اس کا جواب پہونچ جائے گا۔ چنانچہ اس ایلچی کے واپس پہنچنے سے پہلے ہی اس کا جواب بادشاہ کو مل گیا۔

ایک شخص ہندوستان سے خلیفہ کے واسطے ایک طوطا لیکر چلا جو سورۂ اخلاص پڑھا کرتا تھا۔ لیکن راستہ میں وہ طوطا مرگیا۔ اس کو سخت رنج ہوا۔ اتنے میں خلیفہ کا خادم آکر وہ طلب کیا۔ وہ شخص رو پڑا اور کہنے لگا وہ تو رات کو مرگیا۔ خادم نے کہا مجھے معلوم ہے لا مرا ہوا طوطا ہی دیدے۔ اور دریافت کیا تجھے خلیفہ سے کتنے انعام کی توقع تھی اس نے کہا پانسو دینار۔ خادم نے وہی پانسو دینار گن کر رکھدیئے اور کہا یہ امیرالمومنین نے عطا کئے ہیں تو جس روز ہندوستان سے چلا تھا اسی روز سے خلیفہ کو تیرا حال معلوم ہو چکا تھا۔ صدر جہاں جب بغداد آئے تو انکے ہمراہ بہت سارے فقہا بھی تھے۔ ان کی بی بی نے کہا۔ گھوڑا یہیں چھوڑ جاؤ کہ مبادا بغداد میں کوئی چھین لے۔ انھوں نے کہا کہ خلیفہ وقت تک کو تو اس گھوڑے کے چھیننے کی مجال نہ ہوگی اور تو کوئی بھلا کیا لے سکتا ہے۔ خلیفہ نے اپنے باورچی کو حکم دے رکھا تھا کہ گھوڑا چھین لیا جائے چنانچہ باورچی نے فقیہہ کو مار کر گھوڑا چھین لیا غریب نے فریاد کی مگر کسی نے توجہ نہیں کی۔ صدر جہاں جب واپس چلنے لگے تو ان کو اور ان کے ساتھیوں کو بارگاہ خلافت سے خلعت اور انعام دیا گیا اس فقیہہ کو بھی خلعت ملا اور وہی گھوڑا مع طلائی ساز و سامان کے دیا گیا۔ خلیفہ نے خود اپنی زبان سے فرمایا اپنا گھوڑا لے لو۔ خلیفہ کو تو بیشک اس کے لینے کی جرأت نہیں ہوئی لیکن اس کے ایک ادنے خدمت گار نے اس کو چھین لیا یہ سنکر فقیہہ کے حواس غائب ہوگئے اور وہ خلیفہ کی کرامت کا قائل ہوگیا۔

ایک مرتبہ ایک سوداگر بغداد میں آیا اس کے ساتھ طلائی سامان تھا۔ چنگی والوں نے محصول طلب کیا مگر اس نے کہا میرے پاس وہ چیز نہیں ہیں جن کا تم محصول طلب کرتے ہو۔ اس پر انہوں نے تمام چیزوں کی نشانیاں اور ہر شئے کی صورت و شکل بیان کی لیکن اس پر بھی وہ انکاری رہا۔ اسے خلیفہ کو مطلع کیا گیا اور بارگاہ خلافت کی ہدایت کے بموجب پوچھا گیا کہ تو نے اپنے فلاں ترکی غلام کو فلاں وجہ سے قتل کرکے سمندر کے کنارے نہیں دبا دیا ہے۔ یہ سنکر وہ حیران ہوگیا کیونکہ اس واقعہ کی کسی کو خبر نہ تھی۔

ابن واصل بیان کرتے ہیں کہ عراق میں ہر طرف خلیفہ نے مخبر چھوڑ رکھے تھے جو جزئیات تک کی خبر دیتے تھے چنانچہ ایک شخص نے معمولی طور پر چند آدمیوں کی دعوت کی اور اتفاقاً مہمانوں سے پہلے اس نے اپنے ہاتھ دھو لئے ناصر نے اس کی چشم نمائی کی۔

اس صراحت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خبر رسانی کا کیا انتظام اور کس قدر وسیع تھا۔

دیگر اسلامی سلطنتوں میں بھی اس کا انتظام تھا

طوالت کے خوف سے اس کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ صرف مغلیہ حکومت کے انتظامات کے متعلق صراحت کی جاتی ہے مغلیہ حکومت کی ابتداہی سے یہاں اس کا وجود پایا جاتا ہے اس کی مختلف صورتیں تھیں مثلاً اکبر کے زمانے میں واقعہ نویسی ایک اور معنے میں بھی استعمال ہوتی تھی یعنے خود بادشاہ کے روزانہ حالات اور روزنامچہ کا مرتب کرنا واقعہ نویسی کہلاتا تھا اس کے لئے روز دو منشی مقرر ہوتے تھے جو ہر ایک واقعہ کو لکھا کرتے۔ جن امور کو یہ ضبط تحریر میں لاتے تھے وہ یہ تھے بادشاہ کے احکام، اہل اور کار پردازان سلطنت کی عرض معروض، بادشاہ کا اکل و شرب خواب و بیداری، نشست و برخواست حرم میں وقت گذاری کی مدت رونق افروزی دربار عام و خاص، کیفیت شکار، کوچ و مقام، نذرانے سماعت کتب، خیرات و انعام ریاضت روزانہ و ماہانہ، عطا منصب و جاگیر وغیرہ، خراج کی کمی و بیشی اجارہ و بیع، تحویل پیشکش ارسال و نفاذ فرامین، عرائض کا پیش ہونا اور جوابات، ملازمت رخصت، ملاحظہ۔ افواج و جنگ و فتح و صلح و اکابر کی موت کی اطلاع، جانوروں کی لڑائی کی کیفیت سفطی ایوان سرائیں، معاقبات، روئداد دربار عام، شادی، پیدائش چوگان بازی، دیگر دوسرے کھیل شطرنج گنجفہ وغیرہ اس کے سوا حوادث ارضی و سماوی وغیرہ وغیرہ آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خدمت کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی تھی اور چودہ منشی اس کام کیلئے مقرر کئے گئے تھے اور ان کے

دو روزانہ حاضر ہوتے اور اپنی مفوضہ خدمت کو بجالاتے تھے۔ جب یہ واقعات لکھ دیئے جاتے تو ایک افسر کے توسط سے ان کو بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کیا جاتا اور توثیق عمل میں آتی پھر اس افسر کی دستخط ہوتی اور دیگر ملازمین میر عرض وغیرہ کی مہریں ہوتی تھیں۔ اس کی نقلیں بھی کی جاتی اور اس پر واقعہ نویس میر عرض داروغہ کی مہریں ہوتی تھیں۔ اس کے بعد اس پر اعیان دولت کی مہریں بھی ہوتی تھیں۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ واقفیت بڑھے اور ضرورت کے وقت کسی قسم کی کمی و بیشی نہ ہونے پائے۔ اس نوشتہ کو تعلیقہ لکھنے والے کو تعلیقہ نویس کہا کرتے تھے

اکبر کے بعد جو کام وقائع نگاری سے وابستہ تھا اس کی صراحت مصنف "مراۃ احمدی" نے تفصیل سے کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر فوج میں وقائع نگار موجود رہا کرتا کبھی بخشی فوج کو یہ خدمت ملا کرتی اور کبھی علٰحدہ شخص بھی مقرر ہوتا تھا بعض پرگنہ جات پر اس کا نائب بھی رہا کرتا تھا جو وہاں کے حالات لکھا کرتا۔ اس کا کام تھا کہ کچہری

واقعات ناظم ستر کے حالات، دیوان اور فوجدار کے عدالتی فیصلہ اور کوتوالی کے حالات سے مطلع کیا کرے اس کے علاوہ ضبطی جاگیر و منصب۔ نوتی و فراری غیر حاضری وغیرہ لکھکر اس پر مہر کرکے دیوان صوبہ کو روانہ کرے وہاں سے داروغہ ڈاک کے ذریعہ بادشاہ کی خدمت میں ارسال کیا جاتا تھا۔

دوسری خدمت سوانح نویس کی تھی۔ وقائع نگاری اور سوانح نویسی میں فرق یہ تھا کہ وقائع نگاری کی اطلاع توسط کے ساتھ علانیہ ہوتی تھی اور سوانح نویس کی اطلاع راست بادشاہ کو بلا کسی توسط کے خفیہ طور پر دی جاتی تھی۔

وقائع نگار کی طرح سوانح نویس بھی صوبہ جات اور پرگنہ جات وغیرہ میں ہوتا تھا اور مخفی طور پر اخبار لکھا کرتا۔ ان اخباروں کو بادشاہ کی خدمت میں داروغہ ڈاک پیش کرتا تھا ان دونوں خدمتوں کے متعلق ایک ادنے خدمت ہرکارہ کی بھی تھی جو ان اخباروں کو پہنچایا کرتے تھے۔ ان تینوں کو اخبار کہا جاتا تھا۔

شاہی کاتب کے جو فرائض ہوتے تھے ان میں اس خدمت کے فرائض کی نگرانی بھی شامل ہوتی تھی۔ کاتب کا فریضہ ہوتا تھا کہ وہ ڈاک کے انتظامات کی نگرانی کرے اور خط لیجانے والے تندرست تجربہ کار اشخاص مقرر کرے، نامہ بر کبوتروں کے رہنے کے مقامات سے واقف رہے اور ان کی نگرانی کرے۔ ڈاک کے ہرکاروں اور گھوڑوں کی نگرانی بھی اس کے فرائض میں شامل ہوتی تھی۔

غزل

از علامہ ضیا یار جنگ بہادر ضیا

احساں بخواب دیدۂ راحت پسند کن
چیدا ست گرد کانِ گہر تختہ بند کن

چشمت اگر پیالہ بہ مستاں زند چہ سود
گہ جرعۂ بکامِ دلِ درد مند کن

چوں تاک سر برید تم احیا برابر است
از ہم جدا چو نیشکرم بند بند کن

دل رارمِ غزالۂ آزاد کردہ است
طوقش بہ گردن از خمِ مشکیں کمند کن

عمریست دل ز لعل تو آتش گرفتہ است
درمانِ اختلاج ز نسرین و قند کن

چوں مہر سر بہ سجدۂ شکرِ تو دادہ ام
نامِ مرا بعرصۂ گیتی بلند کن

زخمِ جگر کہ بستہ دہان است خوب نیست
ایں بستہ را نمکِ بہ لب از ہوش خند کن

یاقوت لختِ دل گہر اشک پیشِ تست
در خاطر آنچہ خوشش بہ نماید پسند کن

مضمون نہاں ز نا دریدن نمی شود
در مجمر ایں قُراضۂ بجائے سپند کن

گر تیرہ شد زمانہ بہ اہلِ سخن چہ باک
روشن چراغِ بزمِ کمالِ تجند کن

تا کے ضیا ز دستِ نظیری فغاں کنی
معنی بلند آور و دعوے بلند کن

(لہ ریزۂ زر)

مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت اخبارات کی جو حالت اور کیفیت تھی ..... و ه ... انڈین اکاڈمی کمیشن کی رپورٹ سے واضح ہوتی ہے اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے "مابعد کے اخبارات میں خصوصیات کے لحاظ سے دو قسم کی تبدیلی دکھائی دیتی ہے پہلی یہ کہ ان میں اخبارات دربار اورنگ زیب یا بہادر شاہ کی طرح دربار کی کوئی سنی سنائی یہودہ یا بڑی خبر درج نہیں ہوتی بلکہ وہ نہایت ہی طویل اور منتخب واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یا ہماری عام بول چال میں یوں کہیے کہ ان میں معاصر کی طرح بالکل خلاصہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان میں اخباری رپورٹوں کی سی خصوصیات موجود ہیں۔ ان میں دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ کئی روز کی یا بندرہ روز کی جملہ خبریں ایک ہی اخبار میں لکھی گئیں۔ ان اخبارات کے نام میں بھی تبدیلی ہو گئی اور یہ اخبارات دربار معلی کے نام سے موسوم نہیں ہیں بلکہ ان کا نام محض اخبار۔ سوانح۔ پرچہ اخبار یا احوال تازہ ہے۔

"دربار شاہی کا روزنامچہ" اخبار دربار معلی" کے نام سے موسوم تھا ان اخبارات کے لکھنے والے نائب یا صوبہ داروں کے مقرر کردہ نمائندے ہوتے تھے۔ ......

....

....

عام طور پر ان اخبارات میں شاہی دربار کی روزانہ خبریں ایک چھوٹے سے کاغذ پر لکھی جاتیں بعض ان میں دربار کے انعقاد اور برخاست کا ٹھیک وقت گھنٹے اور منٹ تک بتائے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں باریاب شدہ اشخاص کے نام اور نذرانے۔ جدید اعلیٰ تقررات ترقیات۔ خلعتیں۔ ماتحت صوبہ جات کی مرسلہ میدان جنگ کی خبریں شاہی احکام سفر شاہانہ اور بہت سے دلچسپ کارہائے نمایاں واقعات جو شاہی دربار میں ہوا کرتے تھے یہ سب ان اخبارات کے موضوع تھے۔ ان اخبارات سے اس زمانہ کی زندگی کی اصلی تصویر دکھائی دیتی ہے مثلاً شیواجی کے حملہ کی خبر سن کر اورنگ زیب نے خاموشی اختیار کی اور دوسرے موقع پر جب کہ شیواجی کی زیادتیوں اور مظالم کی انتہا ہوئی اور خزانہ شاہی بھی ان نقصانات کی تلافی نہ کر سکا اور ایک صوبہ کے متعلق وزیر نے بھی اطلاع دی تو بادشاہ نے اس کو خاموشی سے پڑھا اور اپنی پاکٹ میں رکھ لیا۔ اور سنہ ۱۷۰۲ء میں جبکہ دشانگر کے محاصرہ کے وقت مرہٹہ سپہ سالار نے قلعہ سے شرائط صلح کی درخواست پیش کی تو اورنگ زیب نے نہایت غصہ سے اس کو پھاڑ کر پھینک دیا"

اس تفصیل سے اس زمانے کے اخبارات کی وضاحت ہو جاتی ہے مغلیہ سلطنت کے زوال پر سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں بھی وقائع نگاری اور سوانح نویس کا عہدہ قائم تھا۔ اسی کے ساتھ ایک اور ایسا وقائع نگار بھی مقرر کیا گیا تھا جو دارالسلطنت دہلی میں رہا کرتا اور وہاں کے حالات سے مطلع کیا کرتا تھا۔ یعنے دربار معلیٰ کے حالات کی اطلاع دیا کرتا۔

غزل

از مولوی محمد عبداللہ خان صاحب کامل

لبِ لعل تو بہ جنبش ز سر ناز آمد | بینواں گفت مگر عہد بلا باز آمد
ہر کجا می نگری فتنۂ محشر خیزد | چشمِ مست تو عجب عربدہ پرداز آمد
آنکہ سیراب کند تشنہ لباں را ز نظر | سحر آمیختہ با غمزۂ غماز آمد
لبِ نوشینکہ جہانیست در افسانۂ او | باز با عشوۂ ترکانہ فسوں ساز آمد
رونقِ سبزہ و گل چوں نہ فزوں تر گردد | پئے گلگشتِ چمن سرو سرافراز آمد
در رہِ عشق بدایت بہ نہایت نیکو است | پائے انجام ہماں بہ کہ در آغاز آمد
نصرت و فتح مبارک بہ شہِ "عثماں" باد | ایں دعائے سحری از منِ جانباز آمد
از رزِ یدنسی اشارت بسوئے فتح بہار | مژدہ از نغمۂ دلکش بہ رگِ ساز آمد

کاملا از رہِ انصاف ہمی می گویم
کیفِ مستی بہ نوا زبادۂ شیراز آمد

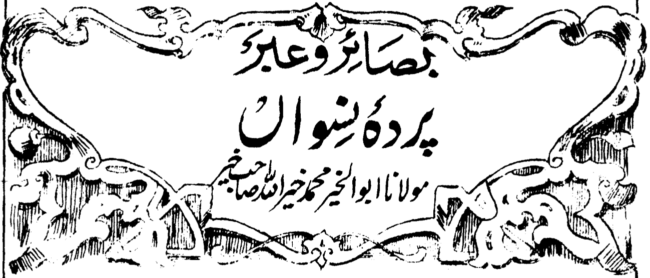
دیگر سلطنتوں کی طرح سلطنت آصفیہ میں بھی وقائع نگاری کا عہدہ قائم تھا۔ پرگنہ جات وغیرہ میں جو وقائع نگار مقرر کئے جاتے تھے ان کے تقرر کے حکم میں ان کے فرائض کی تشریح کر دی جاتی تھی اور بتایا جاتا تھا کہ جملہ حالات کی حقیقت تحصیل مالگزاری انفصال مقدمات وغیرہ کی اطلاع ماہوار دیا کرے۔ عامل کی کوئی بات دامے درمے۔ تغلب و تصرف کی پوشیدہ ترکیبے ابواب جرمانہ طرفداری وجوابداری وغیرہ جو عامل کی جانب سے رونما ہوں ان کو روز مرہ نوٹ کر کے ماہوار اس کی اطلاع راست بادشاہ کو دیا کرے۔

ان امور کی پابندی کے لئے بوقت تقرر مچلکہ بھی لیا جاتا تھا۔ اس مچلکہ کے بعد جو گویا ضمانت نامہ ہوتا تھا ان کو تقرر کے احکام عطا کئے جاتے تھے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے دربار مغلیہ (دہلی) کے حالات اخبار "دربار معلے" کے نام سے آیا کرتے تھے وقائع نگاری کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے آئندہ کبھی اس کے متعلق مفصل طور پر لکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

(ختم شد)





انسان اور حیوان میں جو امور مابہ الامتیاز ہیں ان کے منجملہ ایک "شرم و غیرت" بھی ہے، جس کا انسانی تمدن پر بہت احسان رہا ہے۔ اور یہی جذبات کے اعتدال کی کفیل و دکیل بھی ہے۔

دنیا میں اسباب کا نتائج کے ساتھ ایک غیر منفک تعلق رہا ہے، جیسے نتائج سے بچنا ہو اسے اسباب سے کوسوں دور رہنا پڑتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے ہیجانِ شہوات، وفورِ امیال و لذات، اور ذرائع افراط جذبات سے اپنے فرزندوں کو محترز و برکنار رہنے کی ہدایت دی ہے۔ اس کے اسی اعتدالی انتظامات میں سے ایک پردۂ نسواں بھی ہے۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ امیال و جذبات کے فوّارے کے منافذ کو جس قدر تنگ رکھا جائے، جس قدر بندش اور روک اس پر ہوگی وہ اسی قدر بلند اڑے گا بھی۔ پھر اسی روک کی مناسبت سے اسکی قوت بھی دوبالا ہوا کرے گی۔ اور جو عمل اسکے خلاف ہوگا وہ مزیلِ قوت ہوگا۔ اسلامی پردہ کی اہمیت اسی علت و مصلحت پر مبنی ہے۔ ان بندشوں کو ڈھیلا کرنے میں لذت کی فراوانی و لطف اندوزی ضرور مضمر ہے۔ مگر جس خزانہ سے ایک مدت مدید تک بانتظام استفادہ ہو سکتا ہو اس کا اسراف بہت قلیل عرصہ میں حرمان نصیب لذت کرنے کے علاوہ، مفقر توالد و تناسل ہوکر، خانہ برانداز تمدن ہو جاتا ہے۔ پس عالم انسانیت پر اس کا جو اثر پڑنے والا ہے اسی کی روک تھام بارگاہ اسلام کے پیش نظر رہتی آئی ہے۔

اسی لئے قرآن حکیم نے اپنی تعلیمات میں اسکا ایک واضح باب رکھا ہے۔ ارشاد ہے قل للمومنین یغضوا من ابصارہم ویحفظوا فروجہم ذالک ازکی لہم۔ "مومنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی آنکھیں (نامحرم عورتوں سے) بند رکھیں اور اپنی شرمگاہوں (عصمت) کی حفاظت کریں کہ یہ ان کے لئے بہت پاکیزگی کا موجب ہے۔" یہ آپ کا خیال یا میری رائے، کسی حکیم کا فلسفہ یا دانشمند کا مشورہ نہیں۔ بلکہ حضرت آفریدگار کا ایک مبنی بر مصلحت حکم ہے۔ اور اسی (جل جلالہٗ و عم نوالہٗ) کو ہمارے نفع و نقصان کا صحیح اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ غرض اس حکیم مطلق کا ارشاد و ہدایت بنیاد یہ ہے کہ نامحرم عورتیں جب ہمارے سامنے آجائیں تو ہم آنکھیں بند یا نیچی کرلیں، یعنی ان غیر عورتوں پر نظر نہ ڈالیں، ان کو گھورنا یا دیکھنا، ان کی دید سے لذت گیر، ان کے جمال جہان آرا سے لطف اندوز، اور نظارۂ حسن سے محظوظ ہونا، ان سب کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ آپ کا قانون اور ضابطہ اور یہ آپ کا دستور و مجوزہ الٰہی قاعدۂ حیات ہے۔

کیا اس کا مقابلہ آپ دوسری قوموں کے طریق زندگی و طرز معاشرت سے فرمائیں گے؟ جہاں یہ جملہ لطف اندوزیاں جائز اور ان کی سماجی زندگی میں رائج بلکہ ان کی سوسائٹی کے لوازمات بنی ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ اب کس کے ہو کے رہیں گے؟ اپنے خدا اور رسول کے یا اغیار کے؟ طور و طریقہ اسلام والوں کا محبوب خاطر ہے یا غیر مسلموں کا؟ کل اپنا حشر مسلمانوں کے ساتھ کرانا منظور ہے یا غیروں کے ساتھ؟ کیا آپ اغیار کے رسم و رواج، طور اور طریقوں کو اپنے الٰہی ضابطہ اور منزل من اللہ قانون پر ترجیح دیں گے؟ کیا آپ کی دینی حمیت، قومی غزت اس کو گوارا کرے گی؟ آیت قرآن کی، حکم خدا کا، اور مضمون بھی بہت صاف ہے۔ پھر کیا کسی تاویل کی گنجائش، گفت و شنید کا موقع اس میں ہو سکتا ہے؟

ہاں! ذرا اسی کے پہلو بہ پہلو کچھ اور بھی سن رکھئے۔ وقل للمومنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الخ۔ وہ حکم مردوں کے لئے تھا تو یہ عورتوں کے واسطے ہے کہ "وہ بھی غیر مردوں کو نہ دیکھیں، اپنی عصمت کی حفاظت کریں اپنی زیب و زینت، آرائش، بناؤ سنگھار کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں۔

حکم کس قدر صاف صاف اور ہدایات کس درجہ واضح ہیں کہ نہ مرد عورتوں کو دیکھیں نہ عورتیں مردوں کو۔ ایک دوسرے کا کہیں سامنا ہو جائے تو آنکھیں بند یا نیچی کرلیں۔ یہ کیسی عمیق و وسیع خلیج ہے جو جذبات فریقین کے مابین حائل ہو کر محافظت کی ضامن بن گئی؟ کیا آپ کو اپنے مالک و خالق کا یہ انتظام پسند نہیں؟ کیا اس میں آپ اغیار کی دیکھا دیکھی کوئی ترمیم یا تغیر کرنا چاہتے ہیں؟ پھر یہ کیا غضب ہے کہ مسلمان عورتیں بے کھٹکے میلوں اور مجامع میں چلی جائیں؟ حکم قضا شیم "یغضوا" "و یغضضن" کی صریحاً خلاف ورزی ہو۔ مرد اپنی مسامحت یا اجازت سے ان کے معین و شریک جرم ہوں۔ مشہور ہے آدمی، آدمی کا تماشا ہے۔ بجز ایک دوسرے کی دید کے وہاں دلچسپی ہی کیا ہو سکتی ہے؟ تاویل کے لئے بہت پہلو نکل جائیں گے مگر دل پر ہاتھ رکھکر کوئی کہے تو خدا لگتی، اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے؟

جریر ابن عبد اللہ بجلی نے حضور صلعم سے اچانک کسی غیر عورت پر نظر پڑ جانے کی نسبت عرض کیا تو ارشاد ہوا کہ ایسے موقع پر نظر کو پھیر لیا جائے (احمد و مسلم وغیرہ) زمانہ حضور رسالت پناہ کا ہے، نظر صحابی رضؓ کی، اس پر یہ شدت اور یہ قید و بند ہے۔ اس کے سامنے زمانہ حال کو لائیے۔ ہماری نظروں کو اس صحابی رضی اللہ عنہ کی نظر کے مقابلہ میں پیش نظر کر کے اندازہ فرمائیے کہ عورتوں اور مردوں کی نظروں کی نسبت اس زمانہ میں کیا حکم صادر ہونا چاہئیے؟

ایک مرتبہ اس مصلح کونین و سرور خافقینؐ نے ہدایت فرمائی۔ خبردار راستوں پر بیٹھنے سے بچو! خدام نے عرض کیا کہ ضرورتوں کے لحاظ سے ایسا بیٹھنا ناگزیر ہے، ارشاد ہوا جب تم برسر راہ (بازاروں میں) بیٹھنا ہی چاہتے ہو تو راستہ کا حق ادا کرو، عرض کیا گیا راستہ کا حق کیا ہے، تو فرمایا۔ نظر کا بند کرنا امر بالمعروف وغیرہ (بخاری)

امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سے سردار کونین نے ارشاد فرمایا۔ علیؓ! پہلی نظر کے بعد دوسری نظر نہ کرنا، کیونکہ پہلی نظر (جو اچانک اور بے اختیار ہوتی ہے وہ تو) تمہارے لئے (معاف) ہے مگر دوسری تمہارے لئے معاف نہیں (ابوداؤد و ترمذی) اللہ اللہ! کوئی ہے؟ جو اس مصدر ولایتؓ کی طہارت نظر سے ہمسری کا دعوے کرسکے۔ ہے کوئی؟ جو اس امام المشارق والمغاربؓ سے برابری کا دم بھر سکے۔ جب اس سرکار امامت پناہ کو

دربار رسالت پناہؐ سے اس طرح خطاب ہو رہا ہے تو کون ہے وہ جو کسی غیر عورت پر نظر ڈالنے میں اپنی نظر کی پاکی کو حجت بنائے؟ کس کا مونہہ ہے جو اس کو اپنے واسطے جائز کرے؟

حدیث نبویؐ اعلان فرمارہی ہے۔ زناءالعین النظر الخ آنکھ کا زنا غیر عورت کو دیکھنا، کانوں کا سننا، زبان کا بات کرنا، ہاتھ کا پکڑنا، پانوں کا چلنا ہے وغیرہ (احمد، بخاری، ابوداؤد) ایک امتی پر ان الفاظ کا کس قدر اثر ہونا چاہیئے؟ کوئی ان امور میں مبتلا ہوکر کس منہ سے، کس بناء پر خود کو مستثنےٰ بنالینے کی جرأت کرسکتا ہے؟ اس رازدان فطرت بشریہ (صلعم) کی اس حکمت نوازی کا کیا آپ خود کوئی اندازہ نہیں فرماسکتے؟

حضورؐ نے فرمایا۔ نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک زہر میں بجھا ہوا تیر ہے (طبرانی) کون ہے؟ جو اس کے خلاف زبان ہلاسکے؟ دم مارنے کی جرأت کرسکے؟

ایک دن عبداللہ ابن ام مکتوم ایک نابینا صحابیؓ در دولت پر حاضر ہوئے دولت سرائے نبوی میں ہم مسلمانوں کی دو مائیں ام سلمیٰؓ اور میمونہؓ تشریف فرما تھیں۔ حضورؐ نے ان دونوں کو پردہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ ام المومنین ام سلمیٰؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہؐ یہ تو اندھے ہیں ہم کو دیکھ نہیں سکتے، ارشاد ہوا، کیا تم دونوں بھی اندھی ہو جو ان کو دیکھ نہیں سکتیں؟ یہ دونوں جس طرح ہماری مائیں ہیں اسی طرح ان نابینا صحابی کی بھی مائیں تھیں۔ یہ ماں ہونے کا رشتہ کس نے قائم کیا؟ خود خداوند جل وعلیٰ نے "وازواجہ امہاتہم"

پھر یہ ماں بیٹے میں پردہ کیسا؟ عبداللہؓ ایک مقبول صحابی ہیں جنھیں بعض اوقات مدینہ میں سرکار (صلعم) کی غیر حاضری میں نیابت کی عزت بھی حاصل ہوچکی ہے۔ ادھر ان دونوں امہات المومنین کے تقدس وطہارت کا احصاء واحتوار کن الفاظ میں اور کس طرح کیا جائے؟ خود خدائے کریم نے اپنے نبی کریم کی ان گھر والیوں کی شان میں و یطہرکم تطہیرا فرمایا ہے۔ پھر ان ماں بیٹوں کے اس امتیاز واختصاص کے باوجود طرز تعلیم نبوی کی اس حد کو کیا کہا جائے؟ احتیاط کے اس درجہ اور سبق کے اس طریقہ سے ہم اپنے واسطے کیا کیا نتائج اخذ کریں؟ اس کے موقع ومحل کے اعتبار سے بھی صورت حال کی اہمیت اپنے انتہائی درجہ پر پہونچ جاتی ہے کہ ان ماں بیٹوں کے درمیان شہنشاہ کون ومکان صلعم خود موجود ہیں۔

یہ ابن ام مکتوم تو نابینا ہیں ہی۔ ان کی نظر سے متعلق تو کوئی بحث ہو ہی نہیں سکتی۔ جس نظر کو پس پردہ ہونے کی ہدایت فرمائی گئی ہے وہ کسی مرد کی نہیں عورتوں کی ہے۔ ازواج مطہرات کی ہے، امہات المومنین کی ہے۔ ان کی نظروں کو پابند

رباعیات

ازمولوی محمد محی الدین حسین صاحب ہلال اکبری تلگندوی

ہر آئینہ میں عکس اسی کا دیکھا
کیونکر نہ خودی ہو بیخودی کے صدقے
ظلمت میں بھی اک نور کا جلوا دیکھا
بند آنکھ ہوئی خود کا تماشا دیکھا

دیگر

عادی ہوں میں اللہ خطا کوشی کا
عصیاں کی سیاہی مری دل سے دھودے
خوگر ہوں میں احسان فراموشی کا
ہاں واسطہ کعبہ کی سیہ پوشی کا

فرمایا جارہا ہے، جن کی، ہماری ماں بہنیں، بہو بیٹیاں خاک پا بھی ہو جائیں تو عزت و شرف کے انتہائی درجے نصیب ہو جائیں۔

پھر ہے کوئی؟ جو اپنی عورتوں کی نظر کو مقابلہ میں لاکر کوئی امتیازی درجہ انھیں دے سکے؟ ہے کوئی جو اس عملی تعلیم کے خلاف کوئی تاویل وتعبیر کرسکے؟ تعلیم نبوت کی اس شدت اور ہمارے پردہ کی موجودہ حالت کو پیش نظر کرکے خود ہی تصفیہ فرمایئے کہ قرآن وحدیث کتاب وسنت کی ان عملی مثالوں اور پاک نمونوں کے خلاف ہم یہ آج کل کیا کئے جارہے ہیں؟

حدیث میں ارشاد ہوا ہے المرأۃ عورۃ (ترمذی) عورت کا تمام جسم عورت ہے لغت میں عورۃ، مرد کے جسم مابین السرۃ الی الرکبۃ (ناف سے گھٹنوں تک) کو کہتے ہیں جس کا چھپانا فرض ہے۔ چونکہ عورت کو تالو سے تلوے تک غیروں سے پوشیدہ رہنے کا حکم ہے اس واسطے مجازاً عورت کا نام ہی عورت ہوگیا۔

روضہ میں مذکور ہے ان جمیع بدن المراۃ عورۃ حتی الوجہ والکف مطلقاً یعنی عورت کا تمام بدن حتیٰ کہ چہرہ اور کف دست بھی پوشیدنی ہے۔ امام مالک وشافعی کے ہاں مجوز ہے، وبدن الحرۃ جمیعہ عورۃ (خفاج) یعنی عورت کا تمام بدن واجب الستر وپوشیدنی ہے۔ حنبلی مذہب میں عورت کو چہرہ اور دونوں پنجوں کا چھپانا لازم ہے۔ وہما، ای الکفا والوجہ عورۃ خارج الصلاۃ باعتبار النظر کبقیۃ بدنہا لحدیث المراۃ عورۃ (کشاف القناع) عند الاحناف اگر شہوت کا خوف ہو، یا شہوت وعدم شہوت دونوں حالتیں مشتبہ ہوں، یعنی کوئی فیصلہ اس مرد کی نگاہ کے بآمین نہ کیا جاسکتا ہو تو ایسے مرد کا کسی عورت کے چہرہ کی طرف نظر کرنا ممنوع ہے (ردالمختار کتاب الحظر والاباحۃ) البتہ علماء کرام نے یہ طے فرمایا ہے کہ کسی ضرورت سے عورت کے چہرہ اور کف دست کو دیکھا جاسکتا ہے۔ (جیسے حکیم کا نبض دیکھنا وغیرہ)۔ اس صورتی پردہ کے علاوہ صوتی پردہ کا حکم بھی آیا ہے۔ صوت المرأۃ عورۃ علی الراجح۔ عورت کی آواز علی الاغلب پوشیدنی ہے (ردالمختار جلد خامس کتاب الحظر والاباحۃ)۔ امام احمد حنبل کے ہاں عورت کی آواز سے لذت لینا اگرچہ وہ قرأت قرآن ہی کیوں نہ ہو حرام ہے۔ خلاصہ یہ کہ چاروں مذاہب میں مرد کا عورت کو بلاضرورت دیکھنا جائز نہیں۔

اسی ردالمختار میں محکوم ہے لاینبغی للمرأۃ الصالحۃ ان تنظر الیہا المرأۃ الفاجرۃ۔ ایک شریف بی بی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بدکار عورت کے سامنے ہو۔ یعنی شریف بی بیوں پر بازاری عورتوں سے بھی پردہ لازم ہے۔ اس کی علت اور وجہ یہ بیان فرمائی گئی ہے "لانہا تصفہا عند الرجال" کیونکہ وہ ان شریف

بی بیوں کے حسن و جمال کے تذکرے غیروں سے کرے گی۔ یہ حرکت مسلمان شریف بیویوں سے بھی ممکن ہے کہ وہ غیر عورتوں کے حسن و جمال کی حکایت اپنے شوہر اور عزیزوں سے کریں اسی واسطے ان کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ غیر عورتوں کا ذکر اپنے مردوں کے سامنے نہ کریں۔ چونکہ غیر مسلمہ عورتیں محکوم نہیں ہو سکتیں اس واسطے ان سے پردہ ہی کرنے کا حکم ہے۔ اس کا مقصد بھی وہی ظاہر ہو رہا ہے جس کو (فیطمع الذی فی قلبہ مرض) میں واضح فرمایا گیا ہے۔ جو نگاہ اور نیت کی پاکی کا انتہائی اہتمام ہے۔

اسی سلسلہ میں تصریح فرمائی گئی ہے کہ عنین و مخنث و مجبوب و ممسوح سے بھی پردہ ضروری ہے۔ بخاری میں ام المومنین صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک مخنث در دولت میں آیا جایا کرتا تھا لوگ اس کو غیر اولی الاربہ یعنی (نامرد) شمار کیا کرتے تھے، ایک دن حضورؐ جو تشریف لائے تو وہ ایک عورت کے اوصاف یہاں بیان کر رہا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس کا آنا اور یہاں کے حالات سے بھی واقف ہونا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بالآخر اس کو ایک دن خارج ہی فرما دیا۔ (ماخوذ از تفاسیر خازن و قادری و موضح و حقانی وغیرہ)

مسئلہ کی اس نزاکت کو ملاحظہ فرمایا جائے۔ اور انصاف فرمایا جائے کہ غیر مرد و عورت کو ایک دوسرے کی نظر سے بچنے بچانے کا کیسا شدید انتظام فرمایا گیا ہے۔ اس قانون شرع کی ہر ایک دفعہ کس قدر سخت اور کس درجہ غور د خوض اور کن کن وجوہ و محرکات پر مبنی ہے؟ کیا ان تمام دفعات کا ابطال و تردید ہم اپنی رائے و خواہش سے کر سکیں گے؟ اگر بہ تقلید اغیار ہم نے حسب خواہش کوئی راستہ اپنی زندگی و معاشرت کا بنا ہی لیا تو کیا وہ اسلامی راستہ ہوگا؟

کیا کسی تابع قانون فرد، یا جماعت کو دنیا کے کسی ملک میں ایسی خانہ برباد آزادی حاصل رہی ہے؟ دنیا کے قانون میں ترمیم یا تغیر کرنے کے لئے پھر مجلس وضع قوانین ہی کے انعقاد کی ضرورت ہے اور صرف وہی مجلس ایسی جرات کی مجاز ہے اس مقررہ طریقہ کے سوا ہر تدبیر کو محض بے نتیجہ اور مضحکہ باور کیا گیا ہے تو خداے قدوس کے بنائے ہوئے اٹل، قطعی اور ناقابل تبدیل قانون کو اس کے چند ناعاقبت اندیش پیروؤں کا موم کی ناک کی طرح حسب مرضی موڑ لینا، آسان سمجھ لینا اور اپنے ساتھ اپنے چند ناواقف مذہب بھائیوں کی ذہنیت کو بدل دینے کی ٹھان لینا کیا خسر الدنیا والآخرہ نہیں ہے؟

مسلمانو! وہ تمہاری موروثی غیرت کہاں گئی؟ تمہارے اسلاف کس وضع و شان کے تھے؟ کیا ان کا وہ خون اب تمہاری رگوں میں باقی نہیں رہا؟ اس شرم و حیا کے مادہ کو تم نے یورپ کے کس ناپاک نالہ میں بہا دیا؟ آج یورپ جس حماقت و نادانی سے توبہ کر رہا ہے، اور الاماں! الاماں پکارتے ہوئے آئے دن نت نئی تجویزیں اس نکبت و ذلت اس بربادی اور تمدنی خواری سے بچنے کی کر رہا ہے، کیا تمہاری عزت و عافیت ان کی اسی غلطی اور اندھی تقلید میں مضمر ہے؟ وہ تو آج اسلامی شرم و حیا کی برکت اور مخلوط تمدن کی نحوست کے معترف ہوتے جا رہے ہیں اور اپنی غلطی کے اس گڑھے سے نکلنے کی حکمت عملی و تجویز میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر آپ کو اپنی نظر و بصر کی داد دیتے ہوئے اپنے شرف و عظمت کو اسی گڑھے میں گر کر تلاش کرنے کی سوجھی ہے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

نظام سرکار کا امتیاز

مولانا خواجہ حسن نظامی

آج کل دنیا میں اسلامی حکومتیں خدا کے فضل سے ترقی کناں نظر آتی ہیں۔ ترکی، ایران، مصر، عراق، حجاز، افغانستان وغیرہ کی نسبت جو خبریں شائع ہوتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مذکورہ حکومتیں زندگی کے ہر حصہ میں ترقی کر رہی ہیں مگر ترکی اور ایران کی نسبت مسلمانان عالم کو تشویش ہے کہ یہ دونوں اسلام کی عظمت سے بے نیاز ہوتی جاتی ہیں۔ افغانستان البتہ اسلامیت میں بہت زیادہ ترقی کر رہا ہے اور نئی ترقیاں بھی اسکے پیش نظر ہیں۔ حجاز اور عراق اور مصر کی حالت میں کوئی بے اطمینانی کی بات نہیں ہے تاہم وہ افغانستان کی طرح مضبوط اور آزاد بھی نہیں معلوم ہوتے۔

ان تمام ممالک پر اسلامی قومیت کی نظر سے توجہ ہو تو ان سب کی مجموعی حالت خود ان کے لئے مفید ہی معلوم ہوگی البتہ ان میں سے کوئی بھی ایسی حکومت نہیں ہے جس سے بیرونی مسلمانوں کو کسی قسم کا مفاد حاصل ہوتا ہو۔

یہ امتیاز اور خصوصیت صرف نظام سرکار کو حاصل ہے۔ اگرچہ وہ حکومت ایک بیرونی سلطنت کے اثر میں ہے لیکن مفاد عامہ کے لحاظ سے اس کو پوری آزادی حاصل ہے۔ یعنی وہ عربوں، ترکوں، افغانوں وغیرہ کو ازراہ اخوت اسلامی ضرورت کے اوقات میں مالی مدد دیتی ہے اور ممالک غیر کے اشخاص اور پبلک معاملات نظام سرکار سے فائدہ مند ہوتے رہتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمان اور نظام سرکار کی رعایا، اس اثر اور اقتدار کا اندازہ نہیں کر سکتی جو باہر کے ملکوں میں حیدرآباد کا ہے۔ میں نے افغانستان کے سفر میں اس اثر کا اندازہ کیا تھا کہ بادشاہ سے لیکر ادنیٰ آدمی تک سب حیدرآبادی فیاضی اور حیدرآبادی عظمت و فائدہ رسانی کے مداح و معترف تھے۔

یہ معمولی امتیاز نہیں ہے بلکہ ایک زبردست اخلاقی اثر ہے جس سے مسلمان حکومتیں ہی محروم نہیں ہیں بلکہ کسی غیر مسلم حکومت کو بھی مسلمانان عالم کے دلوں میں یہ وقعت حاصل نہیں ہے جو نظام سرکار اور * اس کے فرمانروا کو حاصل ہے۔

اس امتیاز کا ایک سیاسی پہلو بھی قابل غور ہے کہ برٹش حکومت کو نظام سرکار کی دوستی و تعلق کی وجہ سے ایشیا اور افریقہ، یورپ اور امریکہ میں بہت کچھ تفوق حاصل ہے اور اسمیں مزید اضافہ ہو سکتا ہے اگر نظام سرکار سے اس کے تعلقات میں خوشگواری ترقی کرے۔

میں اس مختصر تحریر کے آخر میں نظام سرکار کی ہندو مسلمان رعایا، اور اراکین حکومت سے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ نظام سرکار کا مذکورہ امتیاز اور اثر محض فخر کرنے ہی کے قابل نہیں ہے بلکہ اس سے اپنے ملک کے سیاسی اور تجارتی اور وہ فائدہ بھی حاصل کرنے چاہئیں جو اس امتیاز کی وجہ سے حاصل ہو سکیں۔

دنیا کی سیاست آج کل وبائے انقلاب میں مبتلا ہے اور ان قدرتی تبدیلیوں میں جہاں انسانوں کیلئے نقصانات پوشیدہ ہیں وہیں بہت سے فائدے بھی مضمر ہیں اور ان فائدوں کا حاصل کرنا غور کرنیکے بعد انسانی سعی پر منحصر ہے۔ لہذا نظام سرکار سے محبت کرنیوالے اور اس سرکار کو اسلامی تمدن اور اسلامی کلچر اور اسلامی سیاست کا ایک یادگاری نمونہ سمجھنے والے نظام سرکار کے مذکورہ امتیاز سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کریں اور وہ جب ہی ہوگا کہ ہم میں سے ہر ایک ملکی و قومی مفاد کو ذاتی مفاد سے مقدم رکھے۔

ٹلیوژن

مسٹر سید محمد علی خاں بی، اے (عثمانیہ)
اے، آر، سی، یس۔ بی، یس، سی "آنرس" (لندن)
پروفیسر شعبۂ طبیعیات، کلیہ جامعۂ عثمانیہ

الف لیلہ اور طلسم ہوشربا کی وہ حیرت انگیز داستانیں، جن کو چند ہی دن کی بات ہے ناممکن الوقوع خیال کیا جاتا تھا اور جن کو ما فوق العادت سمجھ کر ردی اوراق سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی تھی، خدا کی شان، آج وہی روزمرہ واقعات بن کر دنیا کے سامنے آرہی ہیں۔ "کل کے گھوڑے" کے قصہ کو لوگ کل تک تعجب سے پڑھا کرتے تھے لیکن ہوائی جہاز آج ایک معمولی چیز خیال کیا جاتا ہے۔

الف لیلہ کے ایک قصہ میں ایسے بلور کا بھی ذکر ہے جس سے ہر شخص، کسی چیز کو خواہ وہ کتنی دور پر ہو دیکھ سکتا تھا، لیکن وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے کہ قدیم قصہ گو کے تخیل کی یہ بلند پروازی سائنس کی مدد سے حقیقت کا جامہ پہن کر گھر گھر رونما ہونے لگے۔

"ٹلیوژن" کا مفہوم موسلے اور بارٹن چاپل کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

"یہ ایک آلہ ہے جس کی مدد سے ہم کسی دور دراز مقام پر ہونے والے واقعات کو گھر بیٹھے اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ گویا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہیں" بالفاظ دیگر "ٹلیوژن" وہ ذریعہ ہے جس میں برقی ترسیلی طریقوں سے، دور کی قائم یا متحرک اشیاء کی تصویریں ہم کسی پردہ پر دیکھ سکتے ہیں۔

سنہ ۱۸۷۶ء میں بل (Bell) نے جب ٹلیفون کی ایجاد کی تو دنیائے سائنس اس تخیل سے متاثر ہونے لگی تھی کہ برق کے ذریعہ، آواز کی طرح روشنی بھی ترسیل ہونی چاہیئے۔ تقریباً نصف صدی تک اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کسی شخص کو بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر کار "مصداق جوئندہ یابندہ" اسکاٹلینڈ کے ایک باشندے جے ایل بیرڈ (J. L. Baird) کے سر اس ایجاد کا سہرا رہا جس کو بل، مارکونی (Marconi) اور اڈیسن (Edison) جیسی ممتاز ہستیوں کے زمرہ میں بجا طور پر شامل کیا جا سکتا ہے۔

اپریل سنہ ۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ بیرڈ نے بے حد دشواریوں کے باوجود، لاسلکی کی مدد سے لندن میں عوام الناس کے سامنے بعض معمولی اشیاء کے خاکوں کی ترسیل کا مظاہرہ کیا۔ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء میں جب اس زبردست موجد نے رائل انسٹیٹیوشن کے متعدد اراکین کے روبرو اس مظاہرہ کو دہرایا تو صحیح معنوں میں اسکو کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک کمرہ میں رکھی ہوئی اشیاء کی حقیقی تصویریں دوسرے کمرہ میں "ٹلیوژن" کے ذریعہ ان اراکین کو بتائی گئیں۔ دوسرے دن اخبار لندن "ٹائمز" نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ "گو اشیاء کی ترسیلی تصویریں شناخت کی جا سکتی تھیں، لیکن دھندلی اور غیر واضح تھیں"

جولائی سنہ ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر رسل (Russel) نے رسالۂ "نیچر" میں ایک مختصر سا مضمون ان چیزوں کے متعلق لکھا تھا جو اس نے "ٹلیوژن" سے دیکھی تھیں۔ وہ کہتا ہے "سر اور ہونٹوں کے حرکات کے ساتھ زندہ اشخاص کے چہرے بھی صاف طور پر نظر آتے تھے، حتیٰ کہ ایک شخص کا سگریٹ اور اس کا دھواں تک واضح طور پر نظر آتا تھا"۔ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء میں بیرڈ نے "ٹلیوژن" میں پائیں سرخ شعاعوں (Infra red rays) سے مدد لے کر ایسی اشیاء کا مظاہرہ کیا جو بالکل تاریکی میں رکھی گئی تھیں۔ اشیاء کی تصویریں جو اس وقت نظر آئیں گو آج کل کے سینما کی تصویروں کی طرح واضح اور روشن نہیں تھیں لیکن پہچانی جا سکتی تھیں۔

اپریل سنہ ۱۹۲۷ء میں جزیرہ برطانیہ کے باہر "ٹلیوژن" کا مظاہرہ کیا گیا۔ "بیرڈ ٹلیوژن نظام" کی مدد سے نیویارک اور واشنگٹن کے درمیان اشیاء کی تصویریں ترسیل کی گئیں۔ مارچ سنہ ۱۹۲۸ء میں بیرنگیریا (Berengaria) نامی جہاز کے آلۂ لاسلکی کا صدر کارکن اپنی لندن میں بیٹھی ہوئی معشوقہ کو اچھی طرح اسوقت دیکھ سکتا تھا جب کہ جہاز سمندر میں چل رہا تھا۔ اگست سنہ ۱۹۲۸ء میں اشیاء کی تصویریں طبعی رنگوں کے ساتھ ترسیل کی جانے لگیں، مثلاً ایک ٹوکری میں راسبری بھرے ہوئے تھے ان کا رنگ "ٹلیوژن" میں صاف طور پر سرخ نظر آتا تھا۔

اگست سنہ ۱۹۲۹ء میں "لندن فزیکل سوسائٹی" کی نمائش میں راقم الحروف کو "ٹلیوژن" کے مظاہرے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ایک شخص کنگھی ہاتھ میں لئے سنٹ ایڈمنڈ گلڈ انسٹیٹیوٹ میں اپنا سر ہلا رہا تھا۔ اس کے سر کی تصویر رائل کالج آف سائنس میں "ٹلیوژن" سے ترسیل کی گئی۔ تصویر کا ناپ تقریباً ۴" × ۳" کا تھا اور بیضوی شکل کے ایک شیشہ پر واضح طور پر نظر آتی تھی۔ ترسیلی آلات میں "شئے"، (جس کو آئندہ "شخص" سے تعبیر کیا جائے گا) کو طاقتور روشنی سے منور کرنے کے بعد ایک گردش کرنے والے قرص کے سامنے رکھا جاتا ہے، جس میں مربع نما چند (مثلاً ۳۰) سوراخوں کا سلسلہ اس طرح بنا ہوا ہوتا ہے کہ ان میں کا ہر ایک سوراخ اپنے بعد والے سوراخ کی بہ نسبت مرکز سے قریب تر ہوتا ہے یعنی سوراخوں سے جو منحنی (Curves) بنتے ہیں ان کی شکل ایک مسلسل مرغولہ (Spiral Shape) ہوتی ہے۔ ان سوراخوں کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ متحرک تصاویر کے ایک سلسلہ کو سلینیم یا کسی دوسرے ضیاء برقی خانہ (Photo electric cell) پر عائد کریں۔ اس طریقہ سے ہر تصویر اپنے ماقبل تصویر سے عرضی سمت میں کسی قدر ہٹ جاتی ہے، موٹر کے ذریعہ تیزی کے ساتھ گھومنے والے قرص کی وجہ سے، ضیاء برقی خانہ پر عمل کرنے والی روشنی میں متواتر رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خانہ کی مزاحمتی تبدیلیوں کی وجہ سے "شخص" کے مختلف حصوں سے منعکس ہونے والی روشنی کے متناسب، متغیر حدت کی رو خانہ سے جاری ہوتی ہے۔ رو کی ان حاصل تبدیلیوں کو وسعت دیکر ایک سادہ لاسلکی مرسل آلہ میں داخل کیا جاتا ہے، جہاں سے وہ بالآخر برقی امواج بن کر مرسل آلہ سے فضاء میں صوتی امواج کی طرح پھیل جاتی ہے۔ تحصیلی آلہ کے پاس ان موجوں کو شناخت کیا جاتا ہے اور زبردست ضماموں (Valves) کے ذریعہ وسعت پذیر ہو کر یہ اتنی طاقتور ہو جاتی ہیں کہ (جب "شخص" کے منور حصہ سے مرسل آلہ پر جب روشنی واقع ہوتی ہے تو) نیین گیس کی نلی کو منور کرنے لگتی ہیں۔ مرسل آلہ کے پاس جس قسم کا

سوراخ دار قرص گردش کرتا ہے اسی طرح کا ایک اور قرص ایک خاص رفتار سے (جس کا تعین مرسل آلہ کے قرص کی رفتار سے کیا جاتا ہے) تحصیلی آلہ کے پاس بھی گھمایا جاتا ہے۔ نیین گیسی نلی سے پیدا ہونے والی روشنی کے دھبے پردہ پر "شخص" کے منور حصہ کے متناظر (Corres-ponding) دکھائی دیتے ہیں، اور اس طرح "شخص" کی واضح اور قابل شناخت تصویر نظر آنے لگتی ہے۔

اوپر سیلنیم کے خانہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی عجیب خاصیت یہ ہے کہ یہ روشنی اور تاریکی کے علامات کو ظاہر کرتا ہے۔ کسی دَور میں اس کو رکھ کر اس پر اگر روشنی ڈالی جائے تو اس دور میں برقی رو دوڑنے لگتی ہے۔ اگر خانہ پر روشنی کی شعاعوں کو گرنے نہ دیا جائے تو رو بند ہو جاتی ہے، برقی رو کی مقدار اس روشنی کے متناسب ہوتی ہے جو سیلنیم کے خانہ پر واقع .... ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ عمل فوراً نہیں ہوتا یعنی روشنی کے واقع ہوتے ہی فوراً خانہ میں رو نہیں پیدا ہوتی بلکہ کچھ دقفہ کے بعد۔ اسی سست تعامل کی وجہ سے ایسے خانے "ٹیلیوژن" میں استعمال کئے جانے کے قابل نہیں ہوتے۔ آج کل جو ضیابار برقی خانے مستعمل ہوتے ہیں ان کا بھی وہی اصول ہے کہ روشنی کے وقوع سے رو پیدا ہوتی ہے، لیکن ان میں تعامل بیحد تیز ہوتا ہے۔ ایسے بہترین خانے جنرل الکٹرک کمپنی کے ساختہ ہوتے ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں، ایک "خلاء دار" (Vac) اور دوسرے "گیس بھرے" (Gasfilled) "ٹیلیوژن" کے اغراض کے لئے جہاں حساسیت بہت اہمیت رکھتی ہے، گیس بھرے ہوئے خانے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان میں ثانوی برقیوں (Secondary Electrons) کے پیدا ہونے کی وجہ سے اوّلی رَو (Poimary current.) وسعت پذیر ہوتی ہے جب کہ اوّلی برقیے گیس میں حرکت کرنے لگتے ہیں۔ منفی برقیرہ پر ایک حساس اور ہلکی دھات استعمال کی جاتی ہے، اور یہ پوٹاسیم، سوڈیم روبیڈیم میں سے کوئی ایک ہوتی ہے۔ ان میں آرگن گیس بھری جاتی ہے۔

نیین کی گیسی نلیوں کے متعلق اوپر ذکر آچکا ہے کہ تحصیلی سرے پر کسی قسم کی تنویر کی ضرورت ہوتی ہے جو مرسل آلہ کی رو کی تبدیلیوں کو نہایت جلد جلد بتا سکے نیین چراغ یا نیین گیسی نلی اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ یہاں اس کا نظریہ بیان کرنا غیر ضروری ہے، صرف اتنا کہنا البتہ کافی ہوگا کہ کرۂ ہوائی سے نیین گیس حاصل کی جاتی ہے، اور اس کو ایک نلی میں بھر دیا جاتا ہے۔ اس کے برقیروں (Electrodes.) کے درمیان مناسب تفاوتِ قوہ کے تحت برقی رو دوڑائی جاتی ہے جس سے نیین کے جواہر (Atoms.) گرم ہو کر سرخی مائل نارنجی رنگ سے دہکنے لگتے ہیں۔ اور یہی اس چراغ کی خصوصیت ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ "ٹیلیوژن" میں فی زمانہ جو چراغ استعمال کئے جاتے ہیں ان کے منفی برقیرے نکل کی مستطیلی تختیوں کے بنائے جاتے ہیں اور مثبت برقیرے ایک چھوٹی دھاتی سلاخ کے ہوتے ہیں۔ یہ چراغ ایک ثانیہ میں دس لاکھ مرتبہ بجھتا اور روشن ہو سکتا ہے۔

"ٹیلیوژن" کے ابتدائی تجربوں میں بیرڈ کو زیر تجربہ اشیاء پر تنویری حدت کے گھٹانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ ایک بڑی دقت یہ بھی تھی کہ گردشی قرص کے سامنے بیٹھنے والے شخص کو طاقتور روشنی کی وجہ سے بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی تھی۔ بیرڈ نے یہ سوچا کہ مرئی روشنی کے عوض غیر مرئی روشنی استعمال کی جائے تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ غیر مرئی بالائے بنفشی (Ultra violet.) شعاعیں پہلے استعمال کی گئیں لیکن بیٹھنے والے شخص کے لئے یہ نہایت خطرناک تھیں۔ اس کے بعد طیف (Spectrum) کے دوسرے سرے یعنی بالائی سرخ شعاعوں کی طرف توجہ کی گئی۔ یہ شعاعیں بیٹھنے والے شخص کے لئے اتنی زیادہ مضر اور خطرناک نہیں ہوتیں، لیکن معمولی ضیابار برقی خانوں پر ان کا اثر بہت ضعیف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل نہایت حساس خانے استعمال کئے جاتے ہیں۔ روشنی کے اکثر مبدؤں سے کافی مقدار میں بالائی سرخ شعاعیں خارج ہوتی ہیں۔ ان کو روشنی کے راستہ میں آبنوس (Ebonite) کی تختی رکھکر علیٰحدہ کیا جا سکتا ہے اور مرسل آلہ کے پاس بالکل تاریکی میں ایک شخص بیٹھ کر ترسیل کا مقصد پورا کر سکتا ہے۔

ان شعاعوں کے عملی اطلاق کے دائرہ کو بعض مفید تجارتی اغراض تک وسیع کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ بالائی سرخ شعاعیں کُہر وغیرہ میں سے گزر جا سکتی ہیں اس وجہ سے نہ صرف تاریکی میں ان کو استعمال کیا جا سکتا ہے بلکہ کُہر کی وجہ سے جو اشیاء بالکل نظر نہیں آسکتیں ان کو بھی ان شعاعوں کی مدد سے صاف اور واضح طور پر دیکھنا ممکن ہے۔ جہاز رانی میں (ہوا اور پانی میں) آئندہ بالائی سرخ شعاعوں کی مدد سے بڑی ترقی کرنے کی گنجائش ہے۔ جنگ کے زمانہ میں ان شعاعوں کی مدد سے خود کو دکھلائے بغیر غنیم کو دیکھ لینا معمولی بات ہوگی۔ بہر حال یہ ایک علیٰحدہ مضمون ہے جس کا عنوان "ناکٹو وژن" ہو جاتا ہے، اور یہاں اس سے بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

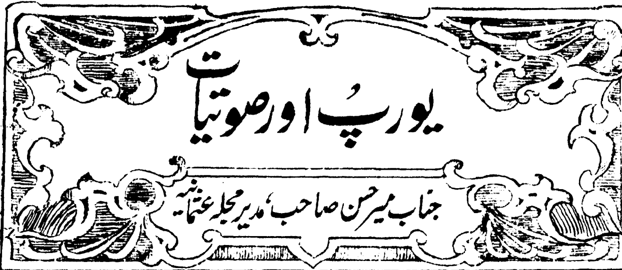
یہ سچ ہے کہ اس بیسویں صدی کے تینتیسویں برس میں، ہم اپنے اجسام کو فضاء میں نور کی رفتار سے دنیا کے مختلف مرکزوں تک بھیج نہیں سکتے لیکن ہماری آواز، ہماری شکلیں تو بھیجی جا سکتی ہیں، اور دور دراز فاصلوں پر آناً فاناً ہم سنائی دے سکتے اور نظر آسکتے ہیں۔ آواز، نظر اور بو کو جہاں چاہیں وہاں بھیجنے کی قوت حاصل کر لینے کے بعد صرف مادی جسم کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک اس سرعت کے ساتھ بھیجنے کا مسئلہ اتنا ضروری نہیں رہتا کہ اس کا حل ہوتا نہ ہونا

یکساں ہے۔ لاسلکی پیام رسانی کے ماہر کے لئے آواز کی ترسیل بالکل معمولی سی چیز ہے، ایک عام شخص لاسلکی کے نظریہ سے قطعاً ناواقف سہی لیکن لاسلکی آلات سے مستفید تو ضرور ہو سکتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی تقریباً ربع آبادی اب یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ دور دراز فاصلوں پر کی اشیاء کو گھر بیٹھے دیکھنا ممکن ہے۔ اور اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہر خاص و عام کے ہاتھ میں یہ آلے نظر نہ آنے لگیں۔ البتہ بڑے پیمانہ پر دلچسپ مناظر مثلاً فٹبال کا مقابلہ، یا کوئی عام تقریب یا بولنے والے سینما وغیرہ کی ترسیل ترسیلی ذرائع کی کم یابی کی وجہ سے ہنوز دشوار ہے۔ لیکن یہ دشواریاں عارضی ہیں۔ رہا بُو کی ترسیل کا مسئلہ، یہ صحیح ہے کہ ابھی تک یہ ایک کٹھن مرحلہ ہے، لیکن سائنس کی آئے دن کی ترقیوں کو دیکھتے ہوئے ہم یہ تصور کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ گو اسوقت یہ ایک بالکل مضحکہ انگیز اور ناممکن امر معلوم ہوتا ہے مگر وہ دن آنیوالا ہے کہ یہ مسئلہ بھی حل ہو کر رہے گا۔

اعتذار

ہمیں افسوس ہے کہ جو مضامین بعد از وقت وصول ہوئے وہ اس سالنامہ میں جگہ نہ پاسکے،

مہتمم رہبر دکن



زبان کا وجود دوگانہ ہے۔ ایک آواز اور دوسرے اس کا مفہوم۔ صوتیات کا تعلق آواز سے ہے۔ آواز سے یہاں ہماری مراد نطقی آواز ہے۔ دوسری قسم کی اصوات صوتیات کے مبحث سے خارج ہیں۔

اصوات کی ابتداء، ارتقاء و تغیرات، اور مختلف زبانوں کے لب و لہجہ سے متعلق تحقیق و تفتیش کرنا مختلف السنہ کے لئے حروف تہجی کی تیاری، اور مادری زبان اور غیر زبان کی تعلیم و تحصیل میں گوناگوں آسانیاں پیدا کرنا، اور اسی قسم کے دوسرے متعدد مسائل صوتیات نظری و عملی سے متعلق ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں یہ ممکن نہیں کہ ہم صوتیات کے جملہ فوائد بیان کریں۔ ذیل میں صوتی رسم الخط، اس کے اصول و ضوابط، اور صوتیاتی طریقۂ تعلیم اور اس کے فوائد پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

کسی زبان کی تحریری شکل اس کے تلفظ اور اصوات کے اتار چڑھاؤ کی وفادار نمائندگی کرے تو اس کو صوتیاتی رسم الخط کہتے ہیں۔

اس رسم الخط کے فائدے متعدد ہیں۔ اس کی مدد سے، مادری زبان، اور غیر زبان کے سیکھنے اور سکھانے میں بہت کچھ سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے یورپ کی علمی و عملی فضاؤں میں صوتیات سے جو کام لئے گئے ان پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جن لوگوں نے السنہ کی تحصیل میں صوتیاتی رسم الخط سے استمداد کی، ان کا تلفظ بہ نسبت ان طلبہ السنہ کے جنہوں نے عام مروجہ ہجا کی مدد سے زبان حاصل کی ہے، زیادہ صاف و نمایاں اور قرین صحت ہوتا ہے۔

صوتی رسم الخط کی مدد سے بغیر استاد کے بھی غیر زبان کی تحصیل نہ صرف ممکن بلکہ آسان ہوگئی ہے کیونکہ اسکے ذریعہ ہر زبان کے اصوات کمال صحت کیساتھ، نہایت آسانی سے قلمبند ہو سکتے ہیں۔ صوتیاتی رسم الخط کی مدد سے ان زبانوں کو نہایت آسانی سے تحریری شکل دی جاتی ہے جو تا حال نہ لکھی گئی ہوں۔ اسی طرح مختلف زبانوں اور بولیوں پر لسانی تحقیقات کرنیوالوں کیلئے اسکا وجود نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

مادری زبان کی تعلیم و تحصیل میں اس رسم الخط کا استعمال نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ عام ہجا کی مدد سے زبان کی تعلیم دینے میں ایک تو وقت زیادہ صرف ہوتا ہے دوسرے طلباء بالعموم ایک قسم کی بے لطفی محسوس کرتے ہیں، بر خلاف اس کے صوتیاتی رسم الخط کی مدد سے ایک طرف تو زبان آسان، سہل الحصول اور دلچسپ ہو جاتی ہے اور دوسری طرف پڑھنے پڑھانے میں وقت بھی زیادہ صرف نہیں ہوتا کیونکہ صوتی حروف تہجی پر ایک دفعہ عبور حاصل کرنے کے بعد طالب علم کافی آسانی اور روانی سے پڑھ سکتا ہے اور تلفظ کی فروگذاشت یا غلطی کا امکان نہیں رہتا، کیونکہ حروف اصوات کی کامل نمائندگی کرتے ہیں۔ جرمن زبان کے حروف تہجی کا ارتقاء بڑی حد تک صوتیاتی طریقہ پر ہوا۔ اسی لئے طلباء کو مختلف الفاظ کی انفرادی صوتی خصوصیات کی ذہن نشینی کی تکلیف گوارا کرنی نہیں پڑتی بر خلاف اس کے دنیا کی بہتری زبانوں کی طرح اردو کی ساخت صوتیاتی طریقہ پر نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اکثر الفاظ کے حروف اور اصوات میں ایک قسم کی بے آہنگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہم لکھتے تو ہیں "عنبر" اور "قنبر" اور پڑھتے ہیں "عمبر" "قمبر" جس کی وجہ سے بالخصوص ان لوگوں کے لئے جن کی مادری زبان اردو نہ ہو اس کی تحصیل مشکل ہو جاتی ہے۔

صوتیاتی حروف تہجی حسب ذیل طریقہ پر تجویز کئے جاتے ہیں :۔

اگر کسی زبان میں ایک سے زیادہ حروف ایسے ہوں جن کی آواز ایک ہی قسم کی ہو تو صوتی تحریر میں

اس خالص آواز کی نمائندگی کے لئے صرف ایک حرف کا انتخاب مناسب ہے۔ مثلاً ضبط، ظہور، زور اور ذات کے ابتدائی حروف کے اصوات کی نمائندگی کے لئے ض، ظ، ز اور ذ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے میں آسانی ہے۔ کسی خاص زبان کے لئے صوتی رسم الخط تجویز کرتے وقت صرف اسی کی لسانی اور صوتی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر ایسی معمولی اور غیر اہم اصوات کا پتہ چلانا چاہیئے، جن میں تھوڑا سا تغیر ہو جائے تو معنی اور مفہوم میں کسی قسم کے التباس کا امکان نہ ہو۔ ان کی نمائندگی کے لئے خاص خاص علامتیں اور حروف تجویز کرنے چاہئیں۔

جہاں تک ہو سکے مفرد آوازوں کو مفرد حروف سے ظاہر کرنا چاہیئے۔ صوتی علامتوں اور حروف کی تعداد جس قدر کم ہوگی، پڑھنے میں اسی قدر آسانی ہوگی۔

صوتی علامتوں کی کثرت اسی وقت مفید اور ناگزیر ہے، جب کسی زبان کے اصوات کی موسیقی، اتار چڑھاؤ، اور لب و لہجہ کے تنوع کا اظہار بہ التزام صحت منظور ہو۔

ماہرین صوتیات کا خیال ہے کہ انگریزی زبان کے حروف علت (a. e. i. o. u.) کا استعمال اطالوی زبان کے مطابق ہونا چاہیئے، یعنی ان کے اصوات انگریزی الفاظ (calm. get. machine. note. rule.) کے مطابق ہوں۔

جس زبان میں حروف علت کے اصوات میں ایک سے زیادہ قسم کا تنوع نہ ہو، صوتی علامتوں کا استعمال اصلی آوازوں کے لئے نہیں بلکہ تنوع کی نمائندگی کے لئے زیادہ مفید اور مناسب ثابت ہوا ہے۔

"ا" کی قسم کی ایک ہی آواز ہو (ہندی میں اس قسم کی دو آوازیں अ اور आ ہیں) تو صوتی رسم الخط میں اصل حرف یعنی 'ا' ہی کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ جب اس حرف کی اصلی آواز سے پڑھنے والے روشناس ہوں اور صوتی ضرورت کے لحاظ سے صرف ایک حرف کی ضرورت ہے تو خود اس کو بحال رکھنے میں آسانی ہے۔

اگر (ج) کی دو آوازیں ہوں، مثلاً ہندی کے ज اور ज़ تو ایک کو اصلی حرف یعنی ज اور دوسرے کو کسی اور علامت سے ظاہر کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ چنانچہ فرانسیسی زبان میں پہلی ज کی نمائندگی کے لئے وہی (ج) اور دوسری یعنی ज़ کے لئے (ژ) مستعمل ہے۔

اگر کسی زبان میں 'و' کی دو آوازیں ہوں۔ جیسے اردو میں 'و' اور ضمہ کی، تو ایک کو اصل 'و' اور دوسری کو کسی دوسری علامت مثلاً (ہ) سے ظاہر کرنا مناسب ہے۔

کسی لفظ میں دو ایسے حروف کا اجتماع ہو جن کی اصوات میں یکسانیت پائی جائے، تو دونوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ صوتیاتی حروف یا علامتوں کی ضرورت نہیں مثلاً لفظ 'اعیان' کے 'ا' اور 'ع' کی نمائندگی کے لئے (اگر 'ا' اور 'ع' کو ہم صوت فرض کر لیا جائے) صرف ایک صوتی علامت کفایت کرے گی۔

صوتیاتی رسم الخط دو قسم کا ہوتا ہے ایک حکمی (scientific) اور دوسرا معمولی۔ حکمی وہ جو السنہ کی حکمی تحقیقات کے لئے تیار کیا جائے، اس رسم الخط میں صوتیاتی علامتوں اور نشانیوں کی کثرت ہوتی ہے۔ کیونکہ لغات کی مختلف آوازوں اور اصوات کے معمولی سے معمولی تنوع اور خفیف سے خفیف اتار چڑھاؤ کو کامل صحت کے ساتھ ظاہر کرنے کے لئے متعدد صوتی نشانات اور حروف کا استعمال ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا رسم الخط ماہرین صوتیات و لسانیات کے لئے مختلف السنہ کی حکمی تحقیق و تفتیش کو بڑی حد تک آسان بنا دیتا ہے۔ اس پر کامل عبور حاصل کرنے اور ممکنہ صحت کے ساتھ پڑھنے اور لکھنے کے لئے کافی محنت و مہارت اور وقت درکار ہے۔

معمولی یا آسان قسم کا رسم الخط صرف عملی ضرورتوں کے لحاظ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی تیاری کے وقت صرف ایک زبان (جس کے لئے حروف تہجی تجویز کئے جا رہے ہوں) کی لسانی اور صوتی خصوصیتیں پیش نظر ہوتی ہیں۔ اسی لئے صوتیاتی علامتوں کی کثرت نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے حکمی تحقیقات کے لئے جو رسم الخط رواج پاتا ہے، اس کی تیاری کے وقت اس امر کی پوری پوری کوشش ہوتی ہے کہ تمام ممکنہ نطقی آوازوں (یعنی دنیا کی مختلف زبانوں کے الفاظ کا) کا اظہار ممکن ہو۔ اسی لئے یہ بڑی حد تک دقیق ہوتا ہے۔ معمولی یا آسان قسم کے رسم الخط کو عوام تھوڑی سی توجہ کے بعد نہایت آسانی اور روانی کے ساتھ پڑھ اور لکھ سکتے ہیں۔

(۳)

اساتذۂ صوتیات کا خیال ہے کہ کسی زبان کی تحصیل میں سب سے پہلے قدیم اور ادبی نہیں بلکہ روزمرہ کی زبان پر عبور حاصل کرنا زیادہ مفید اور ضروری ہے۔ صوتیاتی طریقہ پر تعلیم دینے والے علمائے السنہ اپنے متعلمین کو اولاً زبان کے صحیح تلفظ اور لب و لہجہ کے امتیازی خواص سے بوجوہ احسن روشناس کرا دیتے ہیں۔ غیر زبان کے تلفظ کی صحت کے متعلق کامل اطمینان حاصل کرنے کے لئے ابتداءً (عام مروجہ ہجا کے برخلاف) صوتیاتی حروف تہجی کا استعمال زیادہ مفید اور سہل ہے۔ قواعد کی تعلیم استخراجی اصول پر ہوتی ہے۔ یعنی دوران تعلیم میں جو خاص خاص فقرے، جملے اور ترکیبیں آتی ہیں ان سے مختلف نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اس کی باضابطہ تعلیم زبان پر کافی عبور حاصل ہو جانے کے بعد شروع کی جاتی ہے۔ کیونکہ زبان سے قواعد بنی ہے نہ کہ قواعد سے زبان، اور محض قواعد کے اصول ازبر کرنے سے کوئی شخص زبان نہیں سیکھ سکتا۔

صوتیاتی طریقہ تعلیم میں اس امر کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ طلبہ غیر زبان کے الفاظ کے معنی اور ان کے محل اور طریقہ استعمال سے پوری آگاہی اور واقفیت حاصل ہو جائے۔ مادری زبان کے اسی زبان کے مرادفات ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔ اس طریقہ کار سے طالب علم کے ذخیرۂ الفاظ میں متواتر اور پیہم اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

جب طلبا زبان پر ایک حد تک عبور حاصل کر لیتے اور مضمون نویسی کے قابل ہو جاتے ہیں تو ان کو تحریری مشق کے لئے بالالتزام ایسے ہی موضوع دئے جاتے ہیں جن کی تعلیم جماعت میں ہو چکی ہے۔ غیر زبان سے مادری زبان، اور مادری زبان سے غیر زبان میں ترجمہ کرنے اور عام موضوعوں پر مضمون نگاری کی مشق آئندہ کے لئے اٹھا رکھنا زیادہ مفید سمجھا جاتا ہے

(۴)

گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے یورپ میں ایک بین قومی مجلس صوتیات قائم ہے۔ اس مجلس کے قیام کا اصلی مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے صوتیاتی نظر

اور عملی کی تحقیق و تفتیش ہے، اور اس میں صرف وہی لوگ شریک ہیں جو اس فن سے حقیقی دلچسپی رکھتے ہیں۔

مجلس کی ابتدا ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ اراکین نے آپسی مشاورت سے بین قومی صوتیاتی حروف ہجی تجویز کئے جن کی مدد سے ہر زبان کا تلفظ کامل صحت کے ساتھ قلمبند کیا جاتا ہے۔ مجلس کے خاص آرگن "اتالیق صوتیات" (میتر فونیتیک) میں ابتدائی اشاعت ہی سے بین قومی رسم الخط مستعمل ہے۔

بین قومی حروف تہجی مختلف اقوام کے علمی اور عملی اداروں میں کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ بین قومی رسم الخط میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں سے بھی متجاوز ہے۔ اور ان میں نہایت سرعت کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

یورپ کے مختلف اداروں نے بھی خاص خاص صوتی رسم الخط تجویز کئے۔ لیکن کسی کو اتنی مقبولیت اور ہمہ گیری حاصل نہ ہو سکی۔ عام طور سے ہر جگہ بین قومی حروف تہجی کی ترویج و اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس قابل رشک مقبولیت اور روز افزوں توسیع و اشاعت کی وجہ سے یہ رسم الخط مستقبل قریب میں عالمگیر حیثیت اختیار کر لے۔

مذکورہ رسم الخط کی تیاری کے لئے کسی ایک زبان سے حروف ہجی کا انتخاب کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مجلس صوتیات نے رومن حروف ہجی کو اور زبانوں کے حروف پر ترجیح دی۔ ماہرین صوتیات کا خیال ہے کہ رومن حروف تہجی دنیا کے بیش ترین ممالک میں رائج اور مستعمل ہیں۔ ان میں صوتی ضروریات کے لحاظ سے خاص خاص حروف اور نشانات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

غزل

مولوی محمد عظمت اللہ خاں سرمد

سجدہ گاہِ عاشقاں دیر و کلیسا کیوں نہو
نقشِ تصویرِ بتاں نقشِ کفِ پا کیوں نہو

اس پہ مرنے کیلئے یوسف زلیخا کیوں نہو
چاند ایسے چاند سے ٹکڑے پہ ٹکڑا کیوں نہو

ساتھ پروانوں کے دل بھی خاک اپنا کیوں نہو
شمع کے بدلے چراغِ روئے زیبا کیوں نہو

عشق میں آباد میرے دل کی دنیا کیوں نہو
بس گئے جب رنج و غم ارمان پیدا کیوں نہو

سوز ہے دونوں میں دونوں مبتلائے درد ہیں
بیقراری دل کی بجلی کا تڑپنا کیوں نہو

جوہر شمشیر آخر بن گیا اشک ہوس
خنجر قاتل میں بھی میری تمنا کیوں نہو

آگے چل کر تو کہیں دھوکا نہ دے ای چشم شوق
میں سمجھتا ہوں جسے قاتل مسیحا کیوں نہو

دست وحشت کی درازی تا بدامن ہو گئی
دل کے ہاتھوں میں گریبانِ تمنا کیوں نہو

وہ تصور میں مری آئے گئے مثل خیال
ہوش کا پردہ ہے جو خواب تمنا کیوں نہو

تم نے دی ہے جس کو آغوش محبت میں جگہ
یہ کسی ٹوٹے ہوئے دل کی تمنا کیوں نہو

یہ پھٹے کپڑے، یہ منہ پر گرد، یہ دیوانگی
سرمد اپنا حال محشر میں تماشا کیوں نہو

رومن حروف کے استعمال میں اراکین مجلس نے اس امر کا بڑی حد تک التزام کیا ہے کہ ان کی اصلی آوازیں جن سے دنیا کی اکثریت پہلے ہی سے روشناس ہے، برقرار رہیں۔ چنانچہ انگریزی لفظ (zeal) کی ابتدائی آواز کی نمائندگی کے لئے حرف (z) کا انتخاب کیا گیا ہے، جو جرمن، ہسپانوی اور اطالوی السنہ کے استعمال کے منافی ہے۔ لیکن اگر انگریزی فرانسیسی اور ولندیزی کے مطابق ہے۔ (real) کی پہلی آواز کے اظہار کے لئے انگریزی حرف (r) مروج ہے جو جرمن اور ہسپانوی استعمال کے خلاف ہے۔ لیکن انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور ولندیزی کے مطابق ہے۔ (she) کی ابتدائی آواز کے لئے (ʃ) ل ہے جو جرمن، اطالوی، اور ہسپانوی استعمال کے مطابق ہے۔ اس طرح رومن حروف کو جہاں تک ہو سکے اسی قیمت اور آواز کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ جن سے دنیا کی اکثریت پہلے ہی سے واقف ہو۔

بین قومی رسم الخط پہلی نظر میں نہایت دقیق اور مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت اس پر عبور حاصل کرنے میں زیادہ کاوش اور دماغ سوزی درکار نہیں۔ تھوڑی سی کوشش اور وقت کے صرفہ سے اس پر کامل عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی مدد سے دنیا کی مختلف زبانوں کے تلفظ ممکنہ صحت کے ساتھ قلمبند کئے جاتے ہیں اور ان کو ضروری ترمیم و اضافہ کے ساتھ) خاص خاص زبانوں کو تحریری جامہ پہنانے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

بین قومی حروف تہجی میں جو زبانیں نقل کی گئی ہیں انھیں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

انگریزی، فرانسیسی، جرمن، ولندیسی، اطالوی، ہسپانوی، پرتگالی، رومانوی، لاطینی، یونانی، ناروجی، ڈنیش، سویڈی، آئیس لینڈی، فنی، ہنگری، روسی، بوستانی، ویلش، عربی، اردو، پنجابی، بنگالی، چینی (بشمول کانٹونیز اور مینڈاری) جاپانی، برمی، جاوانی، زولو، اوجبوائی (شمالی امریکہ کی زبان) اور آئوٹین۔

اکثر ہندوستانی زبانوں میں صوتیاتی تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ نے جو جامعات لندن و پیرس کے فارغ التحصیل ہیں، ایک کتاب بہ عنوان "ہندوستانی صوتیات" (ہندوستانی فونیٹکس) انگریزی میں لکھی ہے، جس پر پروفیسر جولس بلوک صدر شعبہ لسانیات مشرقی جامعہ پیرس نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس کتاب سے ان ماہرین لسانیات کا علم ہوتا ہے، جنھوں نے ہندوستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں پر صوتیاتی تحقیقات کی ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام اور ان کے موضوع تحقیقات حسب ذیل ہیں:۔

پنجابی	ڈاکٹر گراہم بیلی ۱۹۱۴ء
بنگالی	ڈاکٹر سنتی کمار چیٹرجی ۱۹۲۴ء
سنتالی	ڈاکٹر پی، او بوڈنگ ۱۹۲۲ء
اودھی	مسٹر رام بابو سکسینہ (زیر طبع)

(۵)

بین قومی مجلس صوتیات کے اراکین صوتیات کی توسیع و اشاعت میں نہایت سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے مختلف السنہ کی صوتی اور لسانی پہلوؤں پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ اور یہ ایک حد تک اسی مجلس کا اثر ہے کہ آج یورپ کی مختلف جامعوں میں السنہ کی تعلیم صوتیاتی اصول پر ہو رہی ہے۔ اس مجلس نے صوتیات کی تعلیم اور امتحان کا باضابطہ انتظام کیا ہے، جس میں کامیابی حاصل کرنے والوں کو سند دی جاتی ہے۔

مجلس کا رسالہ "اتالیق صوتیات" اراکین کے نام مفت جاری کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ہر سال جنوری، مارچ، مئی، جولائی، ستمبر اور نومبر کی ۳۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ مختلف السنہ سے متعلق صوتی رسم الخط میں مضامین شائع ہوتے ہیں۔ زبانوں کی لسانی اور صوتی خصوصیتوں سے بحث کی جاتی ہے، اور دنیا کے صوتیات میں جو جو ترقیاں ہوتی ہیں، انھیں منظر عام پر لایا جاتا ہے۔

مجلس کی رکنیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عام دوسری عملی۔ عملی اراکین مستعدی کے ساتھ صوتیاتی تحقیقی کام کرتے رہتے ہیں۔ انھیں "اتالیق صوتیات" کی دو کاپیاں دی جاتی ہیں تاکہ صوتیات کی نشر و اشاعت میں آسانی ہو۔

بین قومی مجلس صوتیات کے اراکین کا تعلق حسب ذیل ممالک سے ہے:۔

انگلستان، جرمنی، ممالک متحدہ امریکہ، فرانس، ڈنمارک، آسٹریا، ہنگری، سوئٹزرلینڈ، چلی، سویڈن، کینیڈا، اٹلی، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ، اسپانیہ، پرتگال، ناروے، آئس لینڈ، فن لینڈ، روس، پولینڈ، ترکی، رومانیہ، برازل، کیوبا، کاسٹاریکا، مصر، جنوبی افریقہ، ہندوستان، ولندیسی، مشرقی ہند، ہند چینی، چین، جاپان، آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ۔

مجلس کے انتظامی امور مختلف اقوام کے تیس نمائندوں کے سپرد ہیں جن کا انتخاب ہر سال شرکار کی کثرت آرا سے ہوتا ہے۔ گزشتہ سال یعنی ۱۹۳۲ء میں حسب ذیل اراکین اور عہدہ دار منتخب کئے گئے:۔

عہدہ دار

ڈبلیو ویتیر ایم، اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر انگریزی ماربرگ یونیورسٹی (جرمنی)
اوٹو یسپرسن پی، ایچ، ڈی پروفیسر انگریزی جامعہ کوپن ہاگن۔ ای آر ایڈورڈس ڈاکٹر جامعہ پیرس۔ انسپکٹر مدارس سرکاری (لندن) پول پاسی۔ ڈینیل جونس پروفیسر صوتیات یونیورسٹی کالج (لندن)

عملی اراکین

ہیوبرٹ پرنو	(Hubert-pernot.) ناظم ادارۂ صوتیات	(پیرس)
سیلامورنیل لونڈ	(Lund.) پروفیسر السنہ بورگ لارائن	(فرانس)
ڈبلیو فیمان	(Flpman.) ایم، اے پروفیسر السنہ جرمانیہ کوئنس کالج	(لندن)
پروفیسر کیامیلی	(Camailli.)	(روم)
تھودی چوم	(Thudichum.) ناظم جامعہ بین الاقوامیہ	(جنیوا)
ای اے میئر	(meyer.) پی، ایچ، ڈی۔ لکچرر جرمن	(اسٹاک ہام)
ڈاکٹر آئیک مان	(Eiykman)	(دہیگ)
اے فرنتا	(Frinta.) پی، ایچ، ڈی	(بوہیمیا)
اس بویانس	(Boyanus.) پروفیسر صوتیات	(واسلی اسٹراف)
ایل شیربا	(Scerba.) لکچرر جامعہ (سینٹ پیٹرس برگ)	
ای ٹلی	(Tilley.) پروفیسر رابرٹ کالج	(استنبول)
ڈبلیو، ٹلی۔		(برلن)
جے ایس کینین	(Kenyon.) پروفیسر جامعہ	(اوہیو)
مس ایل ای پرے	(Pray.)	(نیویارک)
جے کیامیرن	(Cameron.) پروفیسر ٹارنٹو	(کینیڈا)
آر رامیرے	(Ramirez.)	(سانٹیگو)
سی، ایم دوک	(Doke.) ڈاکٹر	(جانسبرگ)
ای وائٹ ہوز	لکچرر ٹیچرس کالج	(سڈنی)

اعزازی اراکین

سر جارج گریرسن		انگلستان
پروفیسر آٹو یسپرسن۔		ڈنمارک
پروفیسر جی، کیوچ		جرمنی۔
پروفیسر جے ای نوندل		سویڈ
ڈاکٹر ایم، والٹر	فرانک فرٹ	(جرمنی)
ڈاکٹر اے وسٹرن		ناروے

ہندوستانی اراکین

پروفیسر سنتی کمار چیٹرجی	شعبۂ لسانیات۔ جامعۂ کلکتہ
ٹی، آر، سیل	سنٹرل کالج لاہور
ایچ، ایم، بجری	دلزہاسٹل لاہور
کے، چٹو پادیا	شعبۂ سنسکرت جامعۂ الہ آباد
ایل، جونس	جامعۂ پنجاب لاہور
ڈاکٹر سید محی الدین قادری	پروفیسر اردو کلیۂ جامعۂ عثمانیہ
جی، وی، راما مورتی	مدیر "تلگو" گنجم ڈسٹرکٹ جنوبی ہند
نیس، ورما	پروفیسر پرنس آف ویلز کالج جموں (کشمیر)

بڑی بی

"یاد ایام کہ بے رنگ تھی تصویر جہاں!!"

"ج" نقوی صاحبہ

جیسی عموماً بوڑھی دادیاں رہتی ہیں، یہ بھی ہماری ایک بوڑھی، خلیق، و مہربان دیہاتی بڑی بی تھیں۔ اپنی ہمعصر بوڑھیوں کی طرح ان کی دلچسپی کا بس یہی سامان تھا کہ وہ آئے دن بچوں اور نوجوانوں سے گھری رہیں۔ بعض وقت "دخل در معقولات" بھی ان کی فطرت کا ایک زبردست جزو بن جاتا تھا۔ بچے تو اس پر کچھ نوٹس نہ لیتے لیکن نوجوان لڑکیاں ان کی "بیجا مداخلت" سے بہت برافروختہ ہو جاتیں۔ ان کے سایہ سے گھبرانے لگتیں —— !!

ایک شام —— وہ اپنے پوتوں اور نواسوں سے —— نہ صرف اپنے —— بلکہ محلہ کے بھی گھری بیٹھی تھیں —— کہ ان میں سے ایک شریر بچہ چیخ اٹھا —— "اجی کبتک یونہی بیٹھی رہوگی۔ ایک کہانی تو سناؤ ——" دوسرا بھی ہم زبان ہوگیا —— "ہاں دادی اماں ایک کہانی سناؤ" اسی طرح تیسرا چیختا —— غرض تھوڑی دیر میں سب اس کے سر ہوگئے۔ لیکن سب کا مذاق کہانیوں سے متعلق جداگانہ تھا۔ کسی کو اس ہیبتناک رکاس کی کہانی پسند تھی جس کی پیشانی پر دو سینگ تھے اور ان کے درمیان ایک شیشہ کی آنکھ بنی ہوئی تھی۔ دوسرے کو اس شہزادہ کی کہانی پسند تھی جو ہرن بامس ہو چکا تھا۔ تیسرے کا مطمح نظر صرف پریوں کی کہانیاں، جنوں کے بے سرو پا قصے تھے۔ بوڑھی دادی ہر ایک کی تسلی کرتیں۔ غرض کہ بڑی بی کو کہانی سنانے میں خاص لطف آتا۔

یہ شام گزری —— دوسرا دن طلوع ہوا۔ صبح کے وقت بالعموم "بڑی بی" تنہا رہ جاتیں —— شریر بچے سب کھیل کود میں مصروف رہتے۔ لڑکیاں مٹی کا گھروندا بناتیں۔ پتھروں کو جمع کرکے ان کے چولھے بنتے۔ اس پر پتوں کی کڑھائیاں چڑھتیں۔ جنگلی پھول اور کچے پھلوں سے مہمانوں کی تواضع ہوتی۔ لڑکے جنگل سے لکڑیاں چن لاتے۔ اس وقت بڑی بی کا خیال بھی بھولے سے نہ آتا۔ نہ ان کی کہانیاں حیطۂ تصور میں آتیں۔ جب اپنی اپنی دانست میں کھانا تیار ہو جاتا —— تو بڑی بی کے پاس لاتے۔ اور کہتے کہ دادی ہم تمھارے لئے کھانا پکا لائے ہیں۔ کھا لو نا —— وہ یہ کہکر "کیا کھاؤں پتے اور پتھر؟ بھاگو یہاں سے شریر کہیں کے"! انھیں ٹال دیتی۔ دھوپ میں مارے مارے نہ پھرنے کی تاکید کرتی۔ مگر اسکی سنتا کون؟

دوپہر ہوئی —— محلہ کی عورتیں —— نوجوان لڑکیاں سب آموجود ہوئیں۔ کوئی سالن کی ترکیب پوچھ رہی ہے۔ کوئی اچار بنانے کا انوکھا طریقہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کوئی بڑی بی سے اپنے بال بچوں کا دکھڑا رو کر سناتی ہے۔ کوئی گھر زندگی کا کنتھا کر رہی ہے۔ کوئی ساس کی شکایت۔ کوئی میاں کا شکوہ کرتی —— کوئی اپنی امیدوں آرزوؤں کا دفتر کھول دیتی۔ بس بڑی بی کی دوپہر ان کو صلاح مشورہ دینے میں تمام ہو جاتی۔ ان سچی قصہ کہانیوں میں اس کا دل ایسا بہل جاتا کہ اس کو بچے بھی یاد نہ آتے۔ لیکن قصہ کہانیوں کے لئے کچھ مواد ضرور مل جاتا۔ وہ انہی لڑکیوں کی سچی داستانوں کو قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں گڑھ لیتی۔ اور جب بچوں کا اصرار ہوتا کہ "کہانی سناؤ" تو وہ ان کے سامنے ایک سے ایک اچھی اور بہتر کہانیاں سناتی —— !

پریما کہنے لگی —— "دادی تم کو خبر بھی ہے کل جب میں پنگھٹ سے گھر گئی تو راستہ میں مجھ پر کیا گزری —؟"

بڑی بی —— "کیوں خیر تو ہے بیٹا کیا ہوا؟"

پریما —— "شنکر میرے راستہ میں حائل ہوگیا اور مجھ سے بڑی عاجزی سے کہنے لگا کہ لا میں تیری ٹھلیا گھر تک لے جاؤں گا۔ دیکھا دادی۔ کتنا شوخ ہے؟

بڑی بی —— پریما تو کبھی اس سے مت بول۔ وہ بڑا گستاخ ہے۔ مجھے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ سوائے اس کے کہ قسم قسم کے کپڑے پہن کر اتراتا ہوا پھرے۔ جیسے مرغ مور کا پر لگا کے اینٹھا جاتا ہے۔ یہ صرف جدید تعلیم کا اثر ہے کہ دنیا میں یہ سب آفتیں نازل ہو رہی ہیں۔ ہمارے زمانہ میں یہ قہر نہ تھا۔ نہ ایسی بیماریاں تھیں۔ نہ ایسے لوگ مرتے تھے —— اے خدا کیا زمانہ آیا ہے —— !!"

بڑی بی کبھی ۱۸۵۷ کے غدر کا ذکر کرتے نہ تھکتی تھیں —— جب بارک پور میں آگ لگی تھی وہ صرف دس ماہ کی ایک بچی تھیں۔ لیکن لڑکیوں کو اس بات

کا یقین تک نہ آتا تھا کہ بڑی بی کبھی دس مہینوں کی بچی بھی رہ چکی ہیں۔ وہ یہ سنکر خوب کھل کھلا کر ہنستیں۔ بجائے باور کرنے کے خوب مذاق اڑایا جاتا ——! کیونکہ وہ سب تو ان کو روز ازل کی دادی —— یا —— بڑی بی —— ہی تصور کرتی تھیں ——! ہمیشہ کی ایک پیاری بوڑھی عورت جس کا سر سب سفید ہو، چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا، آنکھیں اندر گھسی ہوئی، منہ پٹوہ سا، دانتوں سے محروم ——!

وہ جب کبھی وضاحت سے لکھنؤ کے محاصرہ کا بیان کرتیں —— یا جھانسی کی شہزادی کی تصفیہ کن جنگ کا قصہ دہراتیں، تو یہ لڑکیاں بڑی دلچسپی سے دم روک کر ان کا بیان سنتیں۔

بڑی بی تسلسل کے ہنر میں یکتا تھیں۔ اس فن میں انھیں خوب کمال حاصل تھا۔ قصہ کو کہاں ختم کریں وہ وہیں کہتے کہتے رک جاتیں یا ختم کرکے پان کھانے لگتیں۔ جب قصہ کی دلچسپی کا موضوع سخت ہی ہیجان انگیز ہو جاتا —— سامعین کے دل بیتاب ہوتے۔ وہ جمائیاں لیتیں —— اونگھنے لگتیں —— پھر قریب قریب سو جاتیں!!

ادھر لڑکیاں آپس میں سرگوشی شروع کرتیں —— "ہماری بڑی بی بھی عجیب معجون مرکب ہیں۔ واقعات بیان کرتے کرتے عین اسوقت جبکہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ہیرو کی قسمت کا فیصلہ کشمکش و پیچ کے میزان میں کانپ رہا ہو۔ دادی کو جمائیاں ہی آتی ہیں۔ اونگھنا بھی سوجھتا ہے۔ پھر نیند بھی آنکھوں میں منڈلانے لگتی ہے۔ اور ہم ماہیٔ بے آب کی طرح مضطرب!!"

(۲)

صفت شمع لحد مردہ ہے محفل میری

ایک دن حسب معمول پریما اور اسکی بہن بڑی بی کی دوپہر والی "سوشیل" میں شریک نہ ہوئیں، بڑی بی نے بڑے استعجاب سے وجہ دریافت کی۔ کہ کیا ہوا ان لڑکیوں کو جو دونوں بھی نہیں آئیں ——؟

بملا نے کہا کہ وہ تو روما کے ساتھ سیکل پر سوار جنگل کی سیر کو نکل گئیں۔

بڑی بی یہ سنکر پھوٹ پڑیں۔ سر کو ہاتھ لگاکر ایک دس منٹ بیٹھ گئیں۔ سانس پھولنے لگا۔ رفتہ رفتہ ذرا غصہ دھیما ہوا تو کہنے لگیں۔ افسوس روما اس دیہات کی معصوم لڑکیوں کے لئے بربادی ہے۔ پریما نے کچھ عرصہ قبل پیشین گوئی کی تھی مگر اب تو وہ بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ خیال تو کرو۔ ایک لڑکا اور سیکل چلائے۔ دنیا تہہ و بالا نہ ہو تو کیا ہو۔ کیا یہ لڑکیاں اب کچھ اور بھی کریں گی؟ موٹر چلائیں گی؟ مرد کے جتنے پیشے ہیں وہ سب اختیار کریں گی؟ مرد کا لباس بھی کیوں نہیں پہن لیتیں؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی آفت اور آنیوالی ہے؟ وہ ناہنجار نے سب کی تباہی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ آپ خراب سارا ملک خراب۔ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔ غرض خوب بخار اس نکالیں۔ بہت کچھ بکیں، چلے پھپھولے پھوڑے

(۳)

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر ÷

اس "شمع سحری" پر جو لڑکیاں پروانہ وار گرتی تھیں۔ آج وہی بڑی بی ان کے حق میں ایک متعدی مرض بن گئی ہیں۔ پریما پر جو نکتہ چینی ہوئی، روما پر جو آوازے کسے گئے، سب کو ایک ہی لکڑی سے جب ہانکا گیا تو اس کو جوان اور جوشیلے دل کب برداشت کرسکتے تھے؟ ان کے دل متاثر ہو گئے۔ ان کی اس مداخلت بیجا۔ ناخواندہ نکتہ چینی نے بڑی بی کی رہی سہی محبت بھی ان کے دلوں سے دھو دی۔ وہ صرف اپنا دل بہلانے ان کے پاس آتی تھیں نہ کہ دل جلانے۔ پھر اس روز کی گھڑی سے کسی نے اس طرف رخ نہ کیا۔ نہ ان کے دلوں میں نئی نئی چیزیں سیکھنے کا اب ارمان رہا۔ نہ کسی بہترین سالن کے نسخہ کی طلب نے انھیں اس پر مجبور کیا کہ وہ بڑی بی کی دہلیز کی خاک لیں۔ نہ اس خون آشام لڑائی کا ذکر سننے کی ان کے دلوں میں امنگ ہوتی جو دہلی کی سرحد پر ہوئی تھی —— غرض ان کے دل آن ان لایعنی خواہشات سے بالکل مبرا ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ ایک خلش، ایک کینہ، ایک کد نے لے لی تھی ——!!

(۴)

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

دوپہر ایسی سخت دھوپ پڑتی۔ آفتاب اپنا دہکتا ہوا چہرہ دکھا کر سارے دیہات کو جھلسا دیتا۔ وہی دوپہر جس میں ان کا دل ایسا بہل جاتا تھا کہ کبھی معلوم بھی نہ ہوا کدھر آئی کدھر گئی۔ آج وہی دن ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا۔ وہی شام ہے کہ کہیں آتی ہی نہیں جھکتی۔ باد خزاں کی مسلسل سرسراہٹ جنگل کی کانیٹوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی نکل جاتی۔ بڑی بی ایک بے چین و گداز تنہائی سے دوچار ہیں۔ یہ اب محسوس کر رہی ہیں کہ کوئی عزیز ترین چیز انھوں نے کھو دی۔ ایک نعمت غیر مترقبہ سے اب یہ محروم ہیں۔

شریر لڑکے کبھی کبھی آکر ایک فقرہ چھوڑ دیتے۔ "دادی۔ اچھی دادی ہیں نا۔ ایک کہانی نہیں سناتیں؟"

لیکن —— کیا یہ معصوم بچے اس زبردست خلا کی تلافی کر سکتے تھے؟ ناممکن۔ اس کمی کو مکمل کرنے کی ان میں کہاں قدرت تھی۔ بڑی بی تو دیہات کی نوجوان لڑکیوں کی پرکیف صحبتوں کے تصور میں مری جاتی تھیں۔ ان کے خوبصورت ملیح چہرے۔ شباب کے اولین پرتو سے روشن و منور آنکھیں۔ ان کی دل خوش کن آوازیں۔ ان کی امنگ آمیز ہنسی، خوشگوار قہقہے۔ غرض ایک ایک چیز یاد آتی تو دنیا آنکھوں سے نکل جاتی۔ دل پر سانپ لوٹنے لگتا۔ مگر اس کو کوئی کیا کرے کہ خود ہی تو اس دولت کو ٹھکرایا ہے۔ نہ اپنی دو لوٹ کی زبان ہلاتیں نہ آج یہ آفتیں جھیلتیں۔ مرتے وقت، آخری زمانہ میں جبکہ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی تھیں، بھلا ان کو کیا ایسی گھبری تھی کہ سب ان کو "ہوّا" سمجھنے لگیں۔ سچ ہے قدر نعمت بعد از زوال۔ لڑکوں کی یہ بے ربط چھیڑ، کہانی کا سوال اب ان کے دل پر نشتر کا زخم لگاتا ع بچے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔ یونہی مشکل سے دو روز گزرے تھے کہ تیسرے روز بڑی بی نے مصمم ارادہ کر لیا۔ اور پورے قصبہ کا دورہ کرنے نکلیں۔ وہ سب سے پہلے پریما کی ماں کے گھر گئیں —— کیونکہ پریما کے نام میں پریم کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی بی اسکو بہت عزیز رکھتی تھیں۔

"ان سب باتوں کا آخر کیا مطلب ہے ساوری؟ تمہاری پریما نے تو مجھے مُردوں میں شمار کر لیا ہے" پہلے تو ساوری متعجب ہوئی۔ پھر کچھ سمجھ کر کہنے لگی۔ "للہ خفا مت ہو۔ پیاری دادی۔ لڑکیاں آج کل مدرسہ جاتی ہیں۔ ان کی مصروفیتیں بڑھ گئی ہیں۔ گھر کا کام کاج، پھر مدرسہ کی پڑھائی۔ وقت بہت کم ملتا ہے کہ اس کو بیکار صرف کریں۔ ایک مدرسہ ابھی ابھی دیہات میں کھلا ہے۔ صرف تین استانیوں نے ابھی اس کا افتتاح کیا ہے۔ دیکھو تو دادی اماں "لڑکیوں کا اسکول" کیسی تعجب کی بات ہے! لیکن بہت اچھا ہوا۔ ہمارے اب دن پھر جائیں گے۔ اس چھوٹے سے قصبہ کے لئے اتنا ہی بہت ہے۔ اسکی رونق دوبالا ہو جائے گی۔ ہماری لڑکیوں کو تعلیم کی بہت ضرورت تھی کندۂ ناتراش جاہل پھوہڑ عورتیں کبھی اپنی اولاد کو تربیت نہیں دی سکتیں۔ جب تک ماں تعلیم یافتہ نہ ہو بچے انسان نہیں کہلائے جاسکتے۔ بچوں میں صلاحیت نہیں آسکتی، حیوان ناطق رہ جاتے ہیں۔ زبان صرف چلا کرتی ہے۔ کسی پر فقرے کس دئے، کسی کو بلاوجہ برا بھلا کہدیا۔ نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ۔ ماں کی آغوش ایک گہوارہ ہے جس میں ان سب عیوب کی پردہ ہی پردہ میں تعلیم و تادیب ہوتی ہے۔ ہزار تعلیم ہو مگر بغیر تربیت کے اس تعلیم کی قدر نہیں ہوسکتی۔ اور طرفہ یہ کہ تربیت کے لئے بھی تعلیم ہی کی ضرورت ہے"!

بڑی بی اس داستان سن کر بوکھلا گئیں۔ وہ تو صرف سیکل چلانے پر انگشت (بدندان) بلب تھیں یہاں گل دیگر شگفت۔ اسکول کی تعریف کے پل باندھے جارہے ہیں، تعلیم کو ضروری سمجھا جارہا ہے۔ تعلیمیافتہ لڑکیوں کو ساتویں آسمان پر بٹھایا جارہا ہے۔ اے خدا یہ تو کیا سنا رہا ہے؟ غرض بڑی بی جس گھر میں قدم رکھتیں یہی کہنا سنتیں۔ جہاں جاتیں وہاں لڑکیاں ندارد۔ پوچھا کہاں گئیں؟ جواب ملتا اسکول ——! بس ہوش پراں ہو جاتے ——!!

ادھر لڑکیوں کو اسکول کا جنون ہوگیا تھا۔ ان کے لئے اب کوئی وقت ایسا بیکار نہ تھا جس کو وہ واہیات بکواس میں صرف کریں۔ ان کو اپنی استانیوں کی مدد سے کتابوں پر رفتہ رفتہ عبور حاصل ہونے لگا۔ غدر کے حالات من وعن معلوم ہوتے۔ دنیا کی اکثر رنگی کیفیت کا ان پر اظہار ہوتا۔ کتاب ایک نا موش داستان گو ہوتی۔ بیچے واقعات جن کا ادھرادھر سے کچھ حصہ بڑی بی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ اب "رویائے صادقہ" کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ان پر اب روشن ہو چلا تھا کہ دنیا نے کتنی کروٹیں بدلی ہیں۔ اس میں کیا کیا انقلابات کس کس زمانے میں ہوئے تھے۔ مدرسہ ان کے لئے دلچسپیوں کا مرکز، دل بہلائی کا ذریعہ بن گیا تھا۔

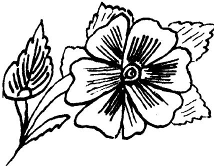
بڑی بی جب گھر لوٹیں تو ان کے پیر من من بھر وزن کے ہو گئے تھے۔ ان کی حلق میں گویا کوئی چیز پھنس گئی تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہ سکتی تھیں۔

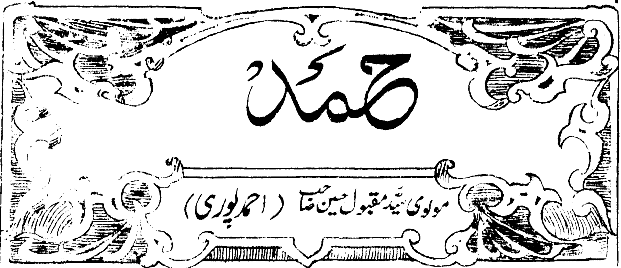
اسی مختصر سے کمرہ میں جہاں وہ —— کسی زمانہ میں —— اپنی کم سن سہیلیوں سے بیٹھ کر گپ شپ کرتی تھیں۔ ان کی پرلطف صحبتوں سے لطف اٹھاتی تھیں آج وہی کاٹ کھانے آتا تھا۔ تنہائی میں کچھ نہیں تو یہی سوجھا کہ بڑکر واقعات گزشتہ کا خیال کریں۔ تصور میں وہ صحبتیں ایک متحرک فلم کی طرح یکے بعد دیگرے چکر لگاتیں۔ اور بڑی بی غور و خوض کے دریا میں غوطہ زن ہو جاتیں۔ کبھی غصہ میں ہاتھ پیر مارتیں۔ اس بھنور سے نکلنے کی سعی لاحاصل کا شکار رہتیں ——!

تاہم —— ان کو پہلی مرتبہ —— اپنی زندگی میں یہ خیال سوہان روح بن کر کھٹکنے لگا۔ کہ وہ اب ایک "پرانے زمانہ" کی چیز ہو گئی ہیں۔ اس "نئی دنیا" میں اب ان کی ضرورت نہیں رہی —— ان کی زندگی اب بیکار ہے۔ وہ اندرہی اندر ایک نامعلوم تغیر محسوس کرتیں ——!!

نشو و نما کا خیال —— روانی کا احساس، ہر دلعزیزی کا جذبہ —— یہ کیفیات سب ان سے رفتہ رفتہ سلب ہو چلے تھے —— وہ خود کو ایک منجمد ڈھانچہ سمجھنے لگی تھیں —— بس —— غریب بڑی بی کے قوے میں انحطاط ہونے لگا۔ اور بہت جلد وہ قریب المرگ ہو چلیں —— آخر موت کے اٹل فرشتہ نے جس کی یہ ہنوز "تجاہل عارفانہ" کا شکار تھیں —— ان کو منتخب کر ہی لیا ——!

شور لیلی کو؟ کہ باز آرائش سودا کند
خاک مجنون را غبار خاطر صحرا کند





بیا ساقی زخود آگاہیم دہ
شراب بزم حزب اللّٰہیم دہ
فیضی

الحمد للّٰہ رب العالمین "تمام و کمال تعریف اللہ جل شانہ کی جس نے کائنات و موجودات کو پیدا کیا"

یہ ہیں وہ الفاظ جن سے مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن پاک کی موضوعی ابتدا ہوتی ہے۔ ان الفاظ کی تشریح و تفسیر میں نہیں معلوم کتنی کتابیں لکھ ڈالی گئیں پھر بھی ہر قوم، ہر ملت اور ہر زبان کے لوگوں نے عقیدتمندانہ اعتراف کے ساتھ یہ کہدیا اور اب بھی کہہ رہے ہیں کہ خدا کی حمد انسان کی زبان سے ممکن نہیں، زبان اسکی تعریف سے قاصر ہے۔

آخر کیوں قاصر ہے؟ کیوں تعریف ممکن نہیں؟ اس کا جواب عموماً یہ ہوا کہ انسان کی تخیل اتنی وسیع نہیں کہ اس کے صفات کا احصار کر سکے اور جب کسی کے اوصاف ہی نہ معلوم ہوں گے تو اس کی خوبیاں کیونکر بیان کیجا سکیں گی؟

اس گفتگو پر کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کی تعریف میں تو نہیں معلوم ... کیا کچھ نہیں کہا گیا جس کا جواب عموماً یہ ہوا کہ یہ تو صرف مبالغہ ہے جو شاعری کی ایک صفت ہے اور یہ کہ شاعری میں صرف اسی صفت کے باعث دروغ کو فروغ ہوا۔ خدا کی تعریف میں یہ صفت کیسے کام آئے۔ کیونکہ مبالغہ تو صرف اس حالت میں ممکن ہے جب ممدوح کی صفات سے بالاتر صفات کا علم ہو۔ جب یہ ممکن نہیں تو مبالغہ کا وہاں کہاں گزر۔ ہاں اس دور تہذیب میں خدا کے متعلق اگر کوئی غلو کیا گیا ہے تو یہ کہ — "خدا نہیں" جو بیشک مبالغہ کا ایک پہلو ہے۔

شعرائے مشرق اور خصوصاً شعرائے ایران کے قصائد نے انسان کو فرشتہ اور فرشتے سے بھی بڑھ چڑھ کر نہیں معلوم کیا کیا بنا دیا۔ یعنی انسان کو وہ کچھ کہدیا جو دراصل وہ نہیں۔ خدا کے متعلق ایسا ہی کچھ کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہ تخیل جو انسان کو خدا کہکر اپنی ذہانت کا اظہار کرتی ہے اگر خالق انسان پر اپنے محدود خیالات کو ظاہر نہ کرے تو اس ذہانت کا ثبوت کیسے ممکن ہو سکے۔

یہ تو ایک ضمنی اعتراض رہا۔ لیکن خدا کی تعریف باوجود اس تمام خاکساری کے کہ اس کی تعریف زبان سے قاصر ہے انسان کر سکتا ہے۔ یعنی ایسی تعریف جو انسان کی عبودیت اور تخلیقی حیثیت کے شایان شان ہو۔ کون نہیں جانتا کہ اس ذات ستودہ صفات کا ادراک عقل سے ممکن نہیں اور یہ کہ اسکی صفتوں کا اندازہ اسی حد تک محدود ہے جہاں تک کہ فہم و خیال کی پہونچ ممکن ہے تاہم اسکی تعریف ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ طبقے کے افراد تک سب نے کی ہے۔ کیونکہ ہر طبقے کا فرد اس کے متعلق کوئی نہ کوئی تصور رکھتا ضرور ہے۔ مثلاً ایک بچے کا تصور جو اس کے ماحول معصومیت تک محدود ہے کیونکہ وہ خیال کرتا ہے کہ اللہ میاں اس نیلے نیلے آسمان کے اوپر ایک زرنگار تخت پر بہت سی مٹھائی لئے ضرور بیٹھے ہوں گے اور جب ہم اپنا سبق یاد کرلیں گے تو ممکن ہے کہ اللہ میاں ہمیں چیز دیں۔ عیسائیوں کی دعا — "گیو اس دس ڈے اور ڈیلی بریڈ" کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں۔ ایک نوجوان کا تصور اسکے علم اور اسکی فہم و فراست سے متناسب ہوگا۔ لیکن باوجود علم اور فہم و فراست کے خدا کے متعلق اس کا یہ خیال ضرور ہوگا کہ "وہ نہایت حسین ہے" اور یہ تخیل صرف اس وجہ سے کہ بہ مقتضائے سن وہ حسن کا پجاری ہے۔ اسی طرح ایک سن رسیدہ ضعیف العمر کے تصور کا اندازہ اس کے علم و فہم سے متناسب سمجھنا چاہیئے اور وہ بھی اپنے علم و فہم کے باوجود خدا کو نہایت "متین و سنجیدہ" سمجھتا ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس — "ہر کسے بقدر ہمت اوست" — "بندا اپنی اپنی شعور اپنا اپنا" — جو جس ماحول میں ہے اسی مطابقت سے خدا اور اسکی پیدا کی ہوئی ہر چیز کو تصور کرتا ہے۔ اس طرح خدا کی تعریف انسان کی زبان سے ممکن ضرور ہے خواہ ایسی تعریف جیسی کہ چاہیئے ممکن نہ ہو سکے۔

خدا کی تعریف مشرق و مغرب کے لٹریچر میں بہت ہے خصوصاً اہل مشرق نے ذوق روحانیت کو اعتراف عبودیت میں بہت کچھ لکھا ہے۔ کتب مقدسہ یعنی وید، اوستا، زبور، انجیل اور قرآن حکیم سے یہاں کچھ واسطہ نہیں نہ شرح صحائف سے متعلق کسی بحث کی ضرورت۔ کیونکہ اس طرح طول کلام کا اندیشہ ہے۔ ہم کو تو صرف شاعر کی تخیل سے مطلب ہے۔ وہ ہو شعرائے نادرہ کار نے خدا کی تعریف کے عموماً دو پہلو لئے ہیں۔ (۱) نفی اور (۲) اثبات۔

نفی کا پہلو زیادہ عام ہے یعنی عموماً سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ "اے خدا تیری تعریف زبان سے ممکن نہیں" جس کی ایک دلچسپ مگر محققانہ مثال اکبر کا یہ شعر ہے ؎

عقل میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

مغربی سائنس داں حضرات اور بگڑے ہوئے فلسفیوں کے لئے یہ نہایت ہی مناسب منطق ہے۔ اسی کا عام پہلو یعنی نفی کا عام پہلو حضرت امین الدین وارثی احمد پوری کا یہ شعر ہے ؎

نہیں ممکن، نہیں ممکن، نہیں ممکن، نہیں ممکن
زباں سے حمد تیری خالق برحق، نہیں ممکن

یعنی وہ حمد جو اس کے شایان شان ہے انسان کی زبان سے ممکن نہیں۔ کلام پاک میں نفی پہلو کی یہ خصوصیت سورۂ کہف کے آخر میں ظاہر کی گئی ہے۔ اہل ذوق خود دیکھ سکتے ہیں۔

اثبات کا پہلو مگر خدا کی تعریف کرنا ذرا مشکل امر ہے۔ لیکن ادبیات میں یہ پہلو بھی بکثرت ہے ایسی حمد خدا کی ان صفات کو جو ہمیں معلوم ہیں ندرت ادا کے ساتھ بیان کرنے اور اس بیان کو تقدیس کے ساتھ سراہنے میں ممکن ہو سکی۔ لیکن اس میں بھی نفی کا پہلو عام طور پر شامل رہتا ہے جس سے مطلب عموماً یہ ہوتا ہے کہ انسان کی زبان سے یہ اثبات بھی ناکافی طور پر ممکن ہو سکے ہیں۔ مثلاً حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر ؎

بر در بے نیازیت صد چو حسین کربلا
تشنہ بماند، درگزر تا بہ زلال کے رسد

طوفان نوحؑ، نار ابراہیمؑ، واقعہ صلیب، واقعہ کربلا، یہ سب اسکی بے نیازی کی عام مثالیں ہیں (اور بے نیازی منجملہ صفات باری تعالیٰ کے ایک صفت ہے۔ غرض حمد کا خالص اثباتی پہلو بہت مشکل ہے۔ کلام پاک میں سورہ حشر کے آخر میں یہ پہلو نہایت خوش اسلوبی سے برتا گیا ہے جس کی مثال کہیں ممکن نہیں۔ البتہ ہندوستان کے روحانی بادشاہ (اقوام ہند کے پشت و پناہ، ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی غرض ہندوستان میں رہنے بسنے والی ہر قوم کے بہی خواہ اور اس ملک پر خدا کی رحمت اور اس کی عطا کی ہوئی بخشش و برکت یعنے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ نے حمد میں جو اثبات کا پہلو رکھا ہے۔ غالباً بہت کم ایسے اہل دل ہوں گے جن کی زبان سے دریائے معرفت کی موجیں اس جوش و خروش کے ساتھ رواں ہوئی ہوں۔ حمد کے اثباتی پہلو کی اس مثال کے سامنے ہم دوسری ہر مثال کو یہاں لکھنا غیر ضروری سمجھیں گے کیونکہ تمثیل کے لئے یکجائی مثال ہونے کے لحاظ سے یہ نہایت ستھری تمثیل ہے، جو انسان کی زبان سے ممکن ہو سکی۔ چنانچہ آپ کے دیوان کا پہلا شعر اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

حمد یکہ ہمچو بحر کرم بیکراں بود
حمد یکہ شکر نعمت ہر دو جہاں بود

"تقدیس و تعریف تیری اے پاک پروردگار، ایسی تقدیس جیسے کہ تیرے رحم و کرم کی انتہا نہیں اور ایسی تعریف جو دونوں جہان کی نعمتوں کے شکر سے ہم آہنگ ہو"

حمد یکہ در تضاعف ذرات کائنات
چندانکہ مستزاد کنی بیش ازاں بود

"تعریف و تقدیس میری اے ذات مطلق، ایسی تعریف جو ذرات کائنات کی تعداد ہی نہیں بلکہ ان کے تضاعف میں جہاں تک مستزاد کیا جانا ممکن ہے اس سے بھی زیادہ ہو"

حمدے بداں مثابہ کہ ادراک کنہ آں
برتر ز پایۂ خرد خردہ داں بود

"تقدیس تیری اے خدائے برتر و بزرگ، ایسی تقدیس جس کی حقیقت کا ادراک عاقل کی عقل کے پایہ سے بھی برتر ہے"

حمد یکہ چوں عماری عزت کند رواں
بر منکب ملائکہ حکمش رواں بود

"تعریف تیری اے صاحب عزت و حرمت، ایسی تعریف جس کی اعزازی سواری کے لئے فرشتوں کے کندھے بھی محکوم ہو سکیں"

حمد یکہ در ہوائے ہویت ہمائے وار
بر تختگاہ ملک قدم سایہ باں بود

"تقدیس تیری اے ذات لایزال، ایسی تقدیس جو تیری توحید کے اعتراف اور اسکے جذب شوق میں مثل ہما کے تیری ذات قدیم کی اقلیم کے عرش اعظم پر چتر سا ہو اور ہونے کی آرزو رکھے"

حمد یکہ طل رافتش ار بر کسے فتد
بر مسند مقاصد خود کامراں بود

"تعریف تیری اے سمیع و بصیر، ایسی ہستی کی تعریف کہ جس کی مہربانی کا سایہ اگر کسی پر پڑ جائے تو وہ گوہر مقصود پا کر کامران و کامیاب ہو جائے"

حمد یکہ چوں ز حیطۂ جاں سر بروں کند
ہر تار موئے بر تن ازاں صد زباں بود

"تقدیس تیری اے رحمٰن و رحیم، ایسی تقدیس جو اپنے احاطۂ احساس سے باہر ہونے پر جب جسم کو عالم وجد و بیخودی میں چھوڑ دے تو جسم کا رواں رواں صد زبان ہو کر تعریف و حمد میں مشغول ہو جائے"

حمد یکہ چوں قلم کشد از ضیق کن فکاں
جولانگہش بناحیت لامکاں بود

"تعریف تیری اے کارساز مطلق، ایسی تعریف جو عالم امکان کی کشمکش سے چھوٹنے پر لامکان کے انتہائی کنارے یا عالم لاہوت میں جا کر دم لے"

حمد یکہ چوں زبان دہدش جوہر بیاں
تحسین قدسیاں ہمہ نعم البیاں بود

"تقدیس تیری اے قدوس و سلام، ایسی تقدیس جو زبان سے زیور بیان حاصل کرنے پر فرشتوں کی تعریف و تحسین کا باعث اور ان کی تقدیس سے ہم آہنگ ہو"

حمد یکہ نے ملک کند آشنا نہ انس و جاں
بل خود بذات خود متصدیٔ آں بود

"تعریف تیری اے "برتر از قیاس و گمان و وہم" ایسی تعریف جو نہ تو فرشتوں کی زبان سے ممکن ہے، نہ جن و بشر کی زبان سے بلکہ ایسی تعریف جس کی اہل خود تیری ذات ستودہ صفات ہی ہو سکے"

آں حمد ناقصیکہ بگویند بندگاں
کے درخور خدائے حق و عزوشاں بود

"وہ ناممکن حمد جو تیرے بندے کرتے ہیں، اے خدائے برحق تیری عزت و شان کے شایاں ہی نہیں۔"

اس طرح اس ولی کامل نے بھی نفی کا پہلو لے کر اپنے اثبات کا خاتمہ کیا۔ یہاں پوری نظم طوالت کے خیال سے نہیں لکھی گئی، یہ صرف ابتدائی اشعار ہیں لیکن ان سے ظاہر ہے کہ آج تک اس شان کی حمد شاید ہی کسی زبان کے لٹریچر میں ممکن ہو سکی ہو۔

جیسا کہ قرآن حکیم میں لکھا ہے کہ خدا کی حمد میں اس کی تمام مخلوق رطب اللسان ہے یعنی :-

"تسبح لہ السمٰوات السبع والارض ومن فیھن"

اس کی تسبیح ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب پڑھتے ہیں — پھر بھلا انسان جو اشرف مخلوق ہونے کا شرف رکھتا ہے خدا کی تعریف کرنے پر قادر کیوں نہ ہو۔ اس کو تو خواہ مخواہ اسکی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اپنا اپنا طریقہ البتہ جداگانہ ہے حتیٰ کہ یہ کہنا کہ۔ "خدا نہیں"۔ یہ بھی نفی پہلو کے اعتبار سے اسکی تعریف ہے۔ یعنی یہ کہنے والا سچے دل سے کہتا ہے کہ "اے وہ ذات جس نے مجھ ایسے کم ظرف کو شرف انسانیت عطا کر کے مخلوق کیا میں اس بات کو صدق دل سے کہتا ہوں کہ میں تجھ کو پہچان نہیں سکا اور میرے محدود دماغ میں اتنی بھی وسعت نہیں کہ اسے تیری ذات و صفات کا کچھ بھی اندازہ ہو سکے"

یہ نفی پہلو میں خدا کی تعریف ہی تو ہے۔ غرض خواہ کوئی ملحد ہو خواہ دیندار اوپر لکھی ہوئی آیتہ کے اعتبار سے خدا کی تعریف و توصیف میں مشغول ہے۔ لیکن مبارک ہے وہ دماغ جس کو اس تعریف کا محض احساس ہی نہیں بلکہ وہ اس کو معراج عقل سمجھتے ہوئے اس کا معتقد بھی ہے۔ اور اس اعتقاد کی بنا پر اس کو اپنے فہم و شعور کی کم مائیگی کا اعتراف بھی ہے۔



چور کے گرفتار کرنیکی تجوری



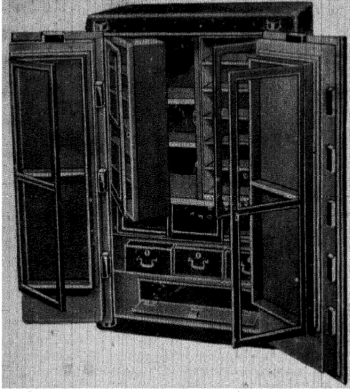
از دفتر محکمہ صنعت وحرفت سرکار عالی

تصدیق کیجاتی ہے کہ مسرز سدھیشور ٹریڈنگ کو نے دفتر ھذا کو ایک فولادی کیا بنٹ فراہم کیا ہے اور یہہ اشیاء بالکل اطمنان بخش پائی گئی ہیں - قابل ستائش ہے ایک ہندی فرم اچھا کام کر رہی ہے اس کی ہر طرح کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے -

شرحدستخط علی محمد خان صاحب

منجانب ناظم صنعت و حرفت

جواھرات رکھنےکی تجوری



بتاریخ ۱۲ اگسٹ سنہ ۱۹۳۲ ع

نواب اعظم جاہ بہادر والاشان بہ نفس نفیس رونق افزا ھو کر مسرت کا اظہار فرمایا ھے اور ود تجوری خرید فرما کر قدر افزای فرمایا ھے —

از دفتر کوتوالی بلدہ حیدر آباد دکن

اس تصدیق سے میں مسرت محسوس کر رھا ھوں کہ "سیف کیا بنٹ" نقدی کے صندوق اور دیگر فولادی اشیا وغیرہ مصنوعہ مسرز سدھیشور ٹریڈنگ کو عابد بلڈنگس حیدر آباد نہایت اعلیٰ قسم کی اور بالکل عصر جدید کی ساخت و وضع وغیرہ کی ھیں -

دو پیجن کیا بنٹ ھول فائلنگ اور تازیانہ کا بینون کو ملانے والے جسکو میں نے خرید ا ھے مجھے بہت اطمنان دیا ھے لہذا میں اس فرم کی پبلک اور دفاتر سے سفارش کرتا ھون اور میں نے اس کے واحد نمائندے مسٹر یل جی ھومبال کو ا پنے کا ھکون کیساتھ بہت خلیق اور راست باز پایا ھے -

شرحدستخط راجہ ونکٹ راما ریڈی بہادر او - بی - ای کوتوال بلدہ

سول نمایندہ یل - جی - ھومبال

سدھیشور ٹریڈنگ کمپنی

عابد بلڈنگ حیدر آباد دکن

رزیڈنٹوں کی کہانی
"رسول خانی" کی زبانی

مولوی ابو محمد عمر صلاح یافعی صاحب

حیدرآباد دکن کے رقبۂ رزیڈنسی کی واپسی (۱۴ مئی) ۱۹۳۳ء پر رعایائے آصفی کی طرف سے، اسکی یادگاریں مختلف طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ اور خود حکومت کی جانب سے "اعلان خود مختاری" کی طرح "ہندوستان" کی سب سے اہم رزیڈنسی" کی واپسی کی تقریب میں ۱۴ مئی کو تعطیل عام قرار پائی ہے۔ رزیڈنسی روڈ اور رزیڈنسی بازار کا نام علی الترتیب "شاہ راہ عثمانی" اور "سلطان بازار" رکھا گیا۔

میرے کرم فرما سیٹھ ابراہیم ہارون "سن برج" (عابد بلڈنگ حیدرآباد) نے، جو ایک تعلیم یافتہ تاجر ہیں مجھ سے خواہش کی ہے کہ تاریخی حیثیت سے حیدرآباد کی رزیڈنسی کے متعلق ایک جامع و مانع رسالہ مرتب کردوں تو وہ اس کو یادگار کے طور پر کتابی صورت میں طبع و شائع کرلیں گے۔

اس تحریک کی بنا پر میں نے تاریخی نوٹ جمع کرنے شروع کر دئے ہیں اور اسی فراہمی کے سلسلہ میں، فیض حق چشتی القادری عرف محمد فیض اللہ "منشی آصف جاہی" کی تاریخ "خزانہ رسول خانی" کو میں نے بالاستیعاب دیکھا۔ یوں تو حضرت آصف جاہ ثانی میر نظام علی خاں کی تخت نشینی (۱۱۷۵ھ) کے بعد سے تواریخ دکن میں رزیڈنٹوں کا حال جا بجا تحاًل جاتا ہے لیکن "خزانہ رسول خانی" میں "وقائع وکلایان کمپنی انگریز بہادر" کے عنوان سے ایک مستقل باب ہے جس میں ۱۱۹۶ھ سے ۱۲۴۶ھ تک "گیارہ رزیڈنٹوں کا کچا چٹھا" بیان کیا گیا ہے۔ اتنا صاف حال کسی اور تاریخ میں میری نظر سے اب تک نہیں گزرا۔ اور میں ابھی تک اپنی کتاب کا سب سے بڑا ماخذ، اسی کو سمجھ رہا ہوں۔ یہ تاریخ بھی کچھ عجیب و غریب ہے۔ اس میں دنیا جہان کا حال ہے۔ پڑھنے والا دنگ ہو جاتا ہے کہ یا اللہ! میں تاریخ دکن پڑھ رہا ہوں یا شداد کی جنت کی سیر کر رہا ہوں[۵]۔ اخبار حیدرآباد کے ذکر میں کہیں یاجوج و ماجوج کا بیان آجاتا ہے تو کہیں کرۂ زمین کا۔ باایں ہمہ "عہد آصفی" کے اس میں بعض حالات و واقعات ایسے ہیں جو عام تواریخ دکن میں نہیں ملتے۔ دیوان دکن، میر عالم (۱۲۱۹ھ – ۱۲۲۴ھ) کے "دوازدہ دفعات" اسی تاریخ میں تحریر ہیں چنانچہ کتاب "میر عالم" کے مؤلف نے اپنی کتاب میں اسی سے ان "دوازدہ دفعات" کی نقل کی ہے۔ اس کے علاوہ "گول میز کانفرنس" میں سلطنت حیدرآباد کے دیگر استقرار حقوق کے من جملہ "تفویض پیٹھ" کے مسئلہ میں جب مجھ سے استفسار کیا گیا تو میں نے اسی خزانۂ رسول خانی سے "تفویض پیٹھ" کا اصل واقعہ نقل کرکے سررشتۂ پیٹھ کے تفویض کر دیا تھا۔ میر عالم کی دیوانی! مسٹر سڈنی ہام کی رزیڈنسی کے زمانہ میں پیٹھ کی تفویض عمل میں آئی۔ جس کی ابتدا ایک خاص واقعہ سے ہوئی ہے۔

مختصر یہ تاریخ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں نے اس کا مطالعہ کرکے ایک فہرست مضامین بھی بنائی ہے جس پر خود ایک مستقل مضمون بھی لکھا جا سکتا ہے (یار زندہ صحبت باقی!) مولف نے اس کو نواب غلام رسول خاں والی کرنول کے نام معنون کیا ہے۔ انیس سطری مسطر اور دو سو نو اوراق ہیں۔ کتاب قلمی، زبان فارسی، گیارہویں رزیڈنٹ کے حال کی حد تک بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۶ھ تک واقعات ہونگے لیکن اس میں بعض حالات ایسے بھی آگئے ہیں جن سے ماہ ذی حجہ ۱۲۵۰ھ کے واقعات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس لحاظ سے اس میں ۱۲۵۰ھ تک کے رزیڈنٹوں کے حالات ملنے چاہیئے تھے!

مؤلف پر اعتماد کرکے کم و بیش میں نے لفظی ترجمہ کر لینے کی کوشش کی ہے کہ ان کے خیالات و واقعات کی آئینہ داری ہو سکے۔ اس کے سلسلۂ بیان میں بعض ماحولی باتیں ایسی بھی ہیں جن کا اقتضاء یہ ہو سکتا ہے کہ ان پر حواشی و تعلیقات لکھے جائیں۔ جب میں نے اس پر غور کیا تو اس کا طومار اتنا نظر آیا کہ متن سے حاشیہ بڑھ جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔

اس لئے فی الحال کتاب مکمل ہونے تک اصل متن کو مؤلف کی اپنی ذاتی ذمہ داری (منشی آصف جاہی) پر پڑھیے جائیے اور دیکھئے کہ رزیڈنسی کی ابتداء ہمارے ملک میں کیسی اور کس طرح ہوئی؟

(عمر یافعی)

مسٹر جان سن بہادر

"مسٹر جان سن" بہادر، منشی میر حسین علامہ، اور میر قمر الدین [illegible] کے ساتھ، ۱۵ رجب ۱۱۹۶ھ کو حیدرآباد دکن آئے۔ اور شہر کے باہر حضرت "جان اللہ شاہ" (قدس سرہ) کی درگاہ کے متصل قیام کیا۔ ان دنوں حضرت آصف جاہ ثانی (نواب میر نظام علی خاں بہادر) قلعۂ کولاس سے تشریف لا رہے تھے کہ، رستہ میں اخباریوں نے "مسٹر جان سن" کی آمد کی خبر پہنچائی۔

اس کی سماعت فرماتے ہی ناظم بلدۂ حیدرآباد کے نام عنایت نامہ صادر فرمایا گیا کہ:

"وکیل سرکار کمپنی انگریز بہادر" کے قیام کے لئے نہایت عجلت کے ساتھ انور الدین خاں [شہامت] جنگ گوپاموی کی حویلی درست کرکے اطلاع گزرانی جائے۔"

خود بہ دولت منازل سفر طے کرتے ہوئے (رونق بخش بلدۂ حیدرآباد ہوکر) "مسٹر جان سن" کے پاس حکم روانہ فرمایا کہ "آج انور الدین خاں بہادر (شہامت جنگ) کی حویلی میں آجائیں۔"

دوسرے دن شمس الامراء بہادر کو استقبال کے لئے روانہ فرمایا۔ "مسٹر جان سن" نے ایک زنجیر فیل مع حوضۂ نقرہ ملمع کار طلائی و مینائی،

عہ۵ جریدۂ غیر معمولی ۲۷ صفر ۱۳۵۲ھ جلد (۶۴) نمبر (۱۰)۔ ۱۲

عہ۵ لطف یہ ہے کہ اس میں شداد کی جنت کا بھی ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ: جنوب رویہ دکن سری رنگ پٹن میں ہے ۱۲

دو راس اسپان عربی مع ساز و سامان، کپڑوں کی چند کشتیاں، اقسام کے تحائف، لباس و جواہر قیمتی اسی ہزار روپیہ کی تواضع کرکے انھیں رخصت کیا۔ چار گھڑی کے بعد "مسٹر جان سن" سائبان دار، ہیلی عماری میں سوار ہوکر اپنی سواری کے پیچھے، ماہی مراتب کے ہمراہ، نقارہ بجواتے ہوئے منشیوں کے ساتھ حضور پُرنور کی بارگاہ میں حاضر ہوے۔ اور آداب بجالاکر خود اکیس مہر اشرفی نذرِ دستی گزرانی، اور دونوں منشیوں (علامہ و منت) نے بھی پانچ پانچ مہر اشرفی نذر گزرانی۔ لارڈ بہادر کلکتہ کے مرسلہ تحائف ملاحظہ میں پیش کئے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

چار زنجیر فیل با حوضۂ نقرہ ملمع طلائی۔ یک منزل پالکی منقشی پُرزر، چار اسپان عربی مع ساز و سامان، یک منزل کوتل (جھکڑا یا چوکڑا) مع چار اسپاں۔ دو منزل میانہ، متعدد بلبجے، چند اقسام کی بانات، رنگ برنگ مخمل کے چند طاقے۔ اس کے علاوہ ہمہ قسم کے بہت سے کپڑے، اور قسم قسم کی گھڑیالیں، راگ مالے اور چند قسم کی بنادوقیں۔ مختلف الوضع پیچوں کی جوڑیاں، مرقع ہائے تصاویر (البم) ہر ملک کی نادر تلواریں، نایاب ولایتی ادویہ کے کنٹر۔ ایک صندوق جواہر گراں بہا۔

لارڈ صاحب کے بھیجے ہوئے یہ سارے تحائف حضور پرنور نے قبول فرمائے۔ "مسٹر جان سن" کی رخصت کے وقت حضور پرنور نے پانچ عدد جواہر عنایت فرمائے، دونوں منشیوں کو جیغہ و سرپیچ عطا فرمایا، اور حکم صادر ہوا کہ "ہر روز ایک سو روپے کا میوہ، اور ایک سو روپیہ کا کھانا پکاکر "مسٹر جان سن" کے پاس روانہ کیا جایا کرے۔"

دربار کے برخاست کے بعد مسٹر جان سن کی حضوری اور مرسلہ تحفہ و ہدایا کے متعلق کما حقہٗ کلکتہ کو خریطہ روانہ فرمایا گیا، اور کمخواب، کناری گوٹہ، جواہر قیمتی لکھو کھا روپے کی نقد خریدی شروع کی۔

معین الدولہ بہادر (ارسطو جاہ) نے بڑی دانائی و دُور اندیشی سے غور کیا کہ، بلا کسی تحریک کے "وکیل انگریز بہادر" کی کلکتہ سے آنے کی کیا وجہ ہے؟ جب اس "خود آمدی" کی تہہ تک پہنچ گئے تو حضور پرنور میں معروضہ پیش کیا کہ:۔

غلام جب تک کوئی معروضہ پیش کرے، اس وقت تک کسی "وکیل انگریز بہادر" کی آمد نہ ہوا کرے، کیونکہ ان دنوں حیدر علی خاں بہادر تعلقہ دار سری رنگ پٹن کے انتقال کی وجہ سے والا جاہ بہادر نے فتح علی خان بہادر سے ارکاٹ وغیرہ واپس حاصل کرلیا ہے، اپنی کوتاہ اندیشی و سود فہمی سے والا جاہ بہادر نے، لارڈ بہادر کلکتہ سے ساز باز کی، اور خود اپنی جانب سے خزانے خالی کرکے چند لاکھوں، وکیل سرکار کمپنی انگریز بہادر کے پاس روانہ کئے ہیں۔ غلام کو یقین واثق ہے کہ، مسٹر جان سن بہادر، اپنی باریابی کے موقع پر سرکار آصفیۂ عالیہ اور سرکار کمپنی انگریز بہادر کے اشتراک و اتحاد کے متعلق ضرور کچھ عرض کریں گے، اگر ایسا ہو جائے تو انتظام دولت ابد مدت کے استحکام کا موجب ہے۔ ہر دو سرکارین کے اتحاد و اشتراک کے استقرار و استمرار کے بعد، والا جاہ بہادر کے تعلقۂ متعلقہ کی فارغ خطی کی درخواست حضور پُرنور سے کریں گے۔

معین الدولہ (ارسطو جاہ) کے اس معروضہ کے گزرتے ہی حکم صادر ہوا کہ:۔

"تہہ نامہ کا ایک مسودہ تیار کرکے ممتاز الامراء بہادر کے مشورہ سے بار دولت کے حضور میں گزرانا جائے۔" مسودہ تہہ نامہ کے ملاحظہ کے بعد وکیل انگریز بہادر کی طلبی ہوئی۔

وکیل مذکور نے باریاب ہوتے ہی سرکار کمپنی انگریز بہادر کی شجاعت اور نظم و نسق ریاست کی تعریف کے پُل باندھنے شروع کئے۔ جب اس طرح کمپنی کو روشناس کراچکے تو اپنا اصلی پیام پہونچایا کہ "ہر دو سرکارین میں اتحاد و اشتراک بہ حصۂ مساوی تین سو سال کے لئے قرار پائے تو جانبین کی صلاح و فلاح کے لئے بہت ہی خوب و بہتر ہے۔"

یہ سننے کے بعد حکم صادر ہوا کہ:۔

اگر سرکار عظمت مدار آنریبل کمپنی انگریز بہادر کی خوشی حصۂ مساوی کے ساتھ سرکار دولت مدار آصفیہ عالیہ کے اشتراک و اتحاد سے ہے تو بہتر، تہہ نامہ کا مسودہ کرکے لائیں۔ وکیل مذکور نے تہہ نامہ کا مسودہ (جو پہلے سے تیار تھا) اسی وقت ملاحظۂ انور میں گزرانا۔ اس کے بعد معین الدولہ (ارسطو جاہ) بہادر نے اپنا تیار کیا ہوا مسودہ پیش کیا۔ دونوں مسودات کا مقابلہ کرنے پر معین الدولہ کا مسودہ منظور ہوا، اور مبیضہ کا حکم صادر فرمایا گیا۔ تہہ نامہ جات لکھ کر مواہیر و دستخط کے بعد ہر دو سرکارین میں داخل ہوئے۔ دوسرے دن کمپنی کی جانب سے رسم ضیافت عمل میں آئی، جس میں حضور پُرنور، مرشد زادگان، تمام محلات مبارک، اعیان سلطنت، ارکان ریاست، متصدیان، حتیٰ کہ اصیلاں تک شریک رہیں، کمپنی نے ساٹھ لاکھ روپیہ بڑے تزک کے ساتھ خرچ کیا۔ اس کے بعد اپنی باریابی کے موقع پر حضور پرنور سے، وکیل کمپنی نے نہایت سلجھے ہوئے پیرایہ میں عرض کیا کہ:۔

ابتدا سے اب تک انگریز سرداروں نے تعلقہ والا جاہ بہادر پر سولہ کروڑ روپیہ خرچ کیا، اور بذات خود بڑی محنت شاقہ برداشت کی، حتیٰ کہ اپنی جان پر کھیل کر کلاہ پوشان فرانسیس سے جنگ کی، جس میں چھ ہزار گورے، موت کے گھاٹ اترے۔ دست آویز والا جاہ بہادر ملاحظہ فرماکر اخراجات فوج کشی،

قرض ساہوکاران موسود بابت تنخواہ سپاہ، کی تحقیق فرمائی جائے اگر مناسب تصور فرمایا جاتا ہے تو عنایت فرمائیں، نہیں تو والا جاہ کے نام تعلقہ کی فارغ خطی سرفراز ہو۔ بڑی ردوکد کے بعد آٹھ لاکھ نذرانہ کے ذریعہ تعلقہ والا جاہ (جو پانچ کرور کا تھا جس کی تفصیل سوانح والا جاہ میں لکھی گئی ہےعہ) کی فارغ خطی بہ نظر اتحاد و آشتی حضور پُرنور نے وکیل مذکور کو مرحمت فرمائی۔ معین الدولہ بہادر (ارسطو جاہ) در راجہ سورج ونت بہادر سے حضور پُرنور نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے معروضہ کے مطابق ہی واقعہ پیش آیا۔ اس حسن سعی و کوشش کے صلہ میں معین الدولہ کو مشیر الملک بہادر کے خطاب اور پنج ہزاری منصب سے سرفراز فرمایا گیا۔ اور اسی زمانہ سے جزئیات سے کلیات تک مقدمات میں شریک مشورہ رہ کر دن بدن اپنا اعتبار بڑھاتے رہے۔

اس کے بعد مسٹر جان سن نے ناسازئ آب و ہوائے دکن کی وجہ سے حضور پُرنور سے رخصت حاصل کرکے اپنا کل سامان جلوس و سواری نذر کردیا۔ اپنی جگہ میر حسن علامہ (منشی) کو فرائض وکالت کے لئے مقرر کردیا۔ ازروئے عہد نامہ دو ہزار جوانان بارکی پلٹن بارہ ضرب توپیں، بارود گولے کے ساتھ شہر کے باہر آکر چھاونی ڈالی۔

افسر پلٹن کو شہر میں آنے اور چھاونی سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔

اور جو وکیل حسب قرارداد حاضر حضور پُرنور ہو، وہ سوائے ڈیرے کے پلٹن کی سکونت کے لئے چھپر بھی نہ ڈالیں۔ خریدئ اجناس کے لئے ضرورت پر، چھاونی کے لوگ شہر میں سادگی سے آتے ہیں، کسی شخص کی مجال نہیں کہ وہ کمپنی کے لوگوں سے بات کرے، یا چھاونی کو جائے یا کسی سے دوستی کرکے اپنے موافق بنالے، یا کوئی عہدہ دار سرکار وہاں جاکر، سوال و جواب کرے۔

جو سیکا کول، دراج بندری کی رقم پیش کش، سات لاکھ پچیس ہزار روپیہ سالانہ قرار پائی تھی، وہ کمپنی کی جانب سے وکیل سال بسال سرکار آصفیہ میں داخل کردیا کرتے تھے، کبھی کوئی رکاوٹ اس میں پیدا نہیں ہوئی۔

ہر دو سرکارین کے عہد نامہ کی نقل یہ ہے۔

نقل عہد نامہ اشتراک فی مابین ہر دو سرکارین عظمیٰ این است۔

عہد فی مابین ہر دو سرکارین عظمیٰ بہ مضمون واحد بہ شروط کاملہ، سیزدہ دفعات۔

دفعہ (۱) بنائے مصادقت موافقت، مصاحبت، طمانیت صفا از ارتفاع مراتب حفاظت محبت و یگانگت و اتحاد ولا فی مابین جانبین ہر دو سرکارین عظمیٰ و ثبوت و تیقین و توثق از سیرابی و سرسبزئ حدیقۂ محبت و مواانست و شراکت رفاہیت و وداد و پاس داری بہ آب یاری طرفین جانبین مشارکت بلا مغائرت ایں کہ ایں سررشتۂ خدا ساز، در ہمہ حال و مآل در ہمگی مقدمات کلیات، و در تمامی مراتبات جزئیات اشتراک دولت و سلطنت بلا مغائرت مودت ہر آن و ہر زمان منظور و ملحوظ پیش نہاد خاطرین، بل نصب العین می باشد۔ و در تقدیم شرائط مودت و موانست استقامت مشارکت و اخلاص تا جاں دارد و بہ مہر و دستخط سرکار عظمت مدار آنریبل کمپنی انگریز بہادر، بادشاہ ذی جاہ، فلک اشتباہ، انجم سپاہ، معدلت دستگاہ، عظیم الشان، گریٹ برٹین جارج بہادر، سہ صد و بست و ایک سال ہلالی بہ دفعات علیٰ حدہ علیحدہ با نواب صاحب مستطاب معلی القاب جلیل المناقب و عظیم المناصب، رفیع المکان، منیع الشان، فرمانروائے اقلیم دکن، متعلقہ ہندوستان میر نظام علی خان بہادر، فتح جنگ، نظام الدولہ، نظام الملک، آصف جاہ، مظفر الممالک، رستم دوران، سپہ سالار، یار وفادار، ارسطو زمان، جانشین دربار حیدرآباد، استقرار و استمرار یافت۔

دفعہ (۲) ہر گاہ کہ مردم علاقہ دار سرکار کمپنی انگریز بہادر پیش گاہ جانشین دربار حیدرآباد سرکار آصفیۂ عالیہ و چہ نزد کار پردازاں، و چہ در ممالک محروسہ تعلقہ متعلقہ سرکار معز موصوف فائز شود، عند الدرخواست بلا توقف و تعذر سپرد نمائند و استعانت و حمایت بہ لطائف الحیل بہ میاں نیارند۔

دفعہ (۳) علاقہ داران سرکار کمپنی انگریز بہادر سرکردہ جمعیت پلاٹن ....عہ سواران و اضراب رہکلہ معمولی، ہمراہی پلاٹن، و ساز و سامان جنگی بدون حصول پروانۂ راہ داری مہر خاص با نشانی کار پردازان سرکار آصفیہ عالیہ جانشین دربار حیدرآباد در سرحد ممالک محروسہ تعلقہ متعلقہ بہ کسے ذریعہ نروند، و خلاف عہدیہ در کسے زمان پیش قدمی نہ نمائند۔

دفعہ (۴) سرکار آصفیہ عالیہ جانشین دربار حیدرآباد برائے تنبیہ مفسدان حوالی و جوانب پیش گزران اقلیم دکن اگر برائے اشتراک خود جمعیت سرکار کمپنی انگریز بہادر درخواست فرمائند، و بعد ملحق شدن ہر دو معسکر فیروزی اگر اضراب توپ کلاں با ساز و سامان از سرکار معز موصوف درخواست کردہ باشند، بعد انفصال مقدمات مجادلات بہ وقت رخصت جمعیت مذکور اضراب مذبور واپس کردہ رسید حاصل سازند۔

دفعہ (۵) بہ وقت مصالحت مجادلت تنبیہ پیش کش گزاران حوالی و جوانب ممالک محروسہ سرکار آصفیہ عالیہ جانشین دربار حیدرآباد اول بہ دفعات مشروط بہ مہر و دستخط محضر عہدیہ روانہ کردہ پس ازاں روانگی جمعیت سرکار کمپنی انگریز بہادر بہ عمل آریم، و بعد انفصال معاملہ و با استقبال بہ کسے ذریعہ زیادہ طلبی و خلاف مرقومہ بہ دفعات شروط مذکور نہ خواہیم کرد۔

دفعہ (۶) ہر چہ کہ از نقد و اسباب و آلات و ادوات و تعلقہ جات ہم دست شود، در حالت شراکت بلا درخواست اخراجات فوج کشی باہم دیگر حصۂ مساوی بلا خس و پیش، نصف نصف حصہ فی مابین بلا تکرار بہ رضامندی و خوشنودی طرفین تقسیم کردہ بگیریم، و بکسے ذریعہ از کسے سمت حرفے زیادہ طلبی بہ میاں نیاوریم۔

دفعہ (۷) بہ ہر وقتے کہ برادران و خویشان و چہ کار پردازان سرکار آصفیہ عالیہ جانشین دربار حیدرآباد بہ نظر خام طمعی و کوتہ اندیشی و ناقباحت فہمی با علاقہ داران سرکار کمپنی انگریز بہادر بہ نظر سود و بہبود و خود سررشتۂ رسل و رسائل نمایند، بہ مجرد اطلاع ایں معنی ہموں وقت، بلا توقف و تامل در سرکار معز موصوف روانگی آں بہ عمل آریم۔

دفعہ (۸) اگر از افترائے جبل سازاں بدخواہ سرکارین بہ کسے سمت خلاف عہدیۂ قرطاس مہری نمودار شود، آں را ملاحقۂ تحقیق و تدقیق کردہ کہ شائبہ توہم نباشد از سرحد ممالک محروسہ خود آں را بیرون نمایند، زنہار زنہار غبار کدورت را بر حاشیہ خیال راہ نہ دہند، و افترا و اظہار غلط گویاں را فی مابین قرین صدق نفرمایند۔

دفعہ (۹) وقتے کہ در عوض تنخواہ پلاٹن متعینہ سرکار جانشین دربار حیدرآباد محال "گنٹور" و "جٹ پول" کامل دوازدہ لک و سی ہزار و شش صد و

عہ یعنی اصل کتاب میں ۱۲

عہ نقل موجب اصل ۱۲

سی وشش روپیہ و پنج ونیم آنہ بموجب سند مہری با نشانی کارپردازان وعلاقہ ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز بہادر آمدہ بود بعد انتقال شجاع الملک امیرالامراء قبول کرد، وسرکار معز موصوف آن امر مجوزہ را بند وبست عمل ودخل خود را در محال مسطور . . . . (ختم ؟) عـ۵

دفعہ (۱۰) محال راج بندری وسیکاکول، بہ وصول کامل پانزدہ لک وشش ہزار وسی صد وپنجاہ لک روپیہ دوازدہ ونیم آنہ بہ مشروط پیش کش گزاری ہفت لک ولبت و پنج ہزار روپیہ سالیانہ، سال بسال ہلالی بلا تعذر و توقف در سرکار آصفیہ عالیہ جانشین دربار حیدرآباد درسانیدہ باشیم در مقدمہ رسانیدن رقم مقررہ پیش کش سالیانہ سال بسال تعذر و توقف نہ خواہم کرد۔

دفعہ (۱۱) ودر کسے زماں بہ کسے ذریعہ سرکار کمپنی آنریبل انگریز بہادر امر مجوزہ معافی رقم پیش کش راج بندری وسیکاکول انچہ کہ سالیانہ سال بسال قرار یافتہ است از سرکار آصفیہ عالیہ جانشین دربار حیدرآباد نہ خواہم کرد۔

دفعہ (۱۲) عند الدرخواست افواج سرکار آصفیہ عالیہ بہ وقت اشتراک روانگی افواج سرکار کمپنی انگریز بہادر در نواح ہندوستان برائے تنبیہ بدخواہاں، واستیصال مفسدان قرار یابد از ابتدائے کوچیدن جمعیت سرکار جانشین دربار حیدرآباد تا بروز رخصت فی سوار ہشت آنہ وفی پیادہ چہار آنہ سوائے حصہ مساوی جملہ در فتوح اسباب وادوات واز نقدی وتعلقات بلا تکرار رسانیدہ باشیم، درین ضمن اگر گرانی غلہ بہ ظہور یافتہ ورسد غلہ بر وقت نہ رسیدہ، ودر ایام گرانی غلہ فی روپیہ پانزدہ آثار، فی سوار شش آثار، وفی پیادہ یک آثار غلہ بلا توقف رسانیدہ باشیم، اگر غلہ ہمراہی معسکر فیروزی یا فوج کفاف نہ کند وجہ قیمت غلہ بموجب نرخ روزینہ زر نقد بدہیم، ودر حصۂ مساوی مجرا ومحسوب نخواہم گرفت۔

دفعہ (۱۳) بموجب آئین ریاست ہمہ سلطنت بیدار تحال مسند نشین کرسی بہ کرسی بطناً بعد بطن مہین پور ریاست را بر مسند ارثی پدری بجائش مرحوم و مغفورہ بلا توقف وتامل تریک حال ماندہ مسلط کردہ ونظر برگفتہ وابستگان پسماندگان مرحوم ومغفورہ وچہ متعلقان محل اندرون، وچہ برادراں وچہ فرزنداں وچہ کارپردازان بیرون وغیرہ نہ داشتہ ودر گوشش خود جا دادہ ودر حق السعی شکر یہ ویا بطور ضیافتانہ در جلدوے کارنمایان وانعامے درمے وپرگنات تعلقہ متعلقہ بہ کسے ذریعہ درخواست نہ کردیم۔ اگر برضا ورغبت خود مسند نشین تواضع فرمایند، نخواہم گرفت۔ اگر بنظر استعانت کسے فرزندان وبرادران مرحوم مغفورہ وتعلقداران وزمین داران وسرکردۂ جمعیت حوالی وجوانب باہم متفق گشتہ خلل اندازی در مسلط شدن مہین پور مرحوم مغفورہ بر مسند ارثی وپدری روبکار بمقابلہ ومجادلہ آرند، بکوشش تمام بدل متوجہ تنبیہ اوشاں کما حقہا کردہ استحکام وانتظام مسند نشین بہ قرار واقعی ساختہ در ہمہ حال استعانت اوشاں پیش نہاد خاطر خود منظور ومقدم داریم۔ ودر جلدوے تردات نمایاں وکارہائے نمایاں چیزے در وجہ اخراجات فوج کشی، درخواست نخواہم کرد، ونہ خواہم گرفت وقتیکہ وسادہ نشین خلاف آئین ونقیض مسند نشینان دیگران اختیار ظلم رانی در بلدہ یا در تعلقہ متعلقہ خود دست تظلم دراز کردہ رنج رسانی رایع برایع حضرت رب العزت جل شانہ، تعالیٰ برخود جائز داشتہ، گواہ ساختہ دراں وقت بہ نظر پاسداری اشتراک چند بار فہمانیدہ اگر برگفتہ علاقہ داراں سرکار عظمت مدار کمپنی آنریبل انگریز بہادر، دست تظلم بر خلق اللہ کوتہی پذیرفتہ بدستور سابق بحال وبرقرار بر وسادۂ موروثی پدری خود ماندہ بہتر، واگر تغافل بظہور یافتہ بمجرد مشاہدہ ومعائنہ بد روشی آں را معزول ساختہ در کنج عزلت جا دادہ بجائش کسانیکہ لائق حکم رانی از برادران وچہ فرزندان کسے کہ لائق حکمرانی ایں جا باشد مسلط خواہم کرد، وتا خلق اللہ ہمہ وابستگان بآسودگی تمام باشند۔

بدیں مشروط تہہ نامہ جات فی مابین قرار یافتہ نوشتہ دادہ شد وگرفتہ شد تحریر فی التاریخ ہفدہم ماہ رجب المرجب ۱۱۹۶ھ یکہزار ویک صد ونود وشش ہجری۔

وکیل دوم میر حسین علامہ

دوسری محرم ۱۱۹۵ھ کو مختار ہوئے، میر صاحب موصوف بڑے دانشمند تھے۔ کہتے ہیں کہ پندرہ سال کی عمر میں علوم عربیہ سے فراغت پائی، ذکاوت طبع کا یہ عالم تھا کہ طالب علموں کو درس دیتے وقت کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کرتے، جو کتابیں پڑھیں وہ حفظ تھیں، ازبر تقریر کے عادی، آشنا پرستی، اور ارباب کمال واہل سخن کی قدردانی بے حد ملحوظ خاطر تھی، غربا نوازی، سادات وفقرا پروری میں یکتائے عصر، فصاحت وبلاغت میں نادر زمانہ، فراخ درویشانہ، اہل بیت کرام

عـ۵ نقل موجب اصل ۱۲

علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت حد درجہ رکھتے تھے۔

لارڈ بہادر کلکتہ کا ایک خریطہ اس مضمون کا حضور پرنور کی بارگاہ میں پیش کیا کہ :۔

سرکار گنٹور کی ضبطی کے لئے وہاں کے حاکم کے نام حکم آیا ہے، امید کہ حضور والا اس کی گزاشت عنایت فرمائیں گے، اس لئے کہ یہاں خلق خدا کا خون خرابہ نہ ہو جائے۔

حضور پرنور سے حکم صادر ہوا کہ :۔

ان دنوں راجہ سورج ونت بہادر اپنے مکان سے باہر آنے کے لئے معذور ہیں، اٹھوارے بعد حاضر دربار ہوں گے۔

دوسرے دن، تعلقہ دار کی عرضی، لارڈ بہادر کا خریطہ، گنٹور کے اخبار نظر انور سے گزرے کہ تعلقہ گنٹور وغیرہ میں کمپنی کی جانب سے بندوبست ہو گیا ہے۔ اس کے سنتے ہی حضور پرنور نے خریطہ کا جواب مرتب کر کے کلکتہ روانہ کرنے کے لئے میر صاحب موصوف کے پاس ارسال فرمایا۔

بھگندر میں مبتلا ہونے کی وجہ سے میر صاحب نے پارہ کھایا تھا، حدت گرمی سے سارا جسم ٹھیک گیا۔ حضور پرنور سے ناموافقت آب و ہوا کا عذر کر کے رخصت چاہی اور کلکتہ چلے گئے۔

وکیل سوم مسٹر مین سن بہادر

مسٹر جان سین بہادر کی جانب سے آخر ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۰۸ھ میں کلکتہ سے بلدۂ حیدرآباد آئے۔ جس دن مسٹر مین سین بہادر، مسٹر جان سن بہادر کی جانب سے شمشیر جنگ بہادر کے باغ میں ٹھہرے، اس کے دوسرے دن میر عالم بہادر نے استقبال کے لئے جا کر اپنے ساتھ انھیں لیا، اور حضور پرنور کی بارگاہ میں باریاب کرایا۔ حضور پرنور کے ملاحظۂ انور میں لارڈ بہادر و مسٹر جان سن بہادر کے خریطے پیش کئے، اور رخصت لے کر اپنی قیامگاہ کو واپس ہوئے۔ اس کے بعد روانگی کے وقت حضور پرنور کی پیش گاہ سے خریطہ کا جواب انھیں عنایت فرمایا گیا، اور یہ حیدرآباد سے کلکتہ روانہ ہو گئے۔

وکیل چہارم

مسٹر جان کنوی، مخاطب دلاور جنگ، ساتویں ذی حجہ سنہ ۱۲۱۱ھ ہجری کو کلکتہ سے بلدۂ حیدرآباد آئے جس دن سے کہ یہ صدر عالیہ کلکتہ سے خدمت وکالت پر مامور ہو کر آئے، سرکار عالی کی رفاقت رضا جوئی، اطاعت کیشی کی بدل کوشش وسعی میں مصروف رہ کر طالب وقت رہے، اسی زمانے میں فتح علی خاں بہادر، ٹیپو سلطان کے وکلا، قطب الدین خاں و مہدی علی خاں حضور پرنور کی دختر نیک اختر کے لئے (ٹیپو سلطان کے لڑکے کا) پیام لے کر آئے۔ حضور پرنور نے ان کی آمد کی وجہ معلوم کر کے انھیں سری رنگ پٹن واپس چلے جانے کا حکم صادر فرمایا، اور ساتھ ہی، یہ تجویز بھی قرار پائی کہ کمپنی انگریز بہادر، اور راؤ پنڈت پر دہان (مہار سہ سرکار) کی شرکت مساویانہ میں سری رنگ پٹن پر فوج کشی کر دینی چاہیئے۔ اس منصوبہ کی صلاح فلاح میں مسٹر جان کنوی شریک حال تھے۔ اس لئے دلاور جنگ کا خطاب پایا۔ سہ ہزاری منصب ملا۔

راجہ گوبند بخش بہادر کے استصواب سے پچاس ہزار سوار مع توپخانہ راؤ پنڈت پر دہان، ہری بابا پھڑکیا کی سرکردگی میں، اور جان کنوی دلاور جنگ بہادر

کے استصواب سے گورنر جنرل لارڈ ولزلی بہادر، و جیرر (؟) صاحب بہادر، و مینڈس صاحب کی سرکردگی میں پچاس ہزار کی جمعیت اعظم الامرا (ارسطو جاہ) اور تمام راج بہادر کے ساتھ مرشدزادہ بلند اقبال سکندر جاہ بہادر کی سرکردگی میں رہی۔ چنانچہ جنگ کے تصفیہ کی کیفیت مفصلاً لکھی جا چکی ہے (یعنی اصل کتاب میں) اسی ذریعہ سے شہر کے لوگوں نے انگریزوں کی صورت دیکھی اور متحیر ہو گئے۔

قلعۂ سری رنگ پٹن کے نیچے پہنچنے کے وقت کی ایک نقل ہے کہ :۔

جس دن یہ تینوں لشکر قلعۂ سری رنگ پٹن کے نیچے پہنچے اور مورچال قائم کرنے کے لئے انگریز افسروں نے ایک کوس کے فاصلے سے بہ ذریعہ دوربین مقام کا انتخاب کیا، مورچے تیار کر کے ساڑھے چار سو توپیں رکھیں، اور مورچہ کے سامنے سید عبد الغفار خاں کی سرکردگی میں چار ہزار جوانان بار سلح جنگ کے لئے تیار رہیں، مورچہ کے سامنے اور اطراف کیچڑ اور دلدل بنائی گئی ہے، اور اس میں ببول اور لوہے کے گوکھرو بچھا دئے اور اس پر ایسی سبزی اگائی کہ گویا موسم بارش نے گل ولالہ اگا رکھا ہے۔ انگریز افسروں نے اس حقیقت سے واقف ہو کر ہی یہاں پڑاؤ ڈالا تھا، ایک گھنٹہ چار گھڑی رات باقی تھی کہ تیرا ہزار جوانان پلاٹن سوتجر دو ہزار عہدہ دار اور ایک سو توپیں اپنے ساتھ لے کر اس دلدل پر پہونچے۔ ساتھ کے جوانوں کو حکم دیا کہ اس دلدل پر کنکر پتھر ڈال کر یہاں تک خشک کر دیں کہ ایک سو گز چوڑی سڑک، تیار ہو جائے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں جوانوں نے ہاتھوں ہاتھ سڑک کو مورچہ تک پہونچا دیا۔ اس وقت پہرہ والے جوان نے پوچھا۔ فتح علی خان بہادر کی فوج کی وردی کے مطابق پوچھنے والے کو جواب ملا جب کہ توپ خانے اور جمعیت کے ساتھ پیش قدمی کر کے انگریز بہادر نقشۂ جنگ کے قریب پہنچے۔ اس وقت پہرہ والے جوان نے مورچہ پر پہونچ کر بندوق سرکی، بندوق سر ہوتے ہی گولندازوں نے تمام توپوں کو بتی لگا دی، اس کے بعد انگریز بہادر کی جانب سے توپیں دغنے اور بندوقیں سر ہونے لگیں، دونوں جانب سے خوب دنادن چلنے لگی، چار گھڑی کے عرصہ میں لاکھوں جان لیوا گولے، اژدہے کی طرح توپوں کے منہ سے باہر نکل پڑے۔

سید عبد الغفار خاں کی سرکردگی میں فتح علی خاں بہادر کے جو چار ہزار جوانان بار کی پلٹن تھی، ان سب کے سب نے شہید ہو، ہمیشہ کے لئے سرخ روئی حاصل کر کے جوار رحمت میں جگہ پائی، ان میں ایک جوان بھی باقی بچ کر بھاگا نہیں۔ انگریز بہادر کے آٹھ ہزار گورے اور چار سو چالیس افسر موت کے گھاٹ اترے قلعہ کے حصار پر سے فتح علی خاں بہادر اس وقت یہ مردانہ خون ریزی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جب صبح ہوئی تو میدان قتل گاہ پر آ کر فتح علی خاں بہادر نے حکم دیا کہ شہیدوں کو، دلدل سے گن گن کر نکالیں، اور سپرد خاک کریں۔ تب معلوم ہوا کہ چار ہزار جوان قوم "کورگ" کی پلٹنوں سے تھے، جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور قریبًا تین ہزار دوسرے جوانوں نے بھی اس معرکہ میں جام شہادت پیا۔ چار گھڑی دن نکل آنے کے بعد کامل صلح ہو گئی کہ ایک سال دو کروڑ چالیس لاکھ بیظر دو قسطوں میں جس کی پہلی قسط اٹھوارے کی مدت میں ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کی، دوسری قسط ایک کروڑ بیس لاکھ کی ایک سال کے بعد، اور ایک تعلقہ ایک کروڑ پچاس لاکھ کا۔

چار گھڑی کے بعد بندربئی کے سردار آٹھ ہزار فوج اور بے شمار توپ خانے کے ساتھ آئے۔ گورنر جنرل کارنوالس بہادر سے ملاقات کرنے پر معلوم ہوا کہ شرائط مندرجہ بالا پر کامل صلح ہو گئی۔ "جیرر صاحب" سردار جمعیت بی

نے کہا کہ وہ اس جانب بڑے اشتیاق سے جنگ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ "زار صاحب" (؟)، کو جنگ کرنی منظور نہیں۔ مجھے حکم ہو چار گھڑی میں جنگ کا خاتمہ کئے دیتا ہوں، اس وقت انگریز بہادر نے "جیر صاحب" (؟) کو سمجھایا کہ اگر اب آپ جنگ کا خاتمہ بھی کردیں تو بھی تینوں سرکار برابری کا حصہ لیں گے۔ اور کمپنی کی فوج ضایع جلئے گی۔ اور اگر فتح علی خاں بہادر کی فوج کا امتحان منظور ہے تو مضائقہ نہیں کل امتحان کرلیجئے۔

دوسرے دن بارہ ہزار پلاٹن بار نے توپ خانہ سے مسلح ہوکر قلعہ کے نیچے نقشۂ جنگ جمایا، اور دوسری فوجیں فاصلہ بہ فاصلہ تماشائیوں کی طرح کھڑی کردی گئیں انگریز بہادر کی بارہ ہزار کی پلٹن، اور اس کی کمک پر راؤ پنڈت پردہان کی پچاس ہزار سوار کی جمعیت وہاں نے نقشۂ جنگ کے مطابق کھڑی تھی جس وقت انگریز بہادر کی پلٹن نے بندوقیں چلائیں، فتح علی خاں بہادر کی پلٹنیں بیٹھ گئیں اور جب اس نے بندوقیں سرکیں تو انگریز بہادر کی پلٹنیں حسب قواعد بیٹھ گئیں۔ بارہ مرتبہ انگریز بہادر نے فتح علی خاں بہادر کی فوج کے کام کو پسند کیا، مردانہ وار دونوں جانب کی فوجیں اپنی اپنی چھاونی میں حکمت عملی کے ساتھ واپس ہوئیں (گویا یہ جنگ مصنوعی تھی) اس کے بعد بندر لمبی کے "صاحب بہادر" جو جاہل مطلق تھے اپنے آپ کو تپنچہ کا نشانہ بنالیا کہ اس قدر اشتیاق کے ساتھ بندر لمبی سے جنگ کے لئے سری رنگ پٹن آیا، میرے پہنچنے سے پہلے ان تینوں سرکاروں میں صلح ہوگئی، اب زندگی کا کیا لطف باقی رہا، کہا اور اپنی جان تپنچہ کے نذر کردی اس واقعہ جانفرسا کی اطلاع پاتے ہی افسران انگریز بہادر اور دوسرے سننے والوں نے اس خودکشی کو ایک جہل تصور کیا، اور کہنے لگے کہ اگر یہ شخص جنگ میں بھی شریک رہتا تو اپنی جان سے جاتا۔ لشکر فیروزی کی واپسی پر تمام ملک میں ایک بڑا قحط پڑا۔ اس ایک سالہ قحط میں بہت سے قریئے اور دیہات ویران اور بے چراغ ہوگئے، جو لوگ لشکر میں تھے، ان کو وہاں پانچ روپئے سیر اناج کھانا پڑا۔ ہزارہا گھوڑے ضائع ہوئے، اور ہزاروں آدمی صاحب ثروت ہوکر ذی مقدور ہوئے دلاور جنگ بہادر رخصت لے کر کلکتہ کی طرف چلے گئے۔

وکیل پنجم

مفخر الدولہ بہادر کلکتہ سے حیدرآباد آئے، اور ان سے کوئی کام نہیں ہوا، جس دن مفخر الدولہ بہادر کلکتہ سے گورنر جنرل کا خریطہ لے کر بلدہ پہنچے، شمشیر جنگ بہادر کے باغ میں اترے، دوسرے دن میر عالم ملاقات کے لئے گئے۔ چار گھڑی کے بعد مفخر الدولہ بہادر نے حضور پُرنور کے دربار میں حاضر ہوکر گورنر جنرل کا خریطہ گزرانا، اور خریطہ کا جواب حاصل کرکے لارڈ بہادر کی جناب میں روانہ کیا۔

جس وقت حضور پُرنور راؤ پنڈت پردہان کی تنبیہ کے لئے پونہ کی جانب توجہ فرماکے قلعہ بیدر میں اتمام حجت کی غرض سے ٹھہر کر موضع کم تہانہ میں جو قلعہ سے چار کوس کے فاصلے پر واقع ہے، سیر و شکار میں مصروف تھے۔ مفخر الدولہ بہادر نے ناموافق آب و ہوائے دکن و ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے رخصت لی، اور خود کو بمبئی پہنچا کر وہاں سے کلکتہ گئے، اور دوسرے کاموں پر مامور ہوگئے۔

وکیل ششم

آخر ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۰۷ہجری کو، کرک پیاٹرک حشمت جنگ بہادر کلکتہ سے آکر موضع کم تہانہ قریب قلعۂ بیدر میں حضور پُرنور کی بارگاہ میں حاضر ہوئے

کرک پیاٹرک، حشمت جنگ بہادر، مفخر الدولہ، موتمن الملک، صاحب عالی شان، سرکار انگلش عظمت نشان آنریبل کمپنی انگریز بہادر والا شان صاحبان عظیم الشان کونسل خاص (مشیر قانونی) صدر عالیہ لارڈ بہادر کلکتہ کے فرستادہ قائم مقام جنرل بہادر، یہاں پہونچ کر راؤ پنڈت پردہان وسندھیا بہادر، ورگھوجی بھونسلہ وہولکر بہادر کی معرکہ آرائی میں حضور پُرنور کے رکاب نصرت انتساب کے ساتھ رہے، چاروں سرداران نامدار کا لشکر تین لاکھ سوار سے زیادہ تھا، وہاں سے اعظم الامراء (ارسطوجاہ) بہادر پونا گئے، حضور پُرنور قلعہ کھرڈلہ سے واپس ہوکر اپنے قدوم میمنت لزوم سے شہر و اہل شہر کو رونق بخش کر داخل دولت سرا ہوئے۔

اس وقت حشمت جنگ بہادر شمشیر جنگ بہادر کے باغ میں فروکش رہے، عہدۂ مدار المہامی اور امور دیوانی بطور امانی پیش گاہ حضور پُرنور سے ممتاز الامراء بہادر سرفراز ہوئے۔ جس وقت کہ مرشد زادۂ آفاق عالی جاہ بہادر نے بعض ناعاقبت اندیشوں کے ورغلانے پر (بغاوت کے خیال سے) دسویں ماہ ذیحجہ ۱۲۰۹ھ کی شب میں یعنی راتوں رات شہر سے نکل کر اپنے آپ کو اورنگ آباد تک پہونچایا، اور وہاں اپنی ناکامی کی شرم سے (کچھ کھاکے) خود کو ہلاک کرلیا، ان کا

لاکر غسالوں نے ..... شہر کے باہر دفن کر دیا۔

ان دنوں حضور پُرنور بہ نفس نفیس امور مملکت میں متوجہ تھے، کہ یکایک بائیں شق پر فالج گرا۔ اس بیماری کے صدمے جھیل رہے تھے کہ ممتاز الامراء بہادر نے پیش قدمی کرکے اپنی ممتازیت اس طرح شروع کر دی۔

حسام الدولہ بہادر عرض بیگی کو علٰحدہ کرکے ضیاء الملک بہادر کو حضور پر نور سے خدمت عرض بیگی پر سرفراز کرایا، اور پانچ ہزار روپے کا نذرانہ خود لکھوالیا۔ صوبۂ حیدرآباد کے انعامداران اراضی آٹھ لاکھ کے تھے ان کو ضبط کر لیا، اور بڑی حکمت عملی سے موسی ریمو انتزار الدولہ بہادر سرگروہ کا ماٹیان خاص کو آگاہ کر دیا کہ اپنے معاملات میں راجہ مہیپت رام سے ذرا ہشیار رہیں، اور راجہ مہیپت رام کو سمجھایا کہ اپنے آپ کو انتزار الدولہ بہادر سے مطمئن نہ رکھیں، کیونکہ انھوں نے اپنی کاربردازی کے لئے کسی اور کو تجویز کر رکھا ہے۔ اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہی اگر بندوبست ہو تو اچھا ہے، ورنہ بعد کو کچھ نہ ہوگا۔ ان کے اس فریب سے دونوں کے سینہ میں کینہ پیدا ہوا، اور بجائے خود دونوں حیران و پریشان تھے۔ چوتھے دن راجہ مہیپت رام موسی ریمو کے پاس پلاٹن کا ماٹیاں کی تقسیم ماہوار کی افراد کے کر گئے اُنھیں[۵] ....

اسی وقت موسیٰ ریمون کے باورچی کو روپے کا خوب لالچ دلا، سازش کی اور زہر کھلوا دے کر مطلق العنان ہو گئے۔ بہ ظاہر دسویں دن موسی پیرو اور دوسرے کمیدانوں کو زرخلعت سے سرفراز فرما کر مختار کار رہے، اعظم الملک بہادر سرکردۂ پائیگاہ خاص کو قلعہ میں قید کرا دیا۔ قریب تھا کہ مختاریت کا دعوے کر بیٹھے کہ ـــ حضور پرنور نے محل مبارک میں اپنی زبان فیض ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا کہ "تین باتیں میرے دل میں ہیں، ان کا پورا ہونا نہایت ضروری ہے، ایک یہ کہ انگریز بہادر مابدولت کے ملک سے چلے جائیں، دوسرے یہ کہ اعظم الامراء بہادر (ارسطو جاہ) پونہ سے آجائیں، تیسری یہ کہ میں فالج سے اچھا ہو جاؤں۔"

چنانچہ حسب الحکم حضور پرنور ممتاز الامراء بہادر نے حشمت جنگ بہادر کو رخصت کر دیا، پونہ سے اعظم الامراء (ارسطو جاہ) بہادر شہر میں پہونچنے کے بعد سے جو کچھ پیش آیا وہ مفصلاً لکھا جا چکا ہے (یعنی اصل کتاب میں)

اعظم الامراء بہادر ارسطو جاہ کے انتقال کے نو ماہ بعد میر عالم بہادر کو دیوانی کی خدمت ملی تھوڑے ہی عرصہ میں میر عالم بہادر نے بہ ذریعۂ محضر خیر النساء بیگم صبیہ عاقل الدولہ بہادر حشمت جنگ بہادر تبادلہ کرا کے ان کی جگہ کپتان طامس سڈن نام کو کلکتہ سے بلوایا۔

وکیل ہفتم

صاحب عالی شان، کپتان طامس سڈن نام بہادر، میر عالم بہادر مختار دولت آصفیہ کی درخواست پر ۱۲۲۱ھ کے اوائل میں کلکتہ سے بلدۂ حیدرآباد فائز ہو کر کوٹھی میں ٹھہرے۔

جس دن سے کہ کپتان طامس سڈن نام بہادر میر عالم بہادر کی درخواست پر کلکتہ سے آکر کوٹھی میں اترے، میر عالم بہادر اور ان میں اتحاد دلی اور یک دلی کا سررشتہ قائم رہا۔ مسٹر سڈن نام سے وکالت پر مامور رہنے تک، ان سے ایک بھی حرکت میر عالم بہادر کے خلاف رائے سرزد نہ ہو سکی۔ راجہ مہیپت رام بے شک وشبہ بہی خواہ دولت تھے، جو میر عالم بہادر کی مصلحتوں میں شریک رہے، بہ صیغۂ انتظام میر عالم بہادر نے انھیں ٹھہرے

[۵] اصل عبارت صاف پڑھی نہیں جاتی، یہ موقع قیاس سے کام لینے کا بھی نہیں۔ ۱۲

قلعۂ شاہ پور کو روانہ کیا، یہ وہاں جا کر ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے کہ ان پر ایک لشکر جرار متعین کیا گیا کہ ممالک محروسۂ سرکار عالی کی سرحد سے باہر کر دئے جائیں۔

جب راجہ مہیپت رام سے مقابلہ پیش آیا تو (انھیں) فتح نصیب ہوئی۔ اس کے بعد انگریز بہادر کی فوج متعین کی گئی، لیکن اس کی مجال نہ تھی کہ وہ دو گھڑی بھی میدان کارزار میں ٹھہر کر جنگ کر سکے۔

میر عالم بہادر نے مسٹر سڈن نام سے اتحاد و موافقت پیدا کرکے جو کچھ انھیں سرفراز کرایا اور حسن سلوک سے پیش آئے اس کی قدر نعمت یہ ہوئی کہ ان احسانات کو انھوں نے بالائے طاق رکھکر ایک بھی خیر خواہی کا کام نہ کیا، بلکہ بہت ساری خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

میر عالم بہادر نے اپنے معروضہ کے خلاف معاملات ریاست میں بڑی بڑی قسموں کے ساتھ جو کچھ نواب مغفرت منزل (سکندر جاہ) سے عرض کیا تھا اکو منتقم حقیقی کی بارگاہ سے اپنا کیا آپ پایا۔

اس کے بعد مسٹر سڈن نام بہادر اپنے منشی مسمی ابن علی کے ساتھ کلکتہ جانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابن علی بڑے نیک آدمی تھے، انھوں نے کسی کے بھی حق میں کوئی برائی نہیں کی، کلکتہ جاتے وقت میر عالم بہادر کے انتقال (۱۲۲۳ھ) کے بعد نیابت کی حیثیت سے "رسل و رسائل" کا جو اسباب کوٹھی میں تھا، اس کو چھوڑ دیا، اور انھوں نے راجہ چندو لعل سے موافقت پیدا کر لینے میں مصلحت سمجھی۔

وکیل ہشتم

غارت گر ممالک محروسہ، شریک راجہ چندو لعل بہادر، ہنری رسل ثابت جنگ بہادر دوسری محرم ۱۲۲۵ ہجری کو پونہ سے کوٹھی میں داخل ہوئے۔

ہنری رسل پونہ کی وکالت پر مامور تھے، نور الامراء بہادر اورنگ آباد میں راجہ گوبند بخش بیند رہ ہزار جمعیت ضلع داری کی سرکردگی پر چالیس لاکھ کے تعلقہ کے ساتھ سرفراز و ممتاز تھے۔ راجہ چندو لعل بہادر نے حیدرآباد کے انتظام و اہتمام اور اپنی "خود مختاری" کے لئے ہنری رسل سے وہاں "سازباز" شروع کی، اور انھیں پونہ کی وکالت سے موقوف کرا کے سرکار عالی کی وکالت کے لئے طلب کرایا۔

نواب مغفرت منزل کی بارگاہ سے ثابت جنگ بہادر اعتماد الدولہ، انتظام الملک نائب جانشین دربار حیدرآباد کے خطاب و القاب کے علاوہ سہ ہزاری منصب دلوایا۔

راجہ گوبند بخش بہادر کو لکھ بھیجا کہ نور الامراء بہادر کو لے کر صاحب عالیشان کے ساتھ چلے آؤ۔

اس کے بعد "رسول خانی" میں "تصفا نصفی"

کی تقسیم کی قرارداد ملک کی تباہی

اور رعایا کی بربادی کا

نہایت درشت الفاظ

میں ذکر سے لکھا ہے۔

.... اسی طرح تمام چھوٹے وبڑے تباہ وتاراج رہے، جن پرگنوں کا محصول ایک روپیہ وصول ہوتا، بعض محالات سے چہارانی وسہ انی، اور تعلقہ جات راجہ چند ولعل بہادر سے جو نو کروڑ روپے وصول ہوتے تھے، ان کی ویرانی اس حد تک پہنچی کہ ان تعلقات سے ایک کرور تیس لاکھ روپے، بعد وضع اخراجات تحصیل داران ہاتھ آنے لگے۔

مٹکف بہادر، عادل دوراں کی آمد آمد کی خبر پر یہ "........ "جاتے وقت دو کروڑ چالیس لاکھ روپے لے گیا، اور دلال و رشوت خوار جن کا مقام جہنم ہے، ان میں سے ہر ایک لکھو کھا روپیہ پیدا کرکے اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اور خود اس غارتگر جہاں نے جاتے وقت راجہ چند ولعل بہادر سے کہا کہ تباہی وویرانی کے باعث کسی گاؤں میں بھی "بیگار" نہیں ملتے۔ اب مناسب وقت یہ ہے کہ "گاؤں، گاؤں" یہ منادی کرادی جانی چاہیے کہ بیگار موقوف ہوگئی ہے، اپنے اپنے مواضع میں اطمینان خاطر سے رہیں۔

ٹیکا رام نامی ایک منقری خدمت گار تھا (چپراسی) سات لاکھ روپے لے گیا اور ایک رحیم خاں ہندوستانی تھا جس نے ہندوستانیوں کے ساتھ بڑی بڑی خیانتیں کرکے تین لاکھ روپے ہاتھ کئے، ہندوستان روانہ کرکے گیا اور وہاں مرگیا۔

(ہنری رسل بہادر) اپنی روانگی کے وقت سکندرآباد عرف "حسین ساگر" کا معاف شدہ محصول اجناس رقمی آٹھ ہزار ماہوار اور محصول باعث رقمی آٹھ ہزار ماہوار جملہ سولہ ہزار روپے ماہوار سرکار میں داخل کرکے تمام ممالک محروسہ کی رعایا کی وبال آہ کا قافلہ اپنے ساتھ لے کر کلکتہ گئے۔

"ظالمے را خفتہ دیدم نیم روز"

وکیل نہم

اکیسویں صفر ۱۲۳۶ ہجری کو کلکتہ سے چارلس تھیافلس، مٹکف بہادر، اخلاص یار خاں، صولت جنگ منتظم الدولہ، انتظام الملک، کوٹھی میں فائز ہوئے۔

سبحان اللہ، رعایا پر جس طرح ظلم وستم ڈھا کر اور ملک کی بربادی کرکے کلکتہ کی جانب گئے، اور اس کی بجائے مٹکف بہادر "عادل زماں" عالم کو پالنے والے کوٹھی میں فائز ہوئے۔ بس اسی روز سے ممالک محروسہ اور رزیڈنسی میں دست تعدی اٹھنے لگا، اور آفتاب عدل کے طلوع کے ساتھ ہی، حق تلفی کی گم گشتہ راتیں، غریب آزاری کا بھولا ہوا سبق، سرکار آصفیہ عالیہ کی بہی خواہی میں شروع ہوگیا، آبادی ممالک محروسہ کی بندوبست کے لئے بذات خود تکلیف سی برداشت کرکے متوجہ ہوگئے، جو کچھ "گاؤں گاؤں" رعایاء نے ہر ایک تعلقہ میں اپنی زبان سے اقرار کیا اسی کے مطابق مقدمان وپٹواریوں کی قبولیت، زمینداروں کے مقابلے میں لی، چاروں سمت ہر تعلقہ اور اس کے ہر ایک محالات میں زیادہ ستانی کے لئے نائب سرکار کی حیثیت سے انگریزوں کو ضلع دار مقرر کرکے، آبادی کا نقشہ جمایا گیا، مگر سالہا سال کی ابتری اور ظلم وبا کے باعث رعایا کی آبادی نہ ہوسکی۔ سرکار عالی کا ہر سال ایک کروڑ اور چند لاکھ روپے کا نقصان ہونے لگا۔ اور مہاراجہ بہادر (چندولعل) نے اپنی عنایت بے غایت سے ولیم پامر کو بڑی رعایتوں کے ساتھ کوٹھی سرفراز فرمائی۔

ولیم پامر نے طرح طرح کی مکاریوں سے مہاراجہ بہادر کے ذمہ ایک کروڑ اور چند لاکھ روپے کا قرض مع سود عائد کیا۔ اور سواران رعایتی کی تنخواہ جو پینتالیس ہزار روپے ماہوار کی مقدار میں تھی، اور اس کے سوائے درمیانی مفتریوں نے ہزارہا روپے ماہوار سواروں کے ذریعہ سے کر اپنے پاس "ایک گدھا" بھی نہ رکھا۔

سود اور رشوت میں لاکھوں روپے حاصل کرکے، ان کمینوں نے اپنی شرافت کا ڈنکا بجایا۔ اس کے بعد سرکار مہاراجہ بہادر نے پرگنوں کو قبضے میں لے کر لکھو کھا روپیہ فراہم کرکے ولیم پامر کے قرض کو اپنے پاس سے یکمشت ادا کیا۔ اس سے "محلکہ" لکھوا کر سرکار کمپنی انگریز بہادر میں رکھوایا کہ۔

کسی بھی زمانہ میں سرکار عالی اور (اس کے) کارپردازوں میں "لین دین" نہ ہوا کرے گا۔

اور جو روپیہ دینا تھا اس کی عوض میں پیش کش سیکاکول وراج بندری لکھوالی گئی ادائے قرض کے بعد گزاشت کی رقم مقرر کرکے سرکار میں داخل کی۔ اور چہارشنبہ کے دن دادخواہوں کے احوال دریافت کرکے حکماً مہاراجہ بہادر سے فیصلہ کرالیا۔ چودہویں صفر ۱۲۴۱ھ کو بلدۂ حیدرآباد سے کلکتہ کی جانب روانہ ہوکر دوم لارڈ کی اٹھارہویں کرسی کے منصب پر فائز ہوئے۔

وکیل دہم

ولیم بائن بارٹن بہادر، عدل گستر (مٹکف بہادر) کی روانگی کے دن چہارشنبہ (۱۲۴۱ھ) کو فائز کوٹھی ہوئے۔

جس روز سے یہ دسویں وکیل ولیم بائن بارٹن بہادر کار وکالت کے لئے تشریف لائے راجہ چندولعل بہادر سے ایسا میل طاپ رہا کہ اپنے رہنے تک تمام معاملات ریاست اور جملہ کاروبار میں کوئی بات بھی مہاراجہ بہادر کے مزاج کے خلاف ان سے ظہور میں نہیں آئی۔

چہارشنبہ کے روز چھ گھڑی دن باقی رہنے پر انیسویں جمادی الاول ۱۲۴۶ھ کو بلدۂ حیدرآباد سے کلکتہ کی جانب روانہ ہوگئے۔

وکیل یازدہم

میجر اسٹی وارٹ بہادر، انیسویں جمادی الاول ۱۲۴۶ ہجری کو صدر عالیہ کلکتہ سے بلدۂ حیدرآباد کی کوٹھی میں فائز ہوئے۔

جس روز کہ میجر جونتوا اسٹی وارٹ بہادر سرکار عظمت مدار آنریبل کمپنی انگریز بہادر والاشان کی وکالت کے لئے سرکار دولت مدار آصفیہ عالیہ میں فائز کوٹھی بلدۂ حیدرآباد ہوئے، اس روز سے مہاراجہ چندولال بہادر راجایان راجہ کی موافقت و یکجہتی ویکدلی میں اپنے آپ کو معروف رکھا، کسی معاملے میں بھی اپنے شریک وقت کے خلاف رائے ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالا، جو کچھ معمولات مقرر ہیں، اسی پر اکتفا کرکے فارغ ابال ہیں آئندہ دیکھنا چاہیئے۔

ختم شد



شاہ عباس صفوی اور فارسی ادبیات

مولوی سید محمد صاحب ام۔اے

سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں سلطنت صفویہ کے قیام سے تاریخ ایران میں تہذیب و تمدن، مذہب و معاشرت اور علم و ادب کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے عربوں کی فتح ایران کے بعد جس میں ایران اپنی ساری گزشتہ عظمت و سطوت سے محروم ہو کر خلافت اسلامیہ کا صرف ایک صوبہ بن کر رہ گیا تھا، پہلی مرتبہ صفویوں کے ہاتھوں وہ پھر اپنی سابقہ روایات اور عظمت و اہمیت کی طرف عود کرتا ہے اگرچہ اس سے قبل بھی زوال خلافت کے ساتھ ایران میں مختلف خود مختار ریاستیں ہوئیں اور ان میں سے اکثروں نے فارسی زبان و ادب کی سرپرستی کی اور اس کو معراج کمال پر پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن ان ریاستوں میں سے بہت کم حقیقی معنوں میں ایرانی کہی جاسکتی ہیں ۔ زیادہ تر ترکی اور تاتاری تھیں علاوہ برایں ان کی عملداری ایران کے صرف خاص خاص صوبوں تک محدود رہی اور کبھی پورے طور پر ایرانی قوم کی شیرازہ بندی نہ کرسکیں ۔ نیز ان کے دور میں وہ یکجہتی کبھی پیدا نہ ہوئی جو وطنیت و قومیت .... کے لئے نہایت ضروری ہے ۔ یہ فخر صرف صفوی خاندان ہی کو حاصل ہے کہ اس نے ساڑھے آٹھ سو برس کے طویل زمانہ انتشار قومی کے بعد پھر ایرانیوں کو ایک قوم بنادیا اور ساسانی فرمانرواؤں کے عہد کے ایران کی کم و بیش تمام سرزمین کو اپنے زیر نگین کرکے تحریک ایرانیت کی وہ مستحکم اساس قائم کردی جس پر موجودہ ایرانی وطنیت و قومیت کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے ۔

ساسانی خاندان کے بانی اردشیر بابکان کی طرح جس نے اپنی تخت نشینی کے ساتھ ہی دولت ایران کا مذہب زرتشتیت کو قرار دیا تھا، خاندان صفویہ کے بانی شاہ اسمٰعیل اول نے برسر اقتدار ہوتے ہی اپنے بعض خیر خواہ امیروں اور ہمدرد ساتھیوں کی طرف سے اندیشوں کے اظہار کے باوجود نہایت مستقل مزاجی اور عزم کے ساتھ اعلان کردیا کہ ایران کا سرکاری اور سلطنتی مذہب اثنا عشری ہوگا اور نہ صرف وہ بلکہ اس کے تمام جانشین آخر تک عقائد عشری کی ترویج و استحکام میں باوجود متعدد موانعات کے برابر کوشش کرتے رہے اور اپنی فیاضانہ سرپرستی میں شیعہ مذہب کا نہایت شاندار ذخیرہ کتب تیار کرایا۔

عباس اول جو ۹۹۶ھ م ۱۵۸۸ء میں سولہ یا سترہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا اور تقریباً (۴۳) برس حکومت کرکے ساٹھ سال کی عمر میں ۱۰۳۸ھ م ۱۶۲۹ء میں فوت ہوا، اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ گزرا ہے اور اپنے عزم و استقلال، تدبر و سیاست دانی اور عظیم الشان تعمیری کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں "عباس اعظم" کے مفتخر نام سے مشہور ہے تمام مورخین اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے عہد حکومت میں ایران اقتدار و خوشحالی اور عظمت و شوکت کی معراج کو پہنچ گیا تھا۔

عباس کی تخت نشینی کے وقت اس کے خاندان کی حکومت کو صحیح معنوں میں استحکام حاصل نہ ہوا تھا متعدد حیثیتوں سے ملک کی حالت بگڑی ہوئی تھی ۔ مغربی سرحد پر سلطنت عثمانیہ کی افواج قاہرہ کے حملے کا ڈر تھا تو مشرقی سرحد پر اوزبکوں کی طرف سے سخت خطرہ لاحق تھا کیونکہ وہ صفوی قوت کو بالکل مٹادینے پر تلے ہوئے تھے ۔ خود ملک کے اکثر صوبوں میں بغاوتوں اور سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا قزلباش سردار جو ابتداً اس خاندان کی حکومت قائم کرنے میں بہت پیش پیش تھے اور شاہ اسمٰعیل کی اعلیٰ قوت بازو رہ چکے تھے، اپنی آپس کی عداوتوں اور رقابتوں سے اس کی رہی سہی قوت کو بھی کمزور کئے جارہے تھے ۔ بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھے ۔ خود عباس بھی ابتداً انہی کے ہاتھوں میں پھنسا ہوا تھا اور دو قزلباش سردار مرشد قلی خاں اور علی قلی خاں اس پر اپنا اثر جمانے کے لئے جان توڑ کوشش کر رہے تھے مگر اس کی خوش بختی سے ان کی آپس کی رقابت نے عباس کو ان کے اثر سے بالکل آزاد کردیا۔ ایک اوزبکوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا اور دوسرے کو عباس نے اول الذکر کی بروقت مدد نہ کرنے اور اس طرح ملک کے ساتھ غداری کرنے کے الزام میں قتل کرادیا ۔

عباس نے شروع ہی سے اپنے ہم عصر شہنشاہ اعظم کی طرح غیر معمولی تدبر اور دانشمندی سے کام لیکر ایسے طریقے اختیار کئے جن سے بہت قلیل عرصے میں یہ تمام ناموافق حالات بدل گئے اور ملک اس طرح اندرونی و بیرونی ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہوگیا کہ پھر اس کی ترقی میں موانعات نہ پیدا ہوسکیں ۔

عباس نے اپنے بیرونی دشمنوں ترکوں اور اوزبکوں میں سے قوی تر یعنی ترکوں کے ساتھ صلح کرلی تاکہ آسانی کے ساتھ اوزبک سرداروں کا مقابلہ کیا جاسکے ۔ اگرچہ اس صلح سے اس کے وقار و اعتبار کو بھی صدمہ پہنچا اور اس کے بہت سے علاقے بھی ترکوں کے قبضہ میں چلے گئے لیکن ناگزیر حالات کے مدنظر اس نے یہ سب باتیں گوارا کرلیں اور یہی حکمت عملی آگے چل کر اس کے حق میں نہایت سودمند ثابت ہوئی ۔

ان قزلباش سرداروں کو جو جان نثار افواج ترکیہ کی طرح بجائے مفید ہونے کے خطرناک بن گئے تھے ... حکمت عملی سے یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا یا ان کا اثر و اقتدار اس طرح کم کردیا کہ پھر کبھی وہ اس کے لئے خطرناک نہ بن سکیں ۔ اس نے جری سپاہیوں کا ایک جداگانہ لشکر ایسا ترتیب دیا جو اس کے شخصی جان نثار اور وفادار تھے ۔

ترکوں سے مصالحت اور شوریدہ پشت قزلباش سرداروں کی خاطر خواہ تنبیہ کے بعد عباس نے اوزبکوں سے مقابلے کی تیاریاں شروع کیں جن کی چیرہ دستیاں بہت بڑھ گئی تھیں اور جنہوں نے عباس کی مصروفیات اور مالات سے موقع پاکر مشہد و سبزوار کو لوٹ لیا اور وہاں کے باشندوں کا قتل عام کیا ۔

عباس نے موقع کے ساتھ ان پر حملہ کیا اور بہت جلد ان کی ساری قوت توڑ دی ۔ جب وہ فتح و نصرت کے ساتھ اپنے پایہ تخت قزوین میں داخل ہوگیا اور اوزبکوں کی طرف سے کسی قسم کی سرکشی کا خدشہ باقی نہ رہا تو سرانتونی شرلے اور اس کے ساتھی انگریز جنگجوؤں کی مدد سے جو اس وقت ایران میں وارد تھے اس نے اپنی فوجی قوت کو مزید ترقی دی اور جدید اسلحہ سے لیس ہوکر ترکوں کی جانب متوجہ ہوا ۔ اس کی خوش قسمتی سے اس وقت سلطنت عثمانیہ کے تخت پر سلطان محمد ثالث متمکن تھا جو بہت کمزور اور عیش پسند تھا ۔ اس عمدہ موقع سے فائدہ اٹھاکر عباس نے وہ تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے چھین لئے جو چند سال قبل صلح کے ذریعہ ان کے حوالے کئے گئے تھے ۔ اب وہ سارے ایران کا مسلم فرمانروا تھا اور اسی کی حدود سلطنت ساسانیوں

کی حدود سلطنت کے کم و بیش برابر تھیں ۔

جب ملک میں ہر طرح امن و امان قایم ہوگیا اور سلطنتی افواج کی بھی خاطر خواہ اصلاح ہوگئی تو خود بخود ملک کی خوش حالی اور ترقی کا دور شروع ہوا ۔ عباس نے قزوین کی بجائے اصفہان کو اپنا پایہ تخت قرار دیا اور اس شہر کی ظاہری و معنوی درستی و آرائش میں اس درجے مبالغہ کیا کہ اس کے عہد میں اصفہان "نصف جہاں" ہوگیا تھا علاوہ بریں ایران کے دوسرے شہر مثلاً قزوین، اردبیل، مشہد، استرآباد، تبریز، ہمدان اور کاشان بھی اس کے عہد میں بہت آراستہ پیراستہ ہوگئے ۔

عباس علم و فن کی روایتی قدردانی اور سرپرستی میں کسی اور بادشاہ سے پیچھے نہ تھا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ خود بھی شاعر تھا اور کبھی کبھی اشعار موزوں کیا کرتا تھا اس کو مصوری اور نقاشی سے بھی فطری لگاؤ تھا چنانچہ آج بھی اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی ایک تصویر طہران کے شاہی مجموعہ تصاویر میں موجود ہے فنون لطیفہ میں معماری اور مصوری کو تو اس کے عہد میں بہت ہی غیر معمولی عروج ہوا اور اس کے دربار میں ایسے کئی نامی گرامی مصور تھے جو مانی و بہزاد کے جانشین کہے جا سکتے ہیں ۔ خاص اصفہان کی مساجد و عمارات کے علاوہ اس نے ہیچلن کے ان متعدد شہروں میں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، بہت سی خوبصورت عمارات تعمیر کرائیں ۔ نیز مسافروں اور سیاحوں کی سہولت و آسایش کی خاطر ملک کے طول و عرض میں بہت سی کاروان سرائیں بھی بنائیں جن میں سے بعض آج بھی شکستہ حالت میں موجود ہیں اور عباسیہ کے نام سے اس کی یاد تازہ کرتی ہیں ۔

اس کا دربار ہر قسم کے ارباب علم و ہنر سے آراستہ تھا ۔ علماء و فضلا سے اس کو اس قدر زیادہ عقیدت تھی اور ان کا ایسا ادب و احترام ملحوظ رکھتا تھا کہ باوجود ایک باجبروت بادشاہ ہونے کے خود ان کے گھر کو پیدل جانا اپنی سعادت سمجھتا تھا ۔ اس گروہ کے علاوہ جن کے ساتھ اس کی مراعات بہت خاص تھیں متعدد شعرا، خطاط مصور اور رفقی اس کے دربار سے متوسل تھے ۔

صفویوں کا دور حکومت اگرچہ بہت سے علوم و فنون کی ترقی کا باعث ہوا اور بالخصوص ان بادشاہوں کی سرپرستی میں مذہب اثنا عشری کی نہایت بیش قیمت اور بلند پایہ کتب لکھی گئیں لیکن یہ ایک عجیب و غریب اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان کے زمانے میں سعدی، و حافظ، فردوسی، نظامی، انوری و خاقانی جیسا بلند پایہ ایک شاعر بھی نظر نہیں آتا ۔ مغلوں کے زمانہ اقتدار میں باوجود طوالیف الملوکی اور افراتفری کے جیسے بڑے شاعر سرزمین ایران میں پیدا ہوئے، عہد صفویہ کا ایران ان سے بالکل خالی تھا ۔ اس کی کئی وجوہ ہیں ۔ اولاً ان بادشاہوں کا رجحان مذہب اور اس کی نشر و اشاعت کی طرف اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ان کی عنایات علمائے مذہب ہی کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی تھیں وہ اس سلسلے میں صوفیوں اور درویشوں کے بھی مخالف تھے اور باوصف اس کے کہ اس خاندان کے جد اعلیٰ حضرت شیخ صفی الدین اردبیلی جن کی نسبت سے یہ صفوی کہلاتے ہیں ایک بہت بڑے صوفی اور بلند مرتبت شیخ طریقت تھے، گروہ صوفیا کو صفویوں کے ہاتھوں بہت نقصانات پہنچے ۔ تصوف اور فارسی شاعری میں جو گہرا تعلق ہے اس کے مدنظر ظاہر ہے کہ ان کے دور میں صوفیانہ شاعری کی کس قدر حوصلہ فرسائی ہوئی ہوگی ۔ انھیں خوش عقیدگی میں یہ بھی پسند نہ تھا کہ شعرا خود ان کی مدح و ستایش میں قصیدے لکھا کریں ۔ چنانچہ طہماسپ اور خود عباس کے متعلق بھی یہ روایت مشہور ہے کہ ان دونوں نے شعرائے وقت کو اپنی مدح میں قصیدے لکھنے کی بجائے حضرات ائمہ معصومین کی منقبت لکھنے اور ان کے اوصاف حمیدہ بیان کرنے

کا حکم دے رکھا تھا اس طرح نہ صرف صوفیانہ شاعری اور مروجہ غزل گوئی آگے بڑھنے سے رک گئی بلکہ قصیدہ گو شاعر جو گرانبہا انعامات کی توقع پر طبع آزمائی کرنا پسند کرتے تھے ان سے نکلکر دوسرے درباروں کا رخ کرنے لگے۔ اگرچہ اس عہد میں مذہبی روایات اور مصائب کربلا کے متعلق بہت سی نظمیں لکھی گئیں اور ہفت بند محتشم کاشی کی تقلید میں مرثیے اور حزنیے بھی بکثرت اور بعض بلند پایہ لکھے گئے لیکن فارسی شاعری کی خاص اصناف یعنے قصیدہ و غزل میں صفوی دور اور دربار کے شعرا اگلے استادان سخن کی طرح وسیع شہرت حاصل نہ کرسکے اس کے علاوہ ہندوستان میں اکبر وجہانگیر اور دکن میں خود مختار فرمانروایان گولکنڈہ و بیجاپور کی غیر معمولی فیاضیوں اور شاہانہ داد و دہش نے اس عہد کی چیدہ پیداوار صفویوں کے دربار کو محروم کردیا اور عرفی و نظیری صائب و کلیم کو ایران میں رہنے نہیں دیا۔ اگرچہ ہندوستان کے بادشاہ شعراء کے ساتھ داد و دہش میں عباس سے بازی لے گئے اور ایران کے بہت سے شعراء کو اپنی طرف کھینچ لیا لیکن اور صفوی بادشاہوں کے برخلاف عباس کے دربار میں بہت زیادہ شاعر رہے ہیں اور اس نے ان کی سرپرستی میں کسی طرح کی کمی نہیں کی چنانچہ شانی طہرانی کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ اس کی کسی نظم پر خوش ہوکر اس کے وزن کے برابر سونا عطا کیا۔ اس کے دربار کے شاعروں میں شانی طہرانی کے علاوہ فصیحی ہراتی قصیدہ گوئی میں اور حکیم شفائی، زلالی اور بہائی آملی مثنویاں لکھنے میں بہت مشہور ہیں حکیم شفائی جو عباس کا درباری طبیب اور مصاحب خاص تھا چار مثنویات (۱) مہر و محبت (۲) دیدۂ بیدار (۳) نمکدان حقیقت اور (۴) قصۂ عراقین کا مصنف ہے۔ نمکدان حقیقت حکیم سنائی کی مثنوی حدیقۃ الحقیقت کی تقلید میں اور قصہ عراقین خاقانی کی مشہور مثنوی تحفۃ العراقین کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ شفائی ہجویہ نگاری میں بھی بہت شہرت رکھتا تھا چنانچہ ایک ہجویہ نظم موسوم بہ "سیزدہ بند" جو اس سے منسوب ہے اس عہد کی ہجوگوئی کا عمدہ نمونہ ہے۔

زلالی سات مثنویات کا مصنف ہے جن کے مجموعہ کا نام "سبعہ سیارہ" ہے۔ اس کی مثنوی محمود و ایاز بہت مشہور ہے۔ بہائی آملی شاعر ہونے کے علاوہ بہت بڑا فلسفی، ریاضی اور عالم علوم دینیہ بھی تھا اس کی بھی دو مثنویاں "نان وحلوہ" اور "شیر و شکر" مشہور ہیں۔ ان مشہور شاعروں کے علاوہ کئی اور شاعر بھی تھے جن میں سے بعض بڑے عالم بھی گزرے ہیں جیسے میر محمد باقر داماد استرآبادی جو فلسفہ، ریاضی، طب سائنیات کے بہت بڑے عالم ہونے کے علاوہ اس عہد کے اکابر مجتہدین میں سے تھے اور ایران کے مشہور فلسفی ملا صدرا شیرازی کے استاد تھے۔ یہ بھی شاعر تھے نیز انھوں نے اور بہائی آملی نے عربی اور فارسی میں مختلف علوم پر متعدد کتابیں اور رسالے لکھے ہیں فقط

حیدرآباد کی آبادیاں

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور
(ام اے پی ایچ ڈی (لندن)

حیدرآباد ایک عجیب و غریب شہر ہے! اس کا چپہ چپہ اپنے اندر سیکڑوں دلکشیاں رکھتا ہے۔ اس کی تاریخ اس کا تمدن، اس کی معاشرت اور اس کی روایات، غرض ہر چیز ذوق رکھنے اور مطالعہ کرنے والے کے لئے گوناگون دلچسپیوں کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ بہت کم شہر ہوں گے جہاں طرز معاشرت میں، گلی کوچوں میں، سمتوں اور محلوں میں، اور خود باشندوں میں ایسا شدید "جزر و مد" اور ایسی بلند و پست "بوقلمونی" پائی جاتی ہو! کوئی نسل ایسی نہیں جس کے نمائندے یہاں نہ رہتے ہوں۔ شاید ہی کوئی زبان ہو جو یہاں بولی نہ جاتی ہو۔ یہاں کے محل، اور جھونپڑیاں، بنگلے اور باغات اور سڑکیں اور گلیاں اپنی اپنی طرز تعمیر اور اپنی اپنی تاریخی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس شہر کو ایک "عجائب گاہ" بنارہے ہیں۔

جتنی اس "فرخندہ بنیاد" میں ماضی کی عظمتیں حال و مستقبل کی تابناکیوں اور جدت طرازیوں کے ہم پہلو ہیں شاید ہی صفحۂ ہستی کی کسی اور آبادی میں پائی جاتی ہوں!

بڑی بڑی باتوں اور مہتم بالشان خصوصیتوں کا تو ذکر ہی کیا، ہم یہاں بستی کے صرف محلوں کی آبادی، ان کی تاریخ اور ان کے ناموں کی "سرگزشت" کی طرف یہاں کے بسنے والوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ ترقی یافتہ اور آزاد ممالک میں دوسرے علوم و فنون کے ساتھ ساتھ آبادیوں اور مقامات کے ناموں کی تاریخ کا انضباط و تدوین بھی اپنے ارتقائی مدارج کو پہنچ چکا ہے، اور ضرورت ہے کہ ہم بھی ان امور میں دلچسپی لیں۔ ہر محلہ کی تاریخ معلوم کرنے، اور اس کے علاوہ اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق تحقیق و تفتیش کرنے کے سلسلہ میں ہمارے نوجوان انشاپردازوں کو نہ صرف دلچسپ سے دلچسپ موضوع ہاتھ آجائیں گے، بلکہ اپنے شہر اور اپنے ملک کی خدمت، اور اپنی علمیت میں اضافہ کرنے کا موقع ملے گا۔

(۲) حیدرآباد کی ہر چیز کی طرح یہاں کے محلے بھی عجیب و غریب متضاد شکلیں پیش کرتے ہیں کسی محلہ کی عمر تین سو سال کی ہے تو کوئی صرف "تین سال کا بچہ" ہے۔ کوئی وسیع شاہراہوں اور فلک بوس عمارتوں پر مشتمل ہے، تو کسی میں صرف تنگ و تاریک گلیاں، اور سرنگوں مکان اور جھونپڑیاں پائی جاتی ہیں۔ کسی کے نام میں اس قدر عربی و فارسی عنصر غالب ہے کہ وہ یا تو عراق عجم کا محلہ معلوم ہوتا ہے، یا ایران و افغانستان کا کوئی قریہ۔ اور کوئی نام اتنا ٹھیٹ دراوڑی ہے کہ انتہائی جنوب ہند کے کسی گاؤں کا یقین ہونے لگتا ہے، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسے شہر میں جس کا سنگ بنیاد مسلم حکمرانوں کے ہاتھ سے رکھا گیا، اور جو مسلسل کئی صدیوں سے انہی کا دارالحکومت رہتا آیا ہے اس قسم کے نام کیسے زندہ جاوید ہوگئے۔

حیدرآباد میں کتنے محلے ہیں، اور وہ کن کن ناموں سے مشہور ہیں، ان کا علم یا تو دفاتر آرائش و صفائی کو حاصل ہوگا، یا اس شہر کے ان "اہم افراد" کو جو اس کے جزو لاینفک ہیں اور "جھٹکے والے" کہلاتے ہیں، اور جنھیں اس عظیم الشان بلدہ کی حلیہ چیزوں اور خصوصیتوں کا چلتا پھرتا "محیط معلومات" یا انسائیکلوپیڈیا سمجھا جا سکتا ہے۔ کوتوالی کا جوان یا صفائی کا کارندہ اگر کسی "گلی" یا "چبوترہ" یا "باولی" کا پتہ دینے میں ناکام ہوجائے (اور وہ اکثر و بیشتر ہوجاتا ہے!) تو یقین مانئے کہ سوائے "جھٹکہ والے" کے کوئی ہستی آپ کی رہبری و رہنمائی نہیں کرسکتی! اس کا گذر اس غدار آبادی کے ایسے ایسے سربستہ اور درہم پیچیدہ مقامات میں ہوتا ہے جہاں تک آپ کا (اور آپ میں ہر وہ شخص شامل ہے جو اپنے تئیں حیدرآباد کے گلی کوچوں کا بڑے سے بڑا ماہر سمجھتا ہو!) تخیل بھی نہیں پہنچ سکتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے نوجوان اہل قلم (جنھیں لکھنے کے لئے موضوع نہیں ملتے، یا جو آئے دن ایسے ایسے مردہ، پامال، دور دراز کے اور از کار رفتہ موضوعوں میں اپنی قوت برباد کرتے ہیں جو ان کی انشاپردازی کی ترقی اور مقبولیت کا باعث نہیں بن سکتے۔) جھٹکہ والوں کے متعلق مضامین لکھنے لگیں تو نہ صرف زندہ اور دلچسپ سے دلچسپ موضوع ملتے جائیں بلکہ اس معمورہ کی

موجودہ زندگی، معاشرت، روایات اور خصوصیات کے متعلق بہت اچھا مواد فراہم کر دیں گے۔

۳

محلوں کے ناموں کی تحقیق و تفتیش، ان کی تدوین، اور ان کی گروہ بندی وہ امور ہیں جن کی طرف سب سے پہلے ہمیں اس کام کے سلسلہ میں متوجہ ہونا پڑے گا۔ بہت سے نام ایسے ملیں گے جو اس محلہ کی تاریخ ماضی سے چولی دامن کی طرح وابستہ ہوں گے اور جب تک اس کا پتہ نہ چلایا جائے گا ان کی حقیقت واضح نہ ہو سکے گی۔ کئی نام ایسے ہیں جو زمانہ کے امتداد اور زبان کے فطری قوانین کے مطابق اپنی شکل و شباہت میں تغیر و تبدل حاصل کر چکے ہیں، اور اج اسی مسخ شدہ حالت میں رائج ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان بدلی ہوئی شکلوں میں سے بعض ایسی رواں اور سڈول ہوگئی ہیں کہ عہد حاضر کے لسنے والے انہی کو صحیح سمجھنے لگے ہیں، اور اگر آج کوئی ان کی قدیم اور اصلی شکلیں پیش کردے تو ان کا پھر سے رائج ہونا تو کجا ان کی صحت میں بھی آج کل کے لوگوں کو شبہ ہوگا۔

حیدرآباد کے محلے اپنی اپنی آبادیوں کے آغازی زمانہ اور تاریخ کے لحاظ سے کئی گروہوں میں تقسیم کردیے جا سکتے ہیں:—

پہلا گروہ ان قدیم ترین محلوں کا ہے جن پر شہر حیدرآباد کی ابتدائی آبادی منحصر تھی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ (۹۵۷-۹۸۸ھ) سے ابوالحسن تانا شاہ (۱۰۸۳-۱۰۹۸ھ) کے زمانوں کے درمیانی عہد میں جو محلے آباد ہوئے ان میں اکثر اس وقت تک یا تو مٹ چکے یا انھوں نے اپنی جگہ نئے محلوں کو دیدی، اور بعض اگرچہ موجود ہیں لیکن نئی شکل اور نئے ناموں کے ساتھ۔ جو محلے اب تک اپنے اصلی ناموں کے ساتھ باقی ہیں ان میں سب سے قدیم "دارالشفاء" ۲۔ "حسینی علم" ۳۔ "بادشاہی عاشورخانہ" اور ۴۔ "کاروان ساہو" ہیں۔ ان کے بعد کے زمانے میں جو مقام آباد ہوئے ان میں سے "گوشہ محل"، ۲۔ "سلطان شاہی" اور ۳۔ "چار محل" کے نام اب تک باقی ہیں۔

زوال گولکنڈہ کے بعد اور خاصکر عہد آصفیہ میں جو محلے آباد ہوئے، یا قدیم محلوں کے لئے جو نئے نام رائج ہوئے ان میں نسبتاً کم تغیر و تبدل ہوا ہے۔ اس عہد کے بعض ابتدائی نام "شاہ گنج"، ۲۔ "کوٹلہ عالیجاہ" ۳۔ "سلیمان جاہ کی جاوڑی" اور ۴۔ "دودھ خانہ اللہ رکھی بیگم" وغیرہ اب تک موجود ہیں۔ آج سے سو ڈیڑھ سو سال کے اندر جو محلے آباد ہوئے، جنھوں نے پرانے محلوں کی جگہ حاصل کی ان کے اصلی نام اب تک باقی ہیں:— مثلاً پرانی حویلی، ۲۔ افضل گنج ۳۔ سدی عنبر کا بازار، ۴۔ محبوب شاہی، ۵۔ عثمان پورہ، ۶۔ حمایت نگر، ۷۔ شاہراہ عثمانی وغیرہ۔

زمانۂ تعمیر اور ناموں کی قدامت کے لحاظ سے حیدرآباد کے محلوں کی یہ ایک موٹی سی اور ناکمل تقسیم ہے۔ کیونکہ اس مضمون کا اصل موضوع محلوں کی گروہ بندی نہیں ہے بلکہ حیدرآباد کے محلوں کی آبادی اور ان کے ناموں کے متعلق تحقیق و تفتیش کرنے اور معلومات کو قلم بند کرنے کی تحریک کا آغاز کرنا ہے۔

۴

حیدرآباد کے، اور حیدرآباد ہی کے نہیں بلکہ ہر شہر کے محلوں کے نام کئی گروہوں پر منقسم ہو سکتے ہیں۔ پہلے گروہ میں ان ناموں کو شامل کیا جائے گا جو کسی بادشاہ یا امیر کی یادگار کے طور پر رکھے جاتے ہیں، یا اس کے عہد حکومت میں آباد ہوتے "یا نئی زندگی حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کے ناموں میں "افضل گنج" ۲۔ "عثمان شاہی" ۳۔ "حمایت نگر" اور ۴۔ "شاہراہ عثمانی" وغیرہ شامل ہیں۔

دوسری قسم کے نام وہ ہیں جو بنانے والے یا مالک کے نام کی مناسبت سے رکھے جاتے ہیں:— مثلاً "کمان شمس الامراء" ۲۔ "کوٹلہ عالیجاہ" ۳۔ "سدی عنبر کا بازار" ۴۔ "تالاب میر جملہ"

تیسرے گروہ میں وہ نام شامل ہیں جو کسی خاص عمارت کے وقوع، یا کسی خاص شخص کی سکونت کی نسبت سے رائج ہوجاتے ہیں:— مثلاً "دارالشفاء" ۲۔ "دیوان کی دیوڑھی" ۳۔ "مستر جان کی سڑک" اور ۴۔ "سید علی کا چبوترہ" وغیرہ۔

چوتھی تقسیم ان اسماء پر مشتمل ہے جو خاص قسم کے لوگوں یا خاص پیشہ والوں کی سکونت کے لحاظ سے شہرت پاتے ہیں:— مثلاً "چماری دروازہ" ۲۔ "کاماٹی پورہ" ۳۔ "ترپ بازار" اور ۴۔ "سدیوں کا رسالہ"، وغیرہ۔

بعض نام کسی خاص تاریخی واقعہ کی وجہ سے، یا اس جگہ کی کسی چیز یا خصوصیت کی نسبت سے رائج ہوتے ہیں۔ یہ ناموں کی پانچویں قسم ہے اور یہ نام اپنی سرگزشت کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں:— مثلاً "فتح دروازہ" ۲۔ "نوبت پہاڑ" ۳۔ "مچھلی کمان" ۴۔ "لال دروازہ" وغیرہ۔

اسی طرح ممکن ہے اور بھی چند قسمیں نکل سکیں، اور اگر اس تحریک میں ایک سے زیادہ آدمی دلچسپی لینے لگیں تو بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔

اس موقع پر یہ امر واضح ہوجانا چاہئے کہ ناموں کی گروہ بندی اتنا اہم اور دلچسپ کام نہیں ہے جتنا ان واقعات کی تلاش اور ان کا اظہار جن کی بناء پر یہ نام پیدا ہوئے اور آج تک زندہ ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں اپنے محلوں میں سے ایک دو کی آبادیوں کا تذکرہ اور ان کے ناموں کی سرگزشت پیش کرتے ہیں جس سے ہماری عہد حاضر کی آبادی کو معلوم ہوگا کہ ہمارے شہر میں کیسی کیسی تاریخی اور فسانوی دلچسپیاں موجود ہیں۔

۵

یوں تو حیدرآباد کے متعدد محلے، ان کی آبادیاں، اور ان کے نام منتظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ان کی نسبت "جدید حیدرآباد" کو صحیح طور پر واقف کرے، اور اس محدود جگہ میں گنجائش نہیں ہے کہ ان میں سے اکثروں کی سرگزشت بیان کی جائے اس لئے فی الحال "خیریت آباد"، "حسین ساگر"، "ماں صاحب کا تالاب" اور "شیر دل کی کمان" کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ حیدرآباد کی محلہ آبادیوں پر آئندہ کسی اور سلسلہ میں انشاءاللہ نظر ڈالی جائے گی۔

خیریت آباد

اس نام کی تاریخ گوناگوں دلچسپیوں سے مملو ہے نہ صرف اس لئے کہ "جدید حیدرآباد" اسی محلہ کے اطراف و اکناف سمٹا چلا آرہا ہے، اور اس شہر کے اکثر ارباب حل و عقد اسی میں بود و باش رکھتے ہیں، بلکہ اس لئے کہ اس شہر میں اور خاصکر اسی آبادی میں لبنے والے اہل علم و فضل بھی اس آبادی کے صحیح نام یا اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں آخرالذکر طبقہ میں سے بعض تو ایسے ستم ظریف بھی نکلے کہ عوام کے لفظ "خیرت آباد" کو غلط قرار دیکر اپنے "ادیبانہ خطوط" اور زریں "نامو گرامیوں" میں لفظ "خیریت آباد" درج کرنا شروع کیا اور اپنا اس "جرات رندانہ" پر فخر بھی کرنے لگے کہ ہم نے ایک مسخ شدہ لفظ کو صحیح طور پر رائج کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دولت مند آبادی کا صحیح نام خیریت آباد نہیں بلکہ "خیرۃ آباد" ہے۔

اس وجہ تسمیہ کی تحقیق کے لئے ہمیں آج سے پونے چار سو سال قبل کے "ابتدائی حیدرآباد" کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ بستی اصل میں اسی زمانہ میں لبائی گئی تھی۔

جس وقت خیرت آباد کی بنا ڈالی گئی شہر حیدرآباد کی جگہ یہ ایک چھوٹا سا "چچلم" آباد تھا۔ حیدرآباد کا بانی گولکنڈہ کا جلیل القدر حکمراں سلطان محمد قلی قطب شاہ ہے اور خیرت آباد کا بانی اس کا باپ سلطان ابراہیم قطب شاہ، جو اپنی بے تعصبی اور

مقامی زبان تلنگی کے علم و ادب اور شعر شاعری کی قدر دانی کی وجہ سے تلنگی شاعروں کا "ممدوح خاص" تھا۔ اسی عظیم المرتبت سلطان نے اپنی ایک لڑکی شہزادی خیرۃ النساء کی بود و باش کے لئے اس سرسبز و شاداب اور صحت مند خطہ کو پسند کیا تھا کیونکہ اس شہزادی کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی، اور اطباء کی رائے تھی کہ گولکنڈہ کے شاہی محلات گرد آلود ہوا میں گھرے ہوئے ہیں اور شہزادی کو ایک کھلی اور خوشگوار آب و ہوا میں قیام کرنے کی ضرورت ہے۔

چنانچہ بادشاہ نے اپنے دربار کے "صدر المہام تعمیرات" ابو عبداللہ نصیر الدین حسین کو (جو بعد میں حضرت حسین شاہ ولیؒ کے نام سے شہرہ آفاق ہوئے اور خود بادشاہ کے داماد اور دس ہزار فوج کے سپہ سالار تھے) حکم دیا کہ اس جگہ ایک باغ، محل، مسجد، بازار اور تالاب تعمیر کریں۔ مسجد، بازار اور تالاب تو اب تک موجود ہیں لیکن باغ اور محل دوسرے قطب شاہی باغوں اور محلات کی طرح صفحۂ ہستی سے بہت جلد فنا ہو گئے۔

حسین ساگر

جو پُر فضا تالاب آج حسین ساگر کہلاتا ہے اصل میں ایک چھوٹا سا کنٹہ تھا جو اسی متذکرہ بالا "قطب شاہی باغ" کے دامن میں واقع تھا اور جس کو ابراہیم قطب شاہ کے حکم سے اس وقت کے ابو عبداللہ نصیر الدین حسین اور آج کل کے "حسین شاہ ولی" نے شہزادی خیرۃ النساء کے لئے ایک وسیع منظر اور فرحت افزا تالاب کی شکل میں منتقل کیا۔ اس کا اصلی نام "ابراہیم ساگر" بادشاہ کے نام پر رکھا گیا تھا مگر دوران تعمیر میں نصیر الدین حسین انجنیر کے اہتمام کی وجہ سے حسین ساگر مشہور ہو گیا اور پھر باوجود سرکاری کوششوں کے اصل نام رائج نہ ہو سکا۔

اس تالاب کی تعمیر کے سلسلہ میں صدر المہام تعمیرات، نصیر الدین حسین سے جو مافوق فطرت کا مظاہر ہوئے ان کی نسبت قسم قسم کے قصے اور روایتیں مشہور ہیں جن کا ذکر انشاء اللہ کسی اور موقع پر "حسین شاہ ولی کی حیات" کے سلسلہ میں کیا جائے گا۔ چونکہ اس تالاب کی تعمیر ان کے ابتدائی زمانے میں ہوئی تھی اس لئے ممکن ہے کہ اسی وقت سے عوام ان کی ولایت اور کرامت کے معتقد ہونے لگے ہوں۔

شہزادی خیرۃ النساء کا جب انتقال ہوا تو بادشاہ کو بڑا ملال ہوا چنانچہ اس کے حکم سے نصیر الدین حسین (حسین شاہ ولی) نے خیرۃ آباد کی مسجد کے پہلو میں ایک گنبد تعمیر کرادی جو اب تک موجود ہے۔ اس گنبد میں شہزادی کی نعش عارضی طور پر سپرد خاک کی گئی تھی۔ کیونکہ روایت ہے کہ بعد کو وہ کربلائے معلی میں دفن کی گئی۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ حسین شاہ ولی ابراہیم قطب شاہ کے داماد تھے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو شہزادی ان کو بیاہی گئی تھی وہ خیرۃ النساء تھی یا اس کی کوئی بہن۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ حسین شاہ ولی نے خیرت آباد اور حسین ساگر جس ہستی کے لئے آباد کیا وہ ان کو یقیناً عزیز تھی اور شاید انہی کی کرامت ہو گی کہ خیرۃ آباد اور اس کا قرب و جوار آج تک مقبول خلائق ہے اور صاحبان ثروت کا مسکن، اور حسین ساگر اور اس کا ماحول بھی ہمیشہ پُر فضا اور فرحت بخش ثابت ہوتا رہا ہے۔ شہر حیدرآباد اور اس کے نواح کا کوئی تالاب اتنا آباد، خوش منظر، اور بارونق نہ ہو سکا!!

ماں صاحب کا تالاب

گولکنڈہ کے شاہی خاندان کو یہ خطہ (خیرت آباد اور حسین ساگر کا نواح) اس قدر پسند تھا کہ سلطان ابراہیم کی پوتی، محمد قلی قطب شاہ کی اکلوتی شہزادی یعنے خیرۃ النساء کی بھتیجی حیات بخشی بیگم نے اس کے قریب ایک اور باغ، بازار اور تالاب بنوایا جو اس وقت تک موجود ہیں۔

حیات بخشی بیگم کے تالاب کو "ماں صاحب کا تالاب" اس لئے کہتے ہیں کہ چونکہ

جہاں ایک بادشاہ (محمد قلی) کی غالباً واحد لڑکی تھی اور جہاں ایک بادشاہ (محمد قطب شاہ) کی واحد ملکہ تھی، ایک واحد لڑکے کی ماں بھی تھی جو بعد میں چلکر عبداللہ قطب شاہ کے لقب سے بادشاہ ہوا اور عجیب اتفاق ہے کہ یہ عجیب و غریب شہزادی اور ملکہ اپنے اکلوتے لڑکے کے عہد حکومت میں بھی عرصہ تک زندہ رہی، اور نہ صرف زندہ بلکہ حکمراں۔ ان کی اجازت کے بغیر خود بادشاہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا، اور بادشاہ کی "ماں صاحب" کا حکم ہر معاملہ میں آخری لفظ ہوا کرتا تھا اور یہ "ماں صاحب" اتنی ہر دل عزیز اور مقبول تھیں کہ نہ صرف بادشاہ بلکہ ملک کا بچہ بچہ ان کو اپنی ماں صاحب سمجھتا تھا، اور اسی وجہ سے یہ نام اب تک اسی شکل میں چلا آیا، البتہ عام لسانی ارتقار کے مطابق اس میں تھوڑی سی صوتی تبدیلی بھی ہوئی ہے۔

شیر دل کی کمان

جب کوئی شخص حیدرآباد میں "پتھر گھٹی" سے "چارمنار" کی طرف جاتا ہے تو "سو کے حوض" سے جانب مغرب جو کمان، بازار اور راستہ اس کو دکھائی دیتا ہے وہ اسی متذکرہ نام سے موسوم ہے، یہ اصل میں کمان کا نام ہے مگر جیسا عام طور پر ہوتا ہے، اس کی اطراف و اکناف کی آبادی بھی اسی نام سے یاد کی جاتی ہے۔

"شیر دل کی کمان" ان چار کمانوں میں سے ہے جو آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے محمد قلی قطب شاہ کے محل کے سلسلہ میں "شاہی جلوخانہ" کے چاروں پہلوؤں کے وسط میں بنائی گئی تھیں اور جن کا نام "چہار طاق ہائے جلوخانہ شاہی" کہلاتی تھیں، جو کمان آج "شیر دل کی" کہلاتی ہے وہ اصل میں شاہی محل کا بیرونی دروازہ تھا اور "دروازہ دولت خانہ عالی" کہلاتا تھا۔ اس پر نہایت قیمتی پردہ پڑا رہتا تھا جو بادشاہ کا جلوس نکلتے وقت اٹھایا جاتا۔

اس دروازہ "دولت خانہ عالی" کے بالکل مقابل مغرب کی طرف، اس جگہ جہاں سے آج کل ساہوکاروں کے مکانوں اور "کسار ہٹہ" کی طرف راستہ نکلتا ہے محل خاص کا "باب عالی" تھا جو خالص طلائی تھا، اور جس کو اورنگ زیب نے فتح حیدرآباد کے بعد دہلی روانہ کر دیا تھا۔

ساڑھے تین سو سال تو آج بھی عظیم الشان قطب شاہی "دروازہ دولت خانہ عالی" کے آثار موجود ہیں۔ اس کمان سے اگر آپ کبھی گزریں تو معلوم کریں گے کہ ایک بڑی سنگین چوکھٹ اب تک اس میں موجود ہے، حالانکہ اس قسم کی چوکھٹیں یا ان کے آثار دوسری تین کمانوں میں موجود نہیں ہیں، اور ہو بھی نہیں سکتے کیونکہ وہ دروازوں کا کام نہیں دیتی تھیں۔

ہمارے لئے اس موقع پر یہ بات زیادہ دلچسپ ہے کہ اس کمان کا نام "دروازہ دولت خانہ عالی" سے بدلکر "شیر دل کی کمان" کیسے پڑ گیا۔ اس کی نسبت کئی طرح کی روایتیں موجود ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ زوال قطب شاہیہ کے بعد لوگ قدیم شاہی محل کا دروازہ ہونے کی وجہ سے اس کو فوق فطری خصوصیات کا حامل سمجھنے لگے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اگر کسی کو جادو کا اثر ہو جائے تو یہاں لانے سے زائل ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کا نام "کمان سحر باطل" پڑ گیا! اور پھر یہی لفظ صوتی تغیرات حاصل کر کے شیر دل ہو گیا۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ کوئی بزرگ اس کمان کے گوشے میں آکر ٹھیرے تھے اور وہ جادو کے اثرات کو باطل کر دیا کرتے تھے، اس لئے لوگوں نے اس کمان ہی کا یہ نام رکھ دیا۔

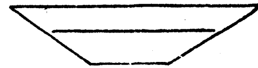
ایک تیسری روایت جو زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے لفظ شیر دل کو شیر گل (مٹی کا شیر) کی مسخ شدہ شکل قرار دیتی ہے۔ "شیر گل" یا مٹی کا شیر آج تک اس جگہ موجود ہے جہاں کسی زمانہ میں حیات بخشی بیگم کا محل تھا، اور جس کے آثار انہی کی بنائی ہوئی مسجد کی صورت میں اسی شیر گل کے قریب آج بھی موجود ہیں۔

حیات بخشی بیگم کے اس محل کی سرگزشت ہمارے اس مضمون میں ملے گی جو "چار کمان" کے عنوان سے "حسن کار" میں شائع ہو رہا ہے یہاں صرف اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ شیر ایک تو قطب شاہی سلطنت کے شاہی نشانات میں شامل تھا اور دوسرے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لقب "شیر خدا" کی مناسبت سے شیعہ مذہب کے ظاہری لوازمات میں

سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ خود حیات بخش بیگم نے اپنے محل کے عاشور خانہ میں ایک شبیر بنوایا ہو، جس کی یاد اب تک شیر گل کی شکل میں باقی ہے۔

غرض عوام اسی "شیر گل" (دلّی کے شبیر) کی طرف لے جانے والی کمان کو "کمان شیر گل" کہنے لگے ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ یہ لفظ باضابطہ صوتی تبدیلیوں کے تحت پہلے شیر دل بنا ہو اور پھر شیرڑ دل۔ حروف "د" اور "ڑ" بہت سے پہلے کی "ر" حیدرآباد میں اکثر "ڑ" بولی جاتی ہے۔ شلاً الفاظ خردہ، مردہ، اردلی یا اردلی اور گرتا کو حیدرآباد کے ان پڑھ عوام خرڑدہ، مرڑدہ، اڑدل یا اڑدلی اور گڑتا بولتے ہیں۔ یہ ایک باضابطہ اور با اصول صوتی تبدیلی ہے جو اکثر زبانوں میں پائی جاتی ہے۔

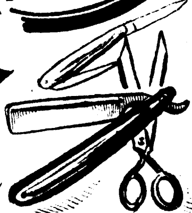
(ختم شد)





حیدرآباد دکن کی مشہور و معروف دوکان

حاجی محمد ترکی کیپ مرچنٹ سالار جنگ بلڈنگ حیدرآباد دکن

ہماری دوکان

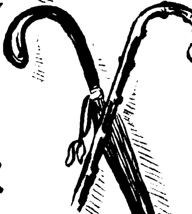
میں آج چالیس سال سے ملک کے مروجہ فیشن کے مطابق ہر قسم کا سامان یورپ وغیرہ سے

راست منگوا کر

حسب خواہش معزز خریدار صاحبان فروخت کیا جاتا ہے اور

یہی وجہ ہے کہ

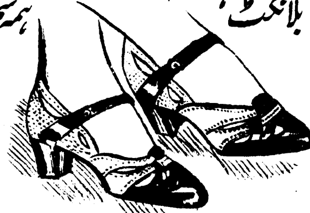
مملکت آصفیہ میں ہماری دوکان کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے




مختصر فہرست درج ذیل ہے

رومی ٹوپی شیرگولہ، مصری ٹوپی کرسٹی، بوٹ، شوز زنانی و مردانی ہمہ قسم پائتابہ، دستی، توال، نیین ہمہ قسم، شیروانی کے بہترین بٹن سیفٹی ریزر چھتری لکڑی چاقو، قینچی، بلانکٹ، ہمہ قسم سوزنیان وغیرہ وغیرہ

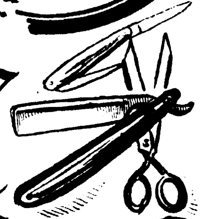







حیدرآباد دکن کی مشہور معروف دوکان

حاجی محمد ترکی کیاپ مرچنٹ سالارجنگ بلڈنگ حیدرآباد دکن

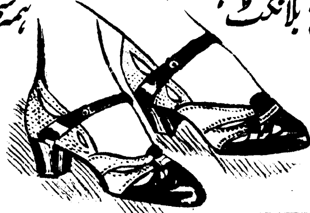
ہماری دوکان

میں آج چالیس سال سے ملک کے مروجہ فیشن کے مطابق ہر قسم کا سامان یورپ وغیرہ سے
راست منگواکر
حسب خواہش معزز خریدار صاحبان فروخت کیا جاتا ہے اور
یہی وجہ ہے کہ
مملکت آصفیہ میں ہماری دوکان کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے
مختصر فہرست درج ذیل ہے





رومی ٹوپی شیرگولہ مصری ٹوپی کرسٹی بوٹ، شوز زنانی ومردانی ہمہ قسم
پائتابہ، دستی تووال، بنین ہمہ قسم، شیروانی کے بہترین بٹن سیفٹی ریزر چھتری
لکڑی چاقو، قینچی، بلانکٹ، ہمہ قسم سوزنیاں وغیرہ وغیرہ




"باؤلیاں کس طرح کھودی جانی چاہئیں کہ پانی کی زیادہ سے زیادہ مقدار کم سے کم خرچ میں حاصل ہو" میرے اس مضمون کا موضوع ہے۔ ممکن ہے کہ یہ شبہ پیدا ہو کہ باؤلیاں تو ہزاروں برس سے کھدرہی ہیں' اس پر کافی تجربہ کیا جاچکا ہے باوجود اس کے کیا ابھی کوئی امر معلوم کرنے کے قابل باقی ہے؟ جن حضرات کے دل میں ایسا شبہ پیدا ہو اون سے میری استدعا ہے کہ...... باوجود ہزار ہا سال کے تجربہ کے بعض معمولی چیزوں میں بھی اصلاح عمل میں آتی رہتی ہے۔

باؤلی میں پانی دو طریقوں سے آتا ہے:—

(۱) ایک تو یہ کہ جس زمین میں باؤلی کھودی جاتی ہے اس میں ذرات زمین کے درمیانی خلاء میں پانی موجود ہوتا ہے جو باؤلی کے اطراف سے بھر کر اندر آتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ زمین کے اندر اس وقت کی شگافیں موجود ہوتی ہیں جب وہ حصہ پتھر تھا اور بعد میں یہی پتھر مٹی بن گیا۔ یہ شگافیں بعض جگہ بڑی لمبی لمبی ہوتی ہیں' اور بعض جگہ چھوٹی ان شگافوں کے دونوں بازوؤں سے پانی بھر کر باؤلی میں آتا ہے تو چیرے کی شکل اختیار کرتا ہے جس قدر شگاف لمبا اور چوڑا ہوگا اوسی قدر پانی کی آمد زیادہ ہوگی۔

جب کبھی پتھریلی زمین میں باولی کھودی جائے تو شکل اول تقریباً مفقود ہوتی ہے اور پانی کی آمد کا دارومدار صرف انہی شگافوں پر ہوتا ہے جو ان پتھروں میں موجود ہوں' اس وجہ سے ایسے موقعوں پر بعض اوقات ایک باولی بالکل ناکام ہوتی ہے اور اوس کے قریب ہی دوسری باؤلی بہت کامیاب نکل آتی ہے۔ قسم اول کی بہترین مثال وہ باولیاں ہیں جو ریتیلی زمین میں کھود جاتی ہیں ان میں بھر چوطرف سے ہوتی ہے اور شگاف مفقود ہوتے ہیں۔ مگر دیگر اقسام زمین میں اور خاصکر مورم کی زمین میں پانی دونوں طریقوں سے آتا ہے۔

جن لوگوں کو باولیوں کے کھودنے کا تجربہ ہے انھوں نے دیکھا ہوگا کہ پانی کچھ تو باولیوں میں چوطرف سے بھر کر آتا ہے اور کہیں سے پانی زیادہ مقدار میں بہتا ہوا نکلتا ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندر چھوٹی سی نالی ہے جس میں سے پانی آرہا ہے۔ یہی نالی دراصل قدیم زمانہ کا شگاف ہے۔ پانی باولی کی تہ میں بھر کر آتا ہے اور بازوں سے بھی۔ باؤلی کے اندر پانی کی سطح پمپ کرنے کی وجہ سے جس قدر نیچی ہوتی جائے گی اوسی قدر پانی کا دباؤ زیادہ ہوگا اور پانی کی آمد زیادہ ہوگی۔ اس لئے اگر ہم باؤلی کو زمین کے اندر کی سطح آب سے زیادہ عمیق کھودیں یا عمیق کے لئے بغیر کسی طرح بھر کے رقبہ کو زیادہ وسیع کریں تو ہر دو صورتوں میں پانی زیادہ ملے گا۔ اگر دونوں صورتیں اختیار کی جائیں تو پانی اور زیادہ ملے گا۔ مثلاً اگر ایک باولی میں پانی دس فٹ ہے اور دوسری میں بیس فٹ اور دونوں کی بھر کا رقبہ یکساں ہے تو بیس فٹ عمق کی باولی سے اس فٹ عمیق باولی کے مقابلہ میں پانی زیادہ میسر آئے گا۔ اسی طرح اگر دونوں باؤلیوں کے پانی کا عمق دس فٹ ہو مگر ایک باؤلی کی بھر کا رقبہ پانچسو مکسر فٹ ہو اور دوسری باؤلی کا رقبہ ہزار فٹ ہو تو ثانی الذکر باؤلی سے بمقابلہ اول الذکر کے زیادہ پانی دستیاب ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے' بشرطیکہ زمین کی نوعیت ایک ہو۔ جہاں پانی کا دارومدار شگافوں پر ہو وہاں جس قدر باؤلی کا طول زیادہ ہوگا اوسی قدر زیادہ شگافوں کے ملنے کا امکان ہے۔ مثلاً اگر ایک باولی بیس فٹ طول ہو اور دوسری ۶۰ فٹ کی تو ثانی الذکر باؤلی میں بمقابلہ اول الذکر کے شگافوں کے پانی کا امکان سہ گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعوض زیادہ قطر کی باؤلی بنانے کے کفایت اس میں ہے کہ باؤلی تو چھوٹی قطر کی ہو اور اس سے ملی ہوی ایک نالی باولی کے برابر عمیق کھودی جائے جیسا کہ تختہ منسلکہ سے ثابت ہوگا۔ متذکرۂ بالا امور سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:—

(۱) باؤلی جس قدر عمیق کھودی جاسکتی ہے کھودی جائے۔

(۲) باؤلی کا قطر زیادہ نہ ہو بلکہ صرف اسی قدر ہو جس قدر پمپ یا موٹ کے لئے ضروری ہے۔

(۳) باؤلی سے ملحق ایک نالی باؤلی کے عمق کے برابر عمیق کھودی جائے جس کا طول آب مطلوبہ کی مقدار اور زمین کی نوعیت کے لحاظ سے رکھا جاسکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باؤلی کا عمق کیا ہونا چاہئے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جہاں زمین میں پانی سطح زمین کے قریب ہوتا ہے وہاں گرمی اور برسات میں پانی کی سطح کا فرق کم ہوتا ہے اور جہاں پانی نیچے ملتا ہے وہاں فرق بھی زیادہ ہوتا ہے اس لئے موسم بارش کے دوران میں یا بعد موسم بارش کے جو سطح باؤلی میں پانی کی رہتی ہے اوس کا لحاظ نہیں کرنا چاہئے بلکہ گرمیوں میں جو سطح ہوتی ہے اس کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ عموماً اگر گرمیوں کی سطح سے بیس فٹ عمیق باؤلی کی تہ ہو تو عمق کافی تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس سے کم عمق صرف ایسے مواقع میں رکھنا مناسب ہوگا جیسے باؤلیاں نالے یا ندی کے کنارے ہوں۔

جب پانی زیادہ مقدار میں لیا جایا کرے گا تو چند فٹ پانی اتر جائے گا اور پھر جس سال بارش کم ہوتی ہے اس سال پانی کی سطح اور نیچے اتر جانے کی توقع کرنا چاہئے۔ اس طرح یہ توقع کرنا غلط نہ ہوگا کہ کم از کم باولی کھودتے وقت موسم گرما میں جو سطح رہے گی اوس سے اور دس بارہ فٹ پانی کم بارش کے سالوں میں اتر جائے گا بشرطیکہ باؤلی پوری طور پر استعمال میں لائی جائے اور ایسے زمانے میں صرف آٹھ یا دس فٹ پانی باؤلی میں رہ جائے گا جو گرمیوں میں خرچ کے لئے کافی ہو جائے گا۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باؤلی کی نالی کا طول کس طرح معین کیا جائے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ اولاً ہم کو یہ اندازہ لگانا چاہئے کہ کس قدر پانی کے لئے باؤلی تیار کرنا مقصود ہے —— فرض کیجئے کہ پچاس ہزار گیالن روزانہ حاصل کرنا مقصود ہے —— اور یہ بھی تصفیہ کرلینا چاہئے کہ باؤلی کا کس قدر قطر درکار ہے۔

فرض کیجئے کہ باؤلی کا قطر مطلوبہ دس فٹ ہے۔

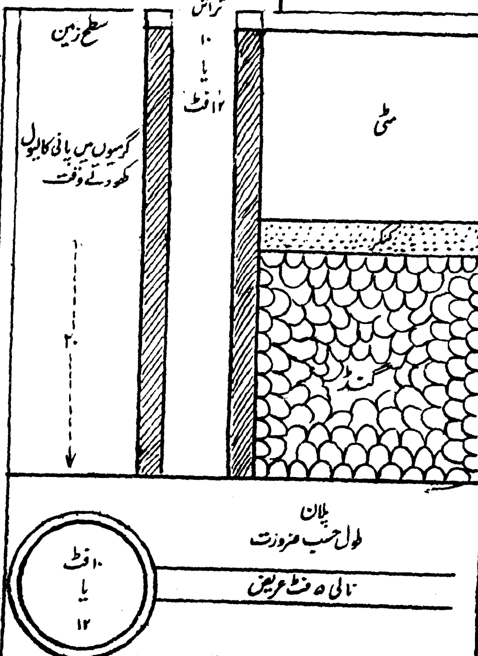
دیوار کی موٹائی" کا لحاظ کر کے ۱۳ فٹ کی باؤلی پہلے کھودی جائے۔ اگر اندازہ یہ کیا جائے کہ گرمیوں میں پانی کی سطح زمین سے بیس فٹ ہوگی تو باؤلی کا عمق زمین سے ۲۰ فٹ ہونا چاہئے۔ اس باولی کا پانی خالی کرنے کے لئے اگر پمپ لگایا جائے تو آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باؤلی میں پانی کی آمد کس قدر ہے" بلکہ یہ بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اگر زمین کے اندر کی سطح آب سے باؤلی میں پانی کا لیول (۵) فٹ نیچے ہو تو پانی میں آمد کی مقدار کیا ہے" اور اگر دس فٹ نیچے ہو تو مزید اضافہ کس قدر ہوگا۔ ایسا تختہ بنا لیا جائے تو پھر بہت آسانی سے یہ رائے قایم کرلی جاسکتی ہے کہ اندازاً عمیق پانی کا طول و عرض کیا ہونا چاہئے۔ عملاً ۵ فٹ عرض ہو تو کافی ہے اس سے طول کا یقین ہو جائے گا۔ جہاں ایسا حساب کرنا ممکن نہ ہو تو باولی کے ساتھ ساتھ تقریباً ۵۰ فٹ کی نالی کھودی جائے اگر یہ کافی نہ ہو تو اس کو بعد میں طویل کر دیا جاسکتا ہے۔ باؤلی کو بڑھانا ناممکن ہے۔ حساب سے تو مدور کنوں کی اطراف کی دیوار کا خرچ گول چوکونے میں بمقابلہ چوکونی باولیوں کی بندش کے بہت کم ہوتا ہے اس لئے یہ بڑی غلطی ہے کہ باؤلیاں لمبی یا چوکونی بنا کر اون کے اطراف دیوار کی بندش کی جائے۔ اگر بندش کرنا مقصود نہ ہو تو باؤلیاں جس قدر لمبی ہوں بہتر ہے۔ اگر بندش نہ کی جائے تو باؤلیوں میں سے کیچڑ نکالنے کا خرچ برداشت کرنا اور تکلیف اٹھانا ضروری ہوگا ورنہ چند سال ہی میں باؤلیاں بالکل بے کار ہو جائیں گی اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ باؤلی تو چھوٹی سی دس یا بارہ فٹ قطر کی نیچے سے اوپر تک پتھر کی بندش کے ساتھ بنائی جائے" اگر پتھر اس قسم کا نکل آئے کہ بندش کی ضرورت نہ ہو تو اور بات ہے" اس باؤلی کے ساتھ ایک طویل نالی باؤلی کے برابر عمیق کھودی جائے اور اس نالی کو تقریباً پندرہ یا بیس فٹ تک گنڈوں سے بھر دیا جائے اور اس کے اوپر دو فٹ کنکر ڈالا جائے اور کنکر کے اوپر مورم یا جو کوئی مٹی اندر سے نکلی ہو اوس کو ڈال کر نالی پاٹ دی جائے اس طرح اصل باولی جو نالی کی شکل میں ہے زمین کے اندر رہے گی اس کا پانی گول باؤلی میں آئے گا" وہاں سے موٹ یا پمپ کے ذریعہ سے نکالا جاسکے گا۔

ایسی باولی زمانہ دراز تک اچھی حالت میں رہے گی۔ کوئی چیز اوس کے اندر گر کر اس کو پُر کرنے والی نہ ہوگی اس قسم کی باولی کا خرچ بڑی گول باؤلی کے مقابلے میں بہت کم ہوگا اور چوکونی باؤلی کے مقابلہ میں تو اور بھی کم۔ اگر باؤلی کی تہہ پتھریلی ہو یا بہت سخت مورم نکلے تو یہ بھی ممکن ہے کہ باولی کی تہہ میں سرنگ لگا کر ایک یا دو نالیاں کھودی جائیں۔ اس صورت میں سرنگ لگانا اوپر سے نیچے تک باؤلی کھودنے کے مقابلے میں موجب کفایت ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ بیدر کی چند قدیم باؤلیوں میں سرنگ لگی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں بعض انجینئروں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ باؤلیوں میں سرنگ لگا کر زیادہ پانی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

تختۂ ذیل کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں میں نے اصول متذکرہ کو مثالوں کے ذریعہ واضح کر دیا ہے۔ باؤلی چالیس فٹ عمیق تصور کی گئی ہے اور یہ بھی تصور کیا گیا ہے کہ اطراف پتھر کی بندش بھی چالیس فٹ اونچی ہے۔ اس تختہ میں میں نے دس فٹ کی باؤلی کے خرچ کو جو اوسط حالات کے تحت کھودی جاسکتی ہے اساس مقرر کر کے دوسروں کا اس سے مقابلہ کیا ہے جس سے سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ اس طرح دس فٹ کی باؤلی کا رقبہ پتھر کو جو تہہ سے دس فٹ بلند ہو اکائی مقرر کر کے دوسروں کا اس سے مقابلہ کیا ہے۔ اس تختہ میں بارہ مدات ہیں اور آٹھ کالم ہیں۔ جس قسم کی باولی کی میں سفارش کر رہا ہوں اس کا نقشہ حسب ذیل ہے۔

توضیحاً اس تختہ سے جو چند اہم امور مستخرج ہوتے ہیں ان کو ذیل میں بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ تختہ کے سمجھنے میں مدد ملے۔

(۱) دس فٹ کی باؤلی کا خرچ ایک ہزار۔ ۲۰ فٹ کی باؤلی کا خرچ پانچ ہزار آٹھ سو روپیہ اور دونوں کا تناسب ۵ء۸ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو مد (۱) کالم (۳) و (۶) و مد (۳) کالم ۶۔ اب ان دونوں باولیوں کے قطر میں تو تناسب ۲:۳ کا ہے اور رقبہ پتھر میں تناسب ۳ء۸۳ کا ہے ملاحظہ ہو مد ۴ کالم ۶۔ بہ الفاظ دیگر جس مناسبت سے ہم قطر کے بڑھانے میں زیادہ رقم صرف کرتے ہیں اس مناسبت سے پانی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اب اگر میری تجویز کے موافق نالی بنانے میں اسی قدر روپیہ صرف کیا جائے جس قدر ۲۰ فٹ کی باؤلی کے لئے ضروری ہے تو پتھر کے رقبہ کا تناسب ۶ء۱۰ ہو جائے گا۔ ملاحظہ ہو مد ۱۰ کالم ۶" بہ الفاظ دیگر نالی کا طریقہ اختیار کرنے سے بمقابلہ ۲۰ فٹ قطر کی باؤلی کھودنے کے ۸ء۲۰ گنا پانی زیادہ حاصل کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے جب کہ صرفہ دونوں کا یکساں ہو ملاحظہ ہو مد (۱۱) کالم ۶۔ اس باؤلی میں نالی کا طول (۱۷۰) فٹ ہوگا ملاحظہ مد ۸ کالم ۶۔ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ نالی کی صورت میں بمقابلہ ۲۰ فٹ کی باؤلی کے جھروں یا شگافوں کی زیادتی کا امکان... $\frac{10+2}{3}$=۱۷ء۱ گنا بڑھ گیا یہ فائدہ پتھر کے رقبہ کے ۸ء۲ گنا زیادتی کے علاوہ ہے (۲) بعوض نالی اتنی طویل کھودنے کے جس کا خرچ ۲۰ فٹ کی باؤلی کے برابر ہو اگر نالی صرف اس قدر کھودیں کہ جس کا رقبہ وہی ہو جو ۲۰ فٹ کی باؤلی کا ہوگا تو میری تجویز کے موافق اس باؤلی کا خرچ بجائے پانچ ہزار آٹھ سو روپیہ کے دو ہزار چار سو کے قریب ہوگا۔



ملاحظہ ہو مد ۶ کالم ۶ گویا ۳۰ فٹ کی باؤلی کے خرچ کے مقابلہ میں جدید قسم کی باؤلی کا خرچ صرف ۳۴۳ء ہوگا ملاحظہ ہو مد ۱۲ کالم ۶ - اس باؤلی میں نالی کا طول ۵۶۶۵ فٹ ہوگا ملاحظہ ہو مد ۵ کالم ۶ ۔اگر اس میں باؤلی کا قطر بھی شامل کرلیا جائے تو جملہ طول ۶۶۶۵ ہوگا اس لئے اس باؤلی میں بمقابلہ ۳۰ فٹ کی باؤلی کے زیادہ شگافوں کے حاصل کرنے کا امکان $\frac{6665}{30}$ = ۲۲۲ء گنا بڑھ جاتا ہے یہ مزید فائدہ ہے ۔اگر آپ کالم ۵ اور ۷ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ جو کوئی باؤلی میں گول باؤلی کے مقابلہ کس قدر زیادہ روپیہ صرف ہوتا ہے اور جو کوئی باؤلی کے مقابلہ میں نالی دار باؤلی جیسی میں نے تجویز کی ہے اور بھی زیادہ مفید ہے

میں نے اسی اصول پر حضرت بابا شرف الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی پہاڑی کے قریب ایک باولی تیار کروائی ہے جہاں سے پہاڑی شریف کی آبادی کو سرکاری طور پر پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ اس باولی کا قطر تقریباً ۱۱ فٹ اور نالی کا طول ۱۰۰ فٹ ہے۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ جب تک نالی تیار نہیں ہوئی تھی باولی میں آمد بہت کم تھی اور نالی کی تیاری کے بعد آمد میں بہت اضافہ ہوگیا۔ ایک دفعہ تجربہ کرنے کے لئے موسم گرما میں ۳۶ گھنٹے پمپ جاری رکھا گیا اور پانی ۵ ہزار گیالن روزانہ کے حساب سے کھینچا گیا۔ اس کے باوجود پانی کی سطح تین فٹ سے زیادہ نیچے نہیں اتری۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ پانی کی سطح میں جب صرف ۳ فٹ کا فرق ہوجائے تو آمد دو ہزار گیالن فی گھنٹہ کی ہوگی جس کی وجہ سے آمد و خرچ ایک ہوگیا۔ اگر فرق دس فٹ ہوجائے تو تعجب نہیں کہ آمد ۵ یا ۷ ہزار گیالن فی گھنٹہ یا شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ اوپل میں بھی ایک باؤلی امتحاناً کھودی گئی تھی۔ باولی کا قطر صرف ۸ فٹ تھا اور عمق ۴۰ فٹ۔ گرمیوں میں پانی کی سطح زمین سے ۱۸ فٹ تھی جب پانی کی سطح قریب قریب نیچے تک اتار دیگئی تو فی گھنٹہ ۵ ہزار گیالن کی رفتار سے پانی آتا رہا۔ اسی کے بازو ایک نالی ۵ فٹ عریض اور ۲۴ فٹ لمبی کھودی گئی جس کا عمق بھی ۴۰ فٹ تھا۔ اس نالی میں پانی کی آمد بمقابلہ باولی کے دوگنی ہوگئی اور آخر میں جب پانی کی سطح بالکل نیچے اتر گئی تھی ۱۰ ہزار گیالن فی گھنٹہ کے حساب سے پانی خالی کرنا پڑا۔ اس کا مکمل حساب رکھا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ پانی کی کس سطح پر کس قدر آمد ہے۔ اگر یہاں سو فٹ لمبی نالی کھودی جائے تو پانی کی سطح کے صرف دس فٹ اترنے پر دس ہزار گیالن فی گھنٹہ کی رفتار سے پانی کا حاصل کرنا بالکل ممکن ہے۔ اس رفتار سے بارہ گھنٹے روزانہ پانی حاصل کیا جائے تو آبپاشی بیس ایکڑ دھان کی کاشت کے لئے کافی ہوجائے گا۔

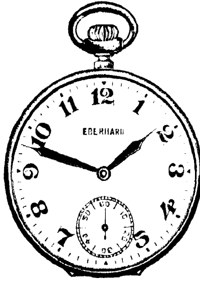
یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ان باؤلیوں کا محل وقوع غیر معمولی طور پر اچھا ہے جس کا اور جگہ ملنا دشوار ہے میں اس تجربہ کے بعد چند دوسرے مختلف مواقع کو بغور دیکھتا رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایسے مواقع ہمارے ملک میں ہزاروں ہی ہونگے یہ ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ ہر جگہ اس قدر وافر پانی والی باؤلی نہیں کھد سکتی۔ مگر ایسے مواقع بکثرت ملیں گے جہاں ایسی باؤلی کھد سکتی ہے فقط

تفصیل	باؤلی قطر ۱۰ فٹ	باؤلی قطر ۱۵ فٹ	باؤلی قطر ۲۰ فٹ	باؤلی قطر ۳۰ فٹ	گول باؤلی ۲۰×۲۰	باؤلی ۱۵ فٹ مع نالی
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
(۱) اندازہ اخراجات جو اوسط حالات کیلئے لگایا گیا ہے عمق ۴۰ فٹ	۱۰۰۰	۱۷۵۰	۲۷۰۰	۵۸۰۰	۱۱۲۰۰	فی فٹ نالی کا خرچ ۲۰ اور ۲۵ روپیہ ہوگا
(۲) باولی کی تہ اور بازو کا رقبہ ۱۰ فٹ بلندی تک جس میں سے گرمیوں میں بھی پانی بہہ نکلنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔	۵۰۰	۷۷۴	۱۱۱۵	۱۹۱۷	۲۰۰۰	حساب میں
(۳) دیگر قطر کے باولیوں کے اخراجات کا تناسب ۱۰ فٹ کی باولی کے خرچ کے ساتھ	۱	۱٫۷۵	۲٫۶۷	۵٫۸	۱۱٫۶۲	۲۵ فی فٹ
(۴) دیگر قطر کے باولیوں کے رقبہ بحر کا تناسب جو مد (۲) میں بتلایا گیا ہے دس فٹ کی باولی کے رقبہ بحر کے ساتھ	۱	۱٫۵	۲٫۲۳	۳٫۸۳	۴	طول کا خرچ لگایا گیا ہے
(۵) مختلف قطر کے باؤلیوں کے رقبۂ بحر کے مساوی رقبہ جو مد نمبر (۲) میں بتلایا گیا ہے دس فٹ کی باولی اور باقی نالی کے ذریعہ حاصل کیا جائے تو نالی کا طول کیا ہوگا۔	x	۱۱	۲۴٫۵	۵۶٫۵	۶۰	
(۶) رقبۂ بحر متذکرہ مد (۵) حاصل کیا جائے تو اس کا خرچ کیا ہوگا	۱۰۰۰	۱۲۷۴	۱۶۱۵	۲۴۱۷	۲۵۰۰	
(۷) خرچ مندرجہ مد (۶) کا تناسب ۱۰ فٹ کی باولی کے خرچ کے ساتھ	۱	۱٫۲۷	۱٫۶۱	۲٫۴۱	۲٫۵۱	
(۸) اگر ایک دس فٹ کی باؤلی اور باقی ۵ فٹ عریض نالی بنائی جائے جس کا جملہ خرچ وہی ہو جو مختلف قطر کے باؤلیوں کا ہوتا ہے تو نالی کا طول کیا ہوگا۔	x	۳۰	۶۸	۱۷۲	۴۰۸	
(۹) باؤلی اور نالی مندرجہ نمبر (۸) کا رقبۂ بحر کیا ہوگا	۵۰۰	۱۲۵۰	۲۲۰۰	۵۳۰۰	۱۰۷۰۰	
(۱۰) رقبۂ بحر مندرجہ مد نمبر ۹ کا تناسب دس فٹ کی باؤلی کے رقبۂ بحر کے ساتھ۔	۱	۲٫۵	۴٫۴	۱۰٫۶	۲۱٫۴	
(۱۱) رقبۂ بحر مندرجہ مد نمبر ۹ کا تناسب رقبۂ بحر مندرجہ مد ۴ کے ساتھ اس تناسب سے معلوم ہوگا کہ جب خرچ ہر دو صورتوں میں ایک ہو تو نالی ✲ کھودنے میں بمقابلہ صرف بڑی باؤلی کھودنے کے مقابلہ میں کس قدر پانی زیادہ ملنے کی توقع ہے۔	۱	۱٫۶۶	۲	۲٫۶۸	۵٫۱۳	
(۱۲) خرچ مندرجہ مد نمبر ۶ کا تناسب خرچ مندرجہ مد نمبر ۱ کے ساتھ اس تناسب سے معلوم ہوگا کہ جب نظر القول سے ہی ایک رقبۂ بحر حاصل کیا جائے تو نالی کے ذریعہ حاصل کرنے میں بمقابلہ وسیع قطر کے باولیوں کے ذریعہ حاصل کرنے کے کس قدر کفایت کی توقع کی جاسکتی ہے۔	۱	۱٫۷۲	۱٫۶۰	۱٫۴۳	۱٫۲۲	

ویسٹ انڈ واچ ریکارڈ ایبرہارڈ فیورلوبا

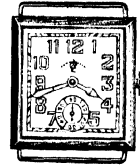
کارخانہ کے

جیبی دستی گھڑیاں' کلاک الکٹرک کلاک وغیرہ



کا نیا اسٹاک

بمبی کلکتہ مدراس



کے داموں پر ہم سے خریدئیے

چندی رام برادرس سلک مرچنٹ

۱۱۵ آکسفورڈ اسٹریٹ سکندرآباد دکن

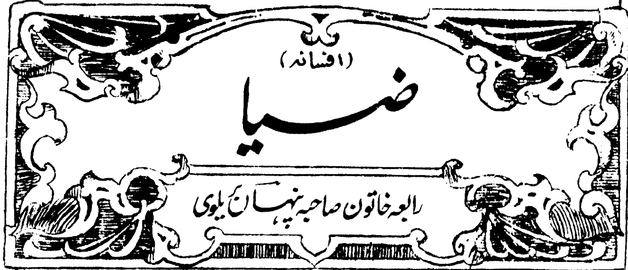
Chandiram Bros.,

115, Oxford Street,

SECUNDERABAD-Dn.

Chandrakanth Press, Hyd.-Dn.

Chaudrakanth Press, Hyd.-Dn.



آہستہ خرام شام کی مخمور و مکیف رنگینیاں فضائے بسیط کو ایک ارغوانی چادر میں ملفوف کر رہی ہیں۔ سورج کی آخری کرنیں سبز و زرد ٹہنیوں اور سرخ و سپید پھولوں سے گلے مل مل کر رخصت ہو رہی ہیں۔ دامانِ سبزہ شبنم کے صاف و شفاف موتیوں سے جواب آسمان بن رہا ہے' گل مکیف اور سبزہ بدامن وادی کے پہلو بہ پہلو سپید دریا کی سبک روی داماں کوہ کا حاشیہ اور گریبان مرغزار کی بیل کا سا منظر پیش کر رہی ہے۔ نرم رو ہوا کے نازک جھونکے ایک جانب سیم گوں موجوں کو کچھ ہلکے اور سکون ہلکورے دے رہے ہیں اور دوسری جانب سربند شگوفوں اور نیم باز کلیوں کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس تبسم پھیلاتے گزر رہے ہیں۔

وادی کے ہرے بھرے اور نظر کش مناظر کچھ اس درجہ جاذب توجہ واقع ہوئے ہیں کہ دلدادگان فطرت کے لئے اس سے بہتر تباہ کن قلب دوسری جگہ نہیں ہو سکتے۔ اس وقت خصوصیت سے منظر بے حد دل فریب اور متاثر کرنے والا ہے۔ سطح افق پر شفق کی خارنگ بیلیں بے پروائی سے بکھری ہوئی ہیں جس کی لالہ گونیوں سے تپتی نیا میں ارغوانی انعکاس عجیب مسحور نظارہ پیدا کر رہا ہے۔

عوام کی سہولت کا لحاظ کرتے ہوئے وسط دریا میں ایک مختصر سا چوبی پل قائم کر دیا گیا ہے۔ جس کے گزرنے والے پہاڑی کے سبزہ اور ٹھنڈے نظاروں سے ہمہ وقت لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن پل کے اس جانب دامن سبزہ میں اس وقت کچھ ایسا مدہوش کن جلوہ اور اس قدر سحر آفریں منظر جگہ کئے ہوئے ہے کہ اس نے یا تو جملہ لطافتوں کو پھیکا کر دیا ہے یا اپنی شعلہ تابیوں سے ہر ذرہ کو آئینہ تاب بنا رکھا ہے۔

آغوش کشمیر کی ناز پروردہ دوشیزہ ضیا اپنے اپنے محبوب شغل مصوری کا سامان لئے ہوئے بعد انداز بے نیازی جلوہ گستر ہے۔ صہبا فریب آنکھیں شراب کوثر کو پیغام بے خودی دے رہی ہیں۔ لالہ گون رخساروں کی تابانی صبح بہار پر خندہ زن ہے۔ قوس زیب یاقوتی ہونٹوں سے سرخ تابشیں پھوٹ پھوٹ کر منظر کو تابناک بنا رہی ہیں۔ تحرک مژگاں خرمن احساس پر بجلیاں گرانے کے لئے مستعد اور خم ابروئے پیوستہ نگاہ تخیر کو دو نیم کر دینے پر آمادہ کھلی ہوئی کاکلوں سے ہوا کے گداز جھونکے اٹھکھیلیاں کر رہے ہیں۔ ریشمی لٹیں بار بار گالوں پر آپڑتی ہیں خفیف الجھ کر پیچھے سر کا دینے کا نظارہ کس درجہ ہوش شکن ہے پلکیں جھکی ہوئی ہیں۔ سبزہ زار کے دلکش مناظر مقصود تخیل ہیں اور دست یاسمیں موقلم میں مصروف۔

دفعتہً ضیا کھڑی ہو گئی اور رفتار بے پروا سے بار بار ہچکولے کھاتی اور سبزہ میں الجھتی ہوئی پل پر چڑھ گئی۔ طوفان انگیز ہواؤں کے محشر خیز جھونکوں نے پل کا ایک تختہ ہلا ہلا کر کچھ آڑا سا کر دیا ہے۔ جس سے یہ جگہ ایک خطرناک شگاف بن گئی ہے آمد و رفت کے لئے مشکل کا سامنا ہوتا ہے بصد احتیاط و بہ ہزار دشواری یہاں سے گزر کیا جا سکتا ہے۔ ضیا نے غور سے شگاف کو دیکھا۔ فکر و ترحم خزینۂ دماغ میں موجزن ہو گئے۔ "اندھیرے میں اگر کوئی ناواقف اس کے اندر جا رہے تو۔ یا کوئی بچہ معصوم ...... (کانپ کر) اُف توبہ ....

بھلا معلوم نہیں لوگ اس درجہ بے پروا کیوں واقع ہوئے ہیں اتنا سا کام کسی سے نہیں ہوتا کہ اسے سیدھا کر دے" نازک ہاتھوں نے بھولے پن کے ساتھ رخ گلگوں سے لٹیں پیچھے سرکائیں اور مستعدی سے تختہ سیدھا کرنے میں قوت آزمائی کرنے لگے لیکن ان ہاتھوں سے جنھیں نسیم سحر کا ہلکا سا لمس بھی دکھا دے یہ تختہ کیا سیدھا ہوتا۔ محراب جبیں پر ضعف تکان سے پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح چُن گئے۔ کلائیوں میں درد ہونے لگا لیکن پائے چوبیں رکھنے والا تختہ سنگین جنبش بھی نہ کر سکا۔

مایوس و پژمردہ ضیا بے کیفی سے پل سے اتری اور سست قدمی سے اپنی جگہ آکر بیٹھ گئی۔ امیدوارانہ نظریں اُس غیر معروف و ناہموار گزرگاہ پر منتشر ہو گئیں' جو گھنے درختوں اور خطرناک جنگلوں سے گزر کر کچھ دور بعد شہر کو ایک سیدھا راستہ بناتی چلی گئی تھی۔ نہ معلوم دل میں کونسے جذبات اور کشش موجزن ہے جو نگاہوں کو واپس آنے کی اجازت نہیں دیتی۔

گرد و غبار کے بگولے دامن صحرا سے بل کھاتے ہوئے نکلے اور فضائے آئینہ سا پر چھا گئے۔ دامن گرد سے ایک عربی رہوار پیاری پیاری چال سے آہستہ خرام آکر سبزہ زار میں رک گیا۔ شہ سوار گھوڑے سے کود کر نیچے اترا۔ پیارے مرکب کی کمر تھپتھپائی باگ پشت پر ڈال دی اور بے پروائی سے ادھر مڑ گیا۔ لیکن .... نگاہیں ملیں۔ شعلہ سا بلند ہوا اور چار آنکھیں دفعتہً زمین میں گڑ گئیں۔

ضیا کی پیشانی پر وفور ندامت و خجالت سے پسینہ آگیا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور بے ساختہ ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر رہ گئی۔ نووارد کے تمام مقاصد آن واحد میں منتشر ہو گئے' وہ پتھر کی مورت بنا ہوا تھا اور پتلیاں تحرک سے بے خبر ہو کر قلب چشم میں ساکت۔ ضیا نے ڈرتے ڈرتے .... آنکھیں ذرا اوپر کو اٹھائیں کن انکھیوں سے دوبارہ نظر ڈال اور جھجک کر سر جھکا لیا مے لعلین کا وہ نموج جو خزانہ چشم میں شرم و حیا سے ہلکورے لے رہا تھا نوجوان کو عقل و خرد سے مطلقاً بیگانہ کر گیا۔ قریب تھا کہ دماغ توازن الجھے قلب و روح کھنچ کر آنکھوں میں جمع ہو جائیں اور وہ آغوش سبزہ میں مدہوش ہو کر گر پڑے گا دفعتاً ہوش سا آگیا۔ اور لڑکھڑاتے قدموں سے قریب کے پتھر پر بیٹھ گیا۔ سر دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا اور بے ربط سانس کو درست کرنے کی کوشش ہونے لگیں۔

ضیا نے موقع غنیمت دیکھ کر چپکے سے سر اٹھایا اور بغور اس سراپائے شباب و رعنائی کو ملاحظہ کرنے لگی عمر تقریباً ۲۱، ۲۲ سال۔ مردانہ حسن و جمال شادابی و گلزار شباب و عروج وقار و بے نیازی' طاقت و قوت کا مکمل و بے مثال نادر و بے نظیر مجموعہ۔ جس میں قدرت کی بہترین صناعیں اور لطافتیں سمٹ کر جمع ہو گئی تھیں۔ اسکی پتلیاں کانپ گئیں اور دھڑکتے ہوئے دل سے آنچل پیشانی پر درست کرنے لگی۔

نوجوان نے سر اٹھایا۔ ضیا کا سر جھکا ہوا تھا اور ہاتھ پیشانی پر آنچل درست کر رہے تھے۔ کچھ عجیب مضطرب کیفیت سے نوجوان کا سینہ ہل گیا۔ ایک آہ کنار لب پر منتشر ہو گئی۔ اور ہونٹ سوسی ہو گئے۔

رش کی مخمور تاریکیاں بڑھنے لگی تھیں۔ ضیا کو یکایک ہوش آگیا اور گھبرا کر سامان تصویر کشی سنبھالنا شروع کیا۔ بے ساختہ اور بے ارادہ نوجوان لغزیدہ قدم قریب آگیا۔ ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز نے ضیا کو چونکا دیا "خاتون.... کیا میں مدد کر سکتا ہوں......" مست اور شرمگیں آنکھیں اٹھ گئیں اور پھر جھکتی ہوئی زمین سے مل گئیں۔ "جی شکریہ...... مجھے آپ کی مدد کی ایک دوسری جگہ ضرورت ہے..... کیا آپ اتنی تکلیف گوارا فرما سکتے ہیں......" مسرت و حیرت کا گلابی پرتو نوجوان کے گالوں پر چھا گیا "ضرور.... ضرور کیوں نہیں۔ جو خدمت میرے لائق" "تو تشریف لائیے" ضیا سر جھکائے پل پر آگئی۔ "پس پشت نووارد بیکر تحیر بنا ہوا" "یہ تختہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے میں نے چاہا تھا کہ اسے برابر کر دوں۔ لیکن میری قوت بے کار ثابت ہوئی۔ کیا جناب....." "بہت بہتر" ایک تکلم ریز آواز بلند ہوئی اور شہ زور نوجوان کے سپید و مضبوط ہاتھوں نے آن واحد میں تختہ سیدھا کر دیا۔ وہ سیدھا ہوا اور فاتح و مسرور نظریں برابر والے لطیف و معصوم چہرے پر گڑ گئیں۔ ضیا کا سر جھک گیا گالوں میں سرخی آگئی، باریک ہونٹوں میں ایک تموج پیدا ہوا اور وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں شکریہ ادا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ نوجوان نے ہاتھ کے اشارہ سے روکا کیوں کہ طاقت گویائی جواب دے رہی تھی دونوں آہستہ آہستہ پل سے اترے۔ ضیا اپنا سامان پھر سنبھالنے لگی۔ نوجوان کی نے نور آنکھیں ایک انداز حسرت سے اس کے رخساروں پر جمی ہوئی تھیں "کیا میں اس...... لطیف تعارف کے ذریعہ نام معلوم کرنے کی جسارت کروں۔ یا صرف ایک خواب حسین کے دماغ پر طاری رہے گا" "ناچیز...... کو ضیا....." "کیا میں اپنے محسن کا اسم گرامی...... معلوم نہیں کر سکتی" "...... خادم سہیل......" "شکریہ۔ شکریہ اچھا رخصت، آداب......" "براہ مہربانی ذرا توقف" "فرمائیے" "...... کیا ہم پھر..... کبھی مل سکتے ہیں....؟" "کہا نہیں جا سکتا......" اور وہ آہستہ آہستہ چلکر درختوں کی آڑ میں تھی نیم بسمل نظریں کمر تک سبزہ زار پر دور تک لوٹتی چلی گئیں مگر اب نا کامی تھی...

(۲)

محبت کے چشمۂ شیریں کی وہ غیر محسوس لہر جو ایک دلنشین انداز سے عالم بے خبری میں آنکھوں سے اتر کر سینہ میں کھو جاتی ہے کتنی پر کیف ہے الفت کے ترکش کا وہ بے انداز تیر جو اچانک نظروں کو چھیدتا ہوا قلب کو صد رہا کر دیتا ہے، کس درجہ لذت درد و خلش اپنے اندر محفوظ کئے ہوئے ہوتا ہے بے خبری، بے ساختگی، غیر ارادی اور غیر متوقع، افسانہ محبت کے رنگین عنوان ہیں اگر سہیل کے کشور تخیل پر معصوم ضیا کی حسین تصویر پہلی نظر میں حکمراں ہو گئی تھی تو نا واقف اور کم سمجھ ضیا کے نگار خانۂ قلب میں بھی سہیل کی پاکیزہ مورت محفوظ تھی محبت کی مشتعل اور الہڑ خلشیں دیر تک اس تڑپ کو پوشیدہ رکھنے پر قادر نہ ہو سکیں۔ کیونکہ دونوں بالکل سادہ تھے۔ تصنعات و ظواہر سے دور حقیقت پرست و بے تکلف۔ غیر ارادی طور پر خود بخود قلبی کیفیات دونوں قلوب پر منکشف تھیں۔ ضیا حسب معمول اس آماجگاہ حسن و ناز وادی میں روزانہ مو قلمی کے لئے آتی تھی اور بلا ناغہ سہیل کو چشم براہ پاتی۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم کھل جاتا جسے ضبط کرنے کے لئے ہونٹ چبا چبا کر رہ جاتی۔ اس میں ٹپکتا تھا ایک مسرور کیف اور ایک خندۂ تمسخر جو محبت کی بے خودانہ وارفتگیوں پر کیا جاتا۔ گھنٹے گزر جاتے اور ان مدہوشان الفت کی داستان ہائے حسرت و یاس الم و غم کبھی ختم ہونے میں نہ آتی۔ سہیل کے اظہار جذبات میں متانت بھی تھی اور وارفتگی بھی، اور کم سن و سادہ مزاج ضیا کے طرز کلام میں بے ساختگی اور بھولا پن۔ دن گزرتے گئے بے تکلفی بڑھی۔ ہم خیالی و ہم آہنگی ترقی پذیر ہوئی اور ایک دوسرے کے حالات و خیالات سے کما حقہ واقف ہو چکے تھے۔ محبت کی عنبرین فضاؤں میں سانسیں اور وارفتگی کی سکون آغوش میں نیندیں لیتے ہوئے کچھ عرصہ گزر گیا۔ سہیل کی تمنا تھی کہ یہ اتحاد روحانی و موانست قلبی ظاہری نگاہوں میں بھی یگانگت کی شکل اختیار کرے اور دو روحیں باہم اور مکمل متحد و متفق ہو کر زندگی بسر کر جائیں۔ ضیا مسکرا مسکرا کر رہ جاتی تھی اور یہ الفاظ زبان سے بے ساختہ نکل جاتے "سہیل کیا میں تم سے منحرف ہو سکتی ہوں"

۳

فلک کی ریشہ دوانیوں سے مطلق بے خبر حادثات دل شکن کے زبردست حملوں سے قطعاً نا واقف محبت کی پاک و بے لوث پرستش میں مہ جبین ضیا اور حسین سہیل کی زندگی کی حسین ساعتیں بسر ہو رہی تھیں۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ سحر مسرت کے سر پر شام غم کی تاریکیاں آہستہ آہستہ مسلط ہونے والی ہیں اور انھیں خبر نہ تھی کہ بہار سکون و راحت میں عنقریب خزان نامراد کے ہوش شکن جھکڑ چلنے والے ہیں۔ محبت کی جوش آفرینیاں لالہ زار کے ذرہ ذرہ کو جوشش ہیجان سے خونیں دیکھتی تھیں۔ اور الفت کی وحشت نوازیوں کو پتی پتی میں محبوب دلنواز کی سراپا ناز تصویر پوشیدہ نظر آتی تھی۔ نظر فریب پہاڑی اور روح نواز دامان کوہ ان پرستاران الفت کا گہوارۂ تماشا یا معبد پرستش تھا۔ جہاں وقت کا بہترین حصہ نظارۂ حبیب اور پرستش وفا میں بسر ہوتا تھا۔ کبھی معصوم ضیا کے باریک لب محو ترنم ہوتے تو کبھی سہیل کی سپید انگلیاں ستار نواز۔ کبھی مناظر کی تصویر کشی کی جاتی تو کبھی رخ محبوب کی عکس نگاری۔ ضیا منہ چھپا چھپا کر بھاگنے کی کوشش کرتی اور سہیل اس کے آئینہ رخ کی مو قلمی کرنے کی سعی ناکام۔ کبھی ہونٹوں پر ایک شگفتہ تبسم کھل جاتا اور کبھی آنکھوں میں چمک دار آنسو چھلک جاتے۔

محافظان ظاہر کی نکتہ جو نگاہیں جو قدم قدم پر ضیا کی نگہبان تھیں بہت جلد اسرار مخفی سے مطلع ہو گئیں۔ ریاض ایران کے گل تر سہیل سے پیاری ضیا کی حسین نظروں کا ارتباط تعصب پرست آتش مزاج نواب کے خرمن تحمل پر بجلیاں گرا گیا۔ تحقیقات کی گئی اور آنے والی مصیبتوں سے بے خبر ضیا عالم بے خبری میں استبداد کی زنجیروں میں گرفتار ہو گئی۔

موسم سرما میں رات کے آٹھ بجے کا وقت جملہ بخ بستگیوں کو آغوش میں لئے ہوئے ذرہ ذرہ کو ٹھٹھرا رہا تھا۔ کمرۂ خواب میں دہکتے ہوئے آتش دان کے قریب مخملی کرسی پر ضیا اپنی جمال طرازیوں سے بے خبر ادائے سادہ سے جلوہ گستر تھی۔ تصور نظارۂ جمال کی پرستش میں محو تھا اور پتلیاں حرکت سے ساکن۔ کبھی کبھی مسرت کا گلابی پردہ نشیلی پلکوں پر چھا جاتا، دروازہ کا پردہ آہستگی سے سرکایا گیا، کسی نے مخفی انداز سے اندر جھانکا، دو لمحے ضیا کی محویت کا اندازہ لگایا گیا، اور پھر آہستہ سے اندر آکر کرسی سرکا لی، کرسی کی آواز نے ضیا کو چونکا دیا، اس نے جھجھک کر سر اٹھایا۔ والد کو موجود دیکھ کر کچھ خوشی اور کچھ گھبراہٹ سے دل دھڑک گیا، وہ گھبرا کر اٹھی اور قریب آکر پیار سے شانوں پر ہاتھ رکھدیئے۔ انھوں نے بے پروائی سے ہاتھ علحدہ کرتے ہوئے بے کیف لہجہ میں کہا "بیٹھو مجھے کچھ کہنا ہے" اس تلخ اور بے پروا برتاؤ نے دفعتہً ضیا کا دل تڑپا دیا، اس کی عقل چکرا گئی، پیر کانپ گئے اور بے ساختہ آنکھوں میں آنسو بھر گئے اور تلملاتی ہوئی اپنی کرسی پر گر پڑی۔

"ضیا! (ایک دل خراش آواز) گزشتہ آٹھ، دس ماہ میں جو واقعات گزرے اور جو کچھ تمھاری ذات خلف سوز سے ظہور میں آیا اسکی کلی اطلاع مجھے مل چکی ہے۔ آہ

ضیا مجھے تم سے کبھی ایسی توقع نہ تھی، میں کبھی امید نہیں کرسکتا کہ تمھاری تربیت و تعلیم جوہر حیا و پاکیزگی عزت نفس و خاندان دم بھر میں اس طرح خاک میں ملجائے گی۔ تم نفس کی پرستش اور حیا سوز خیالات سے اس قدر مغلوب ہو جاؤگی کہ اپنی اصلیت اور عصمت کو دفعتہً فراموش کر بیٹھوگی۔ میرا دل مجھ پر ہزار لعنتیں برسار ہا ہے کہ میں نے تمھیں اتنا آزاد اور غیر محفوظ کیوں رکھا۔ میں نے تم پر تمھاری والدہ کے بعد بھی بلکہ پہلے سے زیادہ ہی اعتبار و بھروسہ رکھا۔ تم پر کبھی قید رواسم کی پابندیاں عاید نہیں کیں محض اس لئے کہ میں تم پر اعتماد رکھتا تھا۔ لیکن افسوس تمام خیالات محض بے بنیاد ثابت ہوئے۔ تم نے مجھے اپنے نفس کے آگے کسی قابل نہیں رہنے دیا۔ اور دنیا میں منہ دکھانے کے لائق باقی نہیں چھوڑا، اب تمھارا منحوس چہرہ اور ننگِ حیا وجود دیکھنے کی طاقت اپنی آنکھوں میں نہیں پاتا.....“ ضیا برگ چنار کے مانند تھرارہی تھی اس کی خونیں آنکھیں اور نازک لب سوتی ہو رہے تھے۔ مسلسل ہچکیوں سے کلیجہ تڑپ رہا تھا اور پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ آخری الفاظ پر وہ مارگزیدہ کی طرح اچھل پڑی۔ سر اٹھایا۔ آنکھیں سلگ رہی تھیں اور آتش غیرت سے رخسار شعلہ تاب بن گئے تھے۔ دہکتے ہوئے ہونٹ کھل گئے۔ ”ابا جان، میرے پیارے ابا جان! یہ ضرور ہے کہ مجھے آپ کے سامنے اظہار خیال کی جرأت مناسب نہیں ہے، جو کچھ خیالات آپ نے مجھ گنہ گار کی نسبت قائم کئے ہیں اُن کی تردید کی جسارت نہیں کرسکتی لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ میری قسمت آمادۂ عناد ہے۔ آہ، نوبت یہاں تک پہونچی کہ ضیا کی جان و دل اور عصمت و حیا پر حرف آنے لگا۔ ابا جان! آپ کو میرے متعلق نہایت درجہ غلط اطلاعات پہنچی ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ میرا دل سہیل کی پاک و پاکیزہ محبت میں اسیر ہو گیا ہے ——— لیکن پیارے ابا میں بحلف آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میری محبت قطعاً نفس پرستی سے پاک اور محض بے لوث و حقیقی ہے۔ آہ کیا آپ کو واقعی یقین ہے کہ ضیا اس درجہ بے حیا اور عصمت شکن ہوگئی۔ اچھے ابا! آپ کی پاکیزہ تعلیم اور سچی تربیت میرے صحیفۂ قلب سے محو نہیں ہوئی۔ یقین کرو ابا میں اب بھی آپ کی پہلی سی ضیا ہوں.....“ ہچکیوں کے تواتر نے سلسلۂ سخن منتشر کردیا اور ضیا بے قرار ہو کر باپ کے قدموں پر گر پڑی۔ ”میرے اچھے ابا! مجھے معاف کردیجئے، بخش دیجئے۔ مجھ سے بدگمانی نہ کیجئے، یقین کیجئے، سہیل ملک سیرت ہے وہ سراپائے عفت و پاکیزگی ہے، اس کی بے لوث اور بے غرض الفت نے ہی مجھے اس کا گرویدہ بنادیا.....“

”بس بس میں زیادہ سننا نہیں چاہتا۔ اگر تم حقیقت میں باعصمت اور صادق العقل ہو تو آئندہ کم ظرف و کمینہ خاندان سہیل کا خیال دل سے مطلق بھلادو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔“ ”آہ ابا جان.....“ ”میرے ابا..... ایک بدنصیب ہستی کی آرزوؤں کو اس طرح برباد نہ کیجئے۔ سہیل کی زندگی مجھ سے وابستہ..... ہو چکی ہے مجھے اپنی بالکل پروا نہیں، میں آپ کی مرضی پر بہ آسانی قربان ہو سکتی ہوں۔ اس ناچیز و بے بنیاد ہستی کی کیا حقیقت ہے اپنا دل پامال کر ڈالوں گی اور آپ کے حکم پر جان دے دوں گی۔ لیکن سہیل آہ وہ مٹ جائے گا تباہ ہو جائے گا، ایک قابل قدر اور انمول زندگی مایوسیوں کی ٹھوکروں سے خاک میں ملجائے گی اور اچھے ابا! یہ خون ناحق آپ کی گردن پر نہ آجائے۔ دکانپ کر، میرے ابا! اپنے اوپر بھی رحم کیجئے۔“ ”(سختی سے) بدبخت گستاخ، خبردار۔ بس ایک صرف ایک جواب۔“ ضیا جواب دینے کی جرأت نہ کرسکی اس کے ہونٹ ہل کر رہ گئے۔ ”چھوڑ سکتی ہو یا نہیں“، ”عزت عزیز ہے یا محبت؟“

ایک والہانہ اور مدہوشانہ غیر ارادی اور بے ساختہ لفظ ضیا کے ہونٹوں سے نکلکر منتشر ہو گیا۔ ”آہ محبت“۔ اور وہ دوبارہ قدموں پر تھی۔ ”نواب تھرا کر اچھل پڑے ”بس اسی لمحہ میرا امکان اپنے ناہنجار وجود سے خالی کردو۔ آج سے تو میرے دائرہ الفت و ترحم سے باہر ہے.....“ ایک ٹھوکر سے سر دور کردیا گیا اور مغرور و پُر غضب رفتار سے کمرے سے باہر تھے..... ایک فلک شگن چیخ بلند ہوئی اور ضیا آغوش قالین میں بے ہوش تھی۔

۴

”سہیل تمھاری آوارہ گردیوں نے مجھے مجبور کردیا کہ میں تمھیں متنبہ کردوں جو کچھ تم کر رہے ہو مجھے علم ہو چکا ہے۔ میں تمھاری صورت سے بیزار ہوں۔ تم نے تعلق اور پھر وہ بھی ناجائز وہاں پیدا کیا جو ہمارے لئے ہمارے خاندانی وقار و عظمت کے لئے باعث ننگ ہے۔ میں تا زندگی اس ذلت کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اس وقت فیصلہ کردو تم کیا ارادہ رکھتے ہو۔“ سہیل نے اشک ریز آنکھیں اونچی کیں مسترحم نظروں سے ماں کو دیکھا۔ جن کی آنکھوں سے غیظ و غضب کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

”پیاری اماں جان، سہیل بیشک گنہ گار ہے کہ آپ کو اپنی کیفیات قلبی سے اب تک آگاہ نہیں کرسکا۔ لیکن پیاری اماں اس کا شیشۂ حیا غبار سے آلودہ نہیں ہوا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ میں نے آپ کی تعلیم و تربیت فراموش کرڈالی۔ کیا میں ایسا نفس پرست ہو جاؤں گا۔ پیاری اماں! ہرگز نہیں۔ میں یوں ہر طرح آپ کا تابع فرمان ہوں لیکن ضیا۔ آہ اس کے بغیر میری زندگی ناممکن ہے..... میں جسم ہوں اور ضیا روح رواں بغیر اتحاد جسم و روح زندگی کس طرح ممکن ہے۔ اپنے پیارے سہیل پر ترس کھانے اور اس کو مایوسیوں کے خونخوار پنجوں سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا آپ کا دل تیار نہ ہوگا.....“

وہ تڑپ کر رونے لگا۔ ”سہیل مجھے تمھاری یہ کمزوریاں ہرگز نرم نہیں کرسکتیں، میری الفتِ مادری اس وقت سرد ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ تم میری زندگی میں وہاں تعلق کرو اور اگر تم واقعتاً ناخلف ثابت ہوئے تو میری جائداد پر تمھارا کوئی حق باقی نہیں رہے گا۔“ ”اما جان! مجھے جائداد کی مطلق پروا نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میں آپ کی الفت و شفقت سے محروم ہونے پر آمادہ نہیں ہوں۔ لیکن پیاری اما جان ضیا کو چھوڑ دوں! آہ یہ کیسے ممکن ہے..... (ہچکی لیکر) جس کے تصور و فراق نے سیکڑوں راتیں تارے گنوا کر اور ہزاروں دن تڑپا کر گزارے ہیں اس راحت زندگی کا خیال کیونکر بھلادوں۔ آہ اس قدر ظلم آپنے سہیل پر کس طرح روا رکھیں گی؟ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) للٰہ میری زندگی برباد نہ کیجئے۔“ (ہاتھ جھٹک کر) ”اگر تم میرا حکم ماننے پر تیار نہیں ہو تو آئندہ میں تمھاری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوں۔“ سہیل نے بیکسی سے ماں کی جانب دیکھا۔ ”بس بس میں زیادہ گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی، وصیت نامہ آج ہی تبدیل کردیا جائے گا۔ تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے والد اپنی زندگی میں اپنی جائداد کا وارث بھی مجھے قرار دے گئے تھے اس لئے مجھے اختیار ہے کہ تمھیں اس سے بھی محروم کردوں میں بصد خوشی تمھیں عاق کرتی ہوں فوراً میرے سامنے سے دور ہو جاؤ۔“ سہیل جھک کر سلام کیا اور ہچکیوں کے ہچکولوں میں لڑکھڑاتا ہوا مکان سے باہر تھا۔

۵

موسم سرما کی رات اور بارہ بجے کا وقت۔ اُف سردی کی ستم نوازیاں ناقابل برداشت ہیں۔ دامن کوہسار کی برف پوش وادی کے سبزہ زار میں ایک پتھر پر ضیا خاموش بیٹھی ہے۔ کوہستانی ہواؤں کے ٹھنڈے اور برف بار جھونکے دل کے کنگرے اڑائے دیتے ہیں۔ آسمان صاف ہے اور تارے انتہائی سکوت و خاموشی سے نظارہ کناں۔ گرد و پیش ایک گہری حسرت و الم کا تسلط ہے۔ ہوا کے جھونکے بھی غمناک ٹھنڈی آہیں

بھرتے معلوم ہوتے ہیں۔ پاؤں کی سی چاپ بلند ہوئی۔ محو الم ضیا نے چونک کر سر اٹھایا، کچھ ایسا منظر نگاہوں نے دیکھا کہ آنکھیں تاب نہ لاسکیں اور وہ ایک زبردست چیخ کے ساتھ بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ سہیل اس خلاف توقع اور جانستان نظارے سے بے تاب ہوگیا، وہ والہانہ آگے بڑھا اور جھک کر بدنصیب ضیا کو اٹھالیا۔ جس کی خونین آنکھیں نیم باز اور سونی لب تھرا رہے تھے۔ رنگ رخ محضر یاس اور ہلالی پیشانی مرکز الم بنی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد دکھتی ہوئی آنکھیں بصد مشکل کھلیں۔ "آہ کیا حال ہے۔ میرے خورشید امید کی چمکتی ہوئی کرن، میرے گلشن آرزو کی نکہت ریز پھول، میری ضیا! للہ بتاؤ یہ کیا حال ہے آہ یہ دسمبر کی برف بار رات اور اس سرد تر وادی میں نازک نظر ضیا کا یوں غرق اندوہ ہونا اے فلک تیرا کیا منشا ہے۔ آہ بدنصیب سہیل کی آنکھیں یہ نظر سوز اور جگر خراش منظر دیکھنے کے لئے کھلی ہوئی ہیں"۔ ضیا نے تڑپ کر سہیل کے بازوؤں میں سر ڈالدیا وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ سہیل کی آنکھیں بھی خونچکاں تھیں۔ بے خبر کتنا وقت گزر گیا۔ اندازہ نہیں یہاں تک کہ دونوں برگشتگان قسمت کی حالت مرکز اعتدال پر آنے لگی۔ سہیل کے بار بار اصرار پر ضیا نے اپنی المناک داستان دھرائی" اور کہا "سہیل تم یہاں کس طرح آہ میں تو اپنے شاہد عہد وفا کوہسار اور پیارے دلربا سے رخصت ہونے آئی تھی ......" ضبط کی طاقت باقی نہ رہی۔ شدت الم اور وفور جذبات نے دوبارہ بیہوش کردیا۔ سہیل نے امکانی تدبیریں صرف کیں۔ بصد مشکل کچھ دیر بعد حواس درست ہوئے اب سہیل نے بھی داستان غم سنائی۔ "آہ ضیا اب کیا ارادہ ہے" (سسکتے ہوئے) تم کیا سمجھتے ہو" "ضیا تمہارے اس قابل صد پرستش جذبہ کا میں کہاں تک شکریہ ادا کروں کہ تم نے میری زندگی اس درجہ قیمتی خیال کی۔ اور صرف میرے لئے اپنے والد کے معتوب اور اپنے عزیز ترین محل سے محروم ہوگئیں، اگر ایسی کروڑ جانیں بھی اس پائے وفا پر نثار کردی جائیں تو معاوضہ ممکن نہیں۔ تو کیا پھر اب بھی میں اس تصویر محبت اور مجسمہ وفا کی حقیقی پرستش سے محروم رہوں گا۔

"عزیز دل ضیا! کیا تم تیار ہو کہ اس گنہگار کی محبت قبول کرو جس کی بدولت تمہیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا۔ اگرچہ انصاف کے خلاف ہے، لیکن میں کچھ تو تلافی کرسکوں" "سہیل۔ مجھے اس قدر شرمندہ کیوں کرتے ہو۔ یہ بدنصیب کس قابل ہے۔ اب جبکہ میں گھر ہی سے محروم ہوگئی تو پھر تم ہی بتلاؤ کہ ظاہرا صورت میں بھی سوائے تمہارے میرا کون ٹھکانا ہے۔ اگرچہ باطناً تو ہر حال اور بہر صورت میں، میں تمہاری تھی اور تمہاری ہی رہتی۔ البتہ بقیہ ایام زندگی اس روح شکن داستان کی سوگواری میں بسر ہوں گے۔ آہ ......" "تو بہتر ہے کہ ہم لاہور چلکر کسی گوشۂ عزلت میں مقیم ہو جائیں اور حیات مستعار محبت کی پرستش میں بسر کردیں یہاں تک کہ موت کا فرشتہ ہمیں اپنے سایہ میں لے لے"

نگوں سر اور سست قدم قافلہ یادل زخم خوردہ روانہ ہوگیا

۶

ہوٹل کے چند کمرے محبت کی دو موزنوں کے انوار قلوب اور بہار جمال سے تجلی در دامن ہیں سہیل و ضیا مشعل الفت کی روشنی میں اپنی زندگی ہستی کے جملہ علائق سے بے نیاز رہ کر گزار رہے ہیں۔ ضیا کے درد و غم نے کچھ دنوں تک اسے ایک جانکسل علالت میں مبتلا رکھا۔ ہمہ وقت اس کا دماغ گزرے ہوئے افسانہ کی یاد دھراتا اور آنکھیں اس عجیب و غریب سزا اور تذلیل پر آنسو بہاتیں۔ لیکن جان نثار سہیل کی قلبی کاوشیں اور خدمتیں آخر موثر ہوئیں کریم حقیقی نے اس کے حال پر رحم فرمایا اور ضیا کو دوبارہ صحت و زندگی عطا کی۔

سہیل کو اس عنایت کی جس حد تک مسرت ہوئی وہ ظاہر۔ اُسے دوبارہ زندگی نصیب ہوگئی اب اس کی تمنا ہے کہ جلد از جلد یہ تعلق ظاہری نگاہوں میں بھی اتحاد کی صورت اختیار کرلے ضیا ظاہراً مطمئن اور مسرور ہے لیکن اسکا آتش پنہاں سے خاکستر ہورہا ہے

صبح کی سیم گوں نیم روشنی بیرونی غرفہ کے قریب کرسی پر ضیا متمکن ہے جسم میں آتشیں لباس نظارۂ جمال کے لئے آتش فروزاں کا حکم رکھتا ہے۔ آنکھیں سامنے کے دل افروز منظر پر جمی ہوئی ہیں۔ سپید ہاتھ شفاف زنخدان کے نیچے انداز معصومیت سے رکھے ہوئے ہیں، قرمزی لب پیوستہ ہیں اور دراز پلکیں ساکن۔ سہیل ایک ہفتہ سے شہر کے نواح میں کسی مقصد کی تکمیل کے لئے گیا ہوا ہے اور منتظر ضیا کی بے چین نگاہوں میں گزرگاہ پر اس کا تصور منتشر ہے۔ کنیز داخل ہوئی اور ادب سے بیتہ کا کارڈ پیش کیا۔

"شہامت علی" ...... کون؟ متفکر نظریں جھک گئیں۔ "اچھا بلالو"۔
تقریباً (۳۵) سالہ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ چہرہ سیاہ شکل غیر موزوں ہونٹ موٹے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر دو لانبے دانت ہونٹوں پر آئے ہوئے۔ برق حسن نے چشم نظارہ کو خاکستر کردیا۔ آنکھیں جھک گئیں۔ لیکن فوراً ہی کسی خیال نے مستعد کردیا۔
"آداب عرض ہے۔ کیا میں محترمہ ضیا صاحبہ سے ہم کلام ہوں"۔ "جی وعلیکم السلام۔ تشریف رکھئے (دل دھڑکنے لگا، اور آنکھیں اس کی کیفیات قلبی کا بے سود اندازہ کرنے کی کوشش کرنے لگیں) شہامت علی، شکریہ۔ کہاں سے تشریف لانا ہوا" "افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس ایک افسوسناک خبر لانے کا گنہگار ہوں"۔ ضیا کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار ہوگئے، اس کا جسم لرزنے لگا۔ "جلد فرمائیے وہ کیا خبر ......" (رنجیدہ لہجہ میں) "آپ کے عزیز منگیتر سہیل کی والدہ صاحبہ کو ان کے ارادۂ شادی کی اطلاع مل گئی ہے وہ اس صدمہ سے جاں بلب ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ وصیت نامہ انھوں نے تبدیل کرکے تمام جائداد خیراتی کاموں کے لئے وقف کردی ہے۔ اس لئے اگر ایسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہوگئیں تو آپ کا عزیز شوہر ناداری کے ہاتھوں تباہ ہوجائے گا اور پھر ماں کی اچانک موت اس کے لئے کس قدر غمناک اور ندامت آفریں ہوگی کہ اس نے اپنی نفس کی خواہش پر ماں کو قربان کردیا ...... سہیل کو بھی اس کی اطلاع مل چکی ہے، وہ سخت مضطرب ہے، ایک جانب آپ کا خیال و لحاظ دوسری طرف ماں کی محبت و علالت کا صدمہ"۔ ضیا کا سر جھک گیا، دل تڑپ گیا آنکھیں جلنے لگیں، موٹے موٹے آنسو گالوں پر ڈھلک گئے اور آہ کی جگر سوز آواز ہونٹوں سے نکل کر فضا میں منتشر ہوگئی۔ "میں آپ سے اس باب میں مشورہ لینے آیا ہوں"۔ "میری سمجھ میں تو کوئی بات آتی نہیں۔ میں بدنصیب آپ کو کیا مشورہ دے سکتی ہوں"؟ "کیا آپ سہیل سے قطع تعلق کرنے پر آمادہ ہیں" ضیا نے تڑپ کر شہامت کی جانب دیکھا۔ "معزز خاتون کیا آپ کا دل اس امر پر آمادہ ہوسکتا ہے کہ ایک بے گناہ ہستی آپکی وجہ سے دنیا سے اس طرح رخصت ہوجائے اور پھر آپ کے محبوب کی زندگی ہر طرح تباہ ہوجائے (رک کر) غالباً آپ کی نگاہ میں معیار محبت یہ نہ ہوگا"۔ ضیا کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی "آہ کبھی نہیں" اور وہ بے ہوش ہوکر فرش پر گر پڑی، رخ رنگ اڑا ہوا اور چہرہ پر مردنی کی سی کیفیت، شہامت علی خاموش بیٹھا اس تصویر حسن و الم کو دیکھتا رہا، کچھ دیر بعد ضیا نے کراہتے ہوئے کروٹ لی اسے ہوش آگیا دفعتاً وہ اٹھ بیٹھی اوس کی آنکھوں میں استقلال و استقامت کی کیفیتیں نمودار ہوئیں، پیشانی سے ملال کی شکنیں ہٹ گئیں اور بے چین آنکھوں کا توازن نرمی سے معتدل ہوگیا۔ "جو کچھ آپ

فرمائیں میں کرنے کو حاضر ہوں۔ سہیل کی محبت میں جان بھی کچھ حقیقت نہیں۔ صرف قطع تعلق کرنے کی کیا حیثیت ہے۔ یہ تو خود ان کا اصرار تھا ورنہ میں اس زندگی سے حقیقی مسرت حاصل نہیں کرسکتی تھی جب کہ میں اس طرح اپنے عزیز والد کی چشم کرم سے محروم ہوکر خدا کی نگاہوں میں گنہ گار بنی.....“ آواز حلق میں پھنس گئی اور آنسو تڑپ کر پلکوں پر آگئے جن کو اس نے آہستگی سے خشک کردیا۔ شہامت علی نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر ہاتھ میں دے دیا۔ ”تو کیا آپ اس عبارت پر دستخط کردیں گی“۔ ضیا نے سہولت سے کاغذ پکڑ لیا اور مندرجہ عبارت پر نظریں جمادیں ”والدہ صاحبہ کی اچانک علالت سے موثر ہوکر میں عزیز سہیل سے قطع تعلق کرنے پر رضامند ہو۔ اگرچہ ظاہری نگاہوں میں ہم دونوں یکجا نہ رہ سکیں گے لیکن ہمارا باطنی تعلق کبھی منقطع نہیں ہوسکتا“۔ ضیا نے میز پر سے قلم اٹھالیا اور خاموشی سے دستخط کرکے کاغذ واپس کردیا شہامت نے ٹوپی سر پر رکھی اور ”شکریہ“ کہکر کمرے سے نکلگیا۔ ضیا نے چیخ ماری اور کرسی سے نیچے تھی۔

۷

”عزیزوں کے عزیز سہیل۔ بدنصیب ضیا کا آخری سلام قبول کریں۔ اس گنہ گار وفا کو رخصت عطا کیجئے، خدا آپ کو گلشن ہستی میں سرسبز و بامراد رکھے۔ باد خزاں کا کوئی جھونکا کبھی اس چمن کی طرف سے نہ گزرے۔ میں تو اپنی مسرت و زندگی اسی روز ختم کرچکی تھی جس دن والد کی نگاہ شفقت منحرف ہوئی۔ اگر آپ کا اس درجہ اصرار نہ ہوتا تو میں کبھی دنیا کی نگاہوں کے روبرو دوبارہ رونما نہ ہوتی اور کسی غیر معلوم گوشۂ خاموشی میں زندگی کے بقیہ ساعتیں گزار دیتی۔ خیر مجھے حد درجہ مسرت ہے کہ اب بھی معاملہ ہاتھ سے نہیں گیا اور میں اپنی مسرت آپ کی راہ میں قربان کرنے میں کامیاب ہوئی، الوداع، رخصت شاید دوسری دنیا میں ہم پھر یکجا ہوسکیں۔
(تمھاری ضیا)“

سہیل بستر علالت پر انتہائی بے چینی سے تڑپ رہا ہے ہوٹل واپس آنے پر آسے بجائے پیکر مسرت و تنویر جلوۂ حبیب کے مندرجہ بالا تحریر میز پر ملی (جو اس لمحہ تک اس کے ہاتھ میں ہے) اس کا سر چکرایا، لبوں سے چیخ نکل گئی اور رو تھرا کر گر پڑا۔ ہوش آنے پر وہ سخت جانگسل علالت میں مبتلا تھا اور اس وقت تک ماہئی بے آب کی مانند تڑپ رہا تھا، اب تو اس کی زندگی چند ہی لمحوں کی مہماں معلوم ہوتی ہے۔ ”آہ آہ..... میری قسمت۔ میرے لوح قلب کی محافظ ضیا، میرے کشور روح کی ملکہ اصلی ضیا، مجھ بدنصیب سے کون سا گنہ سرزد ہوگیا جس نے تمھیں یوں برگشتہ کردیا۔ آہ تم کہاں ہو کس حال میں ہو، مجھے معلوم نہیں ہوسکتا۔ یقین ہے کہ تم اپنے مکان میں نہیں گئیں اور آوارہ و برباد نہیں معلوم کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھارہی ہو۔ آہ۔ میرے سوالات بے سود، اور میری تپش قلب بے کار، میری صدائیں صدا بصحرا، اور میری چیخیں میرے آوازوں کا جواب، کاش آسمان کو مجھ پر ترس آسکتا، اے مجھے پیدا کرنے والے اب رحم، میری قلبی تپش پر نگاہ کر......“ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا دفعتہً دروازہ زور سے کھلا نواب صاحب والدۂ سہیل اور پیکر تنویر ضیا تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ ضیا چیخ کر سہیل کے قدموں پر گر پڑی۔ والدہ اس کے سرہانے گر کر ہچکیاں لینے لگیں اور نواب صاحب قالین پر نادمانہ سرنگوں بیٹھ گئے۔

”میرے جگر کے ٹکڑے سہیل، میری آنکھوں کی روشنی سہیل، سہیل میرے پیارے بچے۔ للہ اپنی گنہ گار ماں کو معاف کردو، آہ مجھ جیسی سنگ القلب اور گنہ گار عورت دنیا میں نہ ہوگی جس نے اپنی لخت جگر کو یوں مصیبتوں اور بدبختیوں کے سمندر میں اپنے ہاتھوں پھینک دیا، اُف ایک جوش خودداری نے یہ ناکردنی خطا سرزد کروائی۔ آے کیا اس کی تلافی ممکن نہیں، کیا میرے خجل آنسو مقبول نہیں ہوسکتے“ قریب تھا کہ سہیل بے ہوش ہوجائے ماں نے سہیل کو فوراً بازوں پر لے لیا۔ ضیا جھک کر اس کے تلوے سہلانے لگی۔ جھجک کر سہیل نے پاؤں کھینچ لئے۔ درد بھری نگاہوں سے ضیا کی صورت دیکھی اور نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھادیا۔ نواب صاحب نے سہیل کے سر پر دونوں ہاتھ رکھدیئے۔

”عزیز بچے۔ ہم دونوں تمھارے گنہ گار ہیں، یقین ہے کہ تم اپنی محبت کے واسطے سے ہمیں بخش دوگے۔ یہ تمہاری والدہ ہیں اور میں بھی اب تمھارے والد کا سا جان نثار ہوں“۔ سہیل سنبھلکر بیٹھ گیا، ادب سے نواب صاحب کے ہاتھ آنکھوں سے لگائے۔

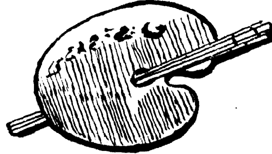
”میرے عزیز عم محترم۔ اس ناچیز کو نادم نہ کیجئے، بزرگوں کی زبان مبارک سے ایسے کلمات ہمارے لئے باعث خجالت ہیں۔ مجھے کس قدر مسرت ہے کہ آپ دونوں نے ہماری خطائیں معاف کردیں اس کا اندازہ ممکن نہیں۔ آہ میری زندگی دوبارہ ہوگئی اور کشتی حیات فنا کی موجوں سے ڈوبتے ڈوبتے بچ گئی۔ اب میں انکشاف حال کے لئے مضطرب ہوں“۔

والدہ (گزشتہ داستان دُھراکر) ”جس وقت شہامت علی میرے پاس واپس پہنچا اور مجھے کاغذ دیکر حالات دھرائے یک لخت میرے دل میں ردعمل شروع ہوگیا، اپنے طرز نامناسب پر ہزارہا نفریں ہونے لگی اور ضیا کے صبر استقلال سچائی و پاکبازی کا گہرا نقش قائم ہوکر ضمیر نے لاکھ بار تحسین و آفریں کی۔ میری روح اپنے وجود سے متنفر اور تم دونوں کے لئے بے قرار ہوگئی۔ پھر اطلاعات ملیں کہ تم اس درجہ علیل اور ضیا دشت کشمیر میں آوارہ و برباد ہیں، میری روح لرز گئی، قلب تھرا گیا۔ میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور جملہ حالات سنا کر رحم و عفو کی طالب ہوئی۔ حالات کی غم ناکی اور درد اس قدر اثر انگیز ہوچکے تھے کہ ان کا دل بھی اپنی لخت جگر کے لئے تڑپ گیا۔ اس کی مصائب اور قربانی نے دل سے صدائے آفریں نکلوادی اور ہم دونوں مستعد ہوکر تلاش مقصود میں آوارہ ہوگئے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے جلدی ہمیں بامراد کیا اور ہم پیاری ضیا کی محبت میں یہاں تک پہنچ گئے اور اس کریم کی مہربانیوں کا کسی طرح شکریہ ادا نہیں ہوسکتا جس نے تمھیں موت کی آغوش سے پناہ دی۔ اٹھو میرے پیارے بچے اس گنہ گار ماں کا بوسۂ محبت قبول کرو“ دونوں مجسم الفت کو سینہ سے لگالیا۔ حسن ایثار رنگ لایا۔

۸

جذبات حقیقی کی کششیں کامیاب ہوئیں، الفت صادق کی سحر آفرینیاں بامراد ہوگئیں اور ایک حسین و جمیل قرآن السعید زخمی دلوں پر مرہم رکھنے میں کامیاب ہوا۔ فقط

حیدرآباد کے سب سے قدیم و اعلیٰ ماہران فن مصوری



THE BEST

PORTRAITS

OIL PAINTINGS

AMATEURS SERVICE

ENLARGEMENTS

FRAMING

RAJA DEEN DAYAL & SONS

BY SPECIAL APPOINTMENT TO H.E.H THE NIZAMS G.C.S.I.G.C.B.E.

ART PHOTOGRAPHIC SALON

THE PARADE, SECUNDERABAD DN.

راجہ دین دیال اینڈ سنز

آرٹسٹ و فوٹو گرافرس سکندرآباد

FAZAL

گلابی اردو

رہبر دکن کی زعفرانی سالگرہ

(ساتھ قلم حضرت مُلّا رموزی کے)

اے جائیے پی کر او نگنے والو!!!

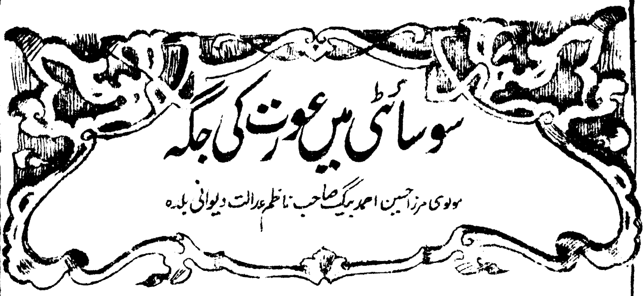
البتہ تحقیق قسم ہے غنودگی اور کھانسی تمہاری کی کہ تفریح فرمارہے تھے ہم ساتھ گورنر صاحب بمبئی کے، اوپر کنارے سمندر بمبئی کے، اور باتیں کر رہے تھے باہم مشتمل اوپر معاملوں سیاسی کے، ناگاہ دیکھا ہم نے بھی گورنر صاحب بمبئی نے کہ شروع ہوا آنا ہندوستانیوں کا بیچ موٹر کاروں کے، اوپر کنارے سمندر کے ہمراہ عورتوں فیشن ایبل کے ساتھ لباس قیمتی بہت کے، مانند دولت مندوں یورپ کے، پھر اترے یہ ہندوستانی موٹروں اپنی سے، پھر اکثر ان کے داخل ہوئے بیچ ہوٹلوں زیادہ روپے لینے والوں کے، پھر کھائیں مٹھائیاں یورپ کی ان ہندوستانیوں نے پھر خریدے اخبار انگریزی بھی کتابیں انگریزی ان ہندوستانیوں نے پھر سمجھے کہ ان ہندوستانیوں بھی عورتوں فیشن پوشیدہ" ان کی نے مانند لیڈیوں سفید سفید کے ساتھ ہندوستانی دوستوں اپنے کے، پھر قہقہے فرمائے ان ہندی مردوں بھی عورتوں نے مانند قہقہوں یورپ والوں کے، پھر "جام رنگین" نوش فرمائے بعض ان کے نے یہاں تک کہ نہیں سکتے تھے اور البتہ تحقیق نہیں سکتے تھے ہم یہ کہ فرق کریں ہم درمیان ان ہندی مردوں اور عورتوں کے ساتھ شکلے یورپی عورتوں اور مردوں کے، مگر اے عجب وہ گھڑی درد اور حسرت موبائی" کی ٹرپانے والی کہ دیکھا ہم نے کہ جب گزر کرتی تھیں عورتیں یورپ کی اوپر ان فیشن رسیدہ عورتوں ہندوستان کے تو نہیں گزرتی تھیں وہ مگر ساتھ نظر حقارت کے مگر دیکھتی جاتی تھیں وہ ان عورتوں ہندوستان کو گویا عورتیں یورپ کی سمجھتی تھیں فیشن ایبل عورتوں ہندوستان کو اچھوا دھا آیس قسم کی سیاسی حضا لاجوا کی کہ تاؤ کھایا ہے مانند تاؤ کھانے مصطفےٰ کمال پاشا کے اوپر قوم ارمن کے یا مانند ہٹلر کے اوپر قوم یہودیوں جرمن کے اور ملا ہم نے ہتیلی افسوس کو اوپر اس کے کہ تحقیق نہیں فائدہ دیا ہندوستانیوں کو تقلید یورپ نے مگر یہ کہ روپیہ کمایا یورپ والوں نے ہندوستانیوں سے اور ذلیل رہے ہندوستانی بن کر فیشن ایبل بیچ نظر یورپ والوں کے جیسا کہ دیکھا ہوگا تم نے اے مسجدوں سے جوتے چورانے والو کہ جو ہندوستانی کہ عمارتیں بھی کوٹھیاں بناتے ہیں مانند یورپ کے تو تحقیق روپیہ تعمیر کا جاتا ہے بیچ جیبوں یورپ والوں کے مگر اے عجب عقل اس زمانے بی۔اے، پاس کی کہ ہو کر فیشن ایبل رہے محفوظ وہ بھی قرضدار بنکوں امپیریل اور مہاجنوں دیسی کے، پس اگر ثابت قدم رہتے ہندوستانی اوپر حقّے اور چلم دیسی کے اوپر لباس و روضع دیسی کے تو لطف اٹھاتے وہ مانند لطف و اجد علیشاہ کے بھر داللہ قبر اونکی نور سے بھی محفوظ رکھے اللہ لکھنؤ والوں کو واللہ چنانچہ بھی آداب بجالاتے ہیں، اگرچہ بہت دن گزرے کہ مشاعرے لکھنؤ کے کم نہ ہوئے، پس البتہ تحقیق جب دیکھا ہم نے باشندوں بمبئی کو کہ خرچ اون کا برابر یورپ والوں کے ہے بہ سبب اندھی تقلید کے تو مسکرائے ہم اور گورنر صاحب اوپر بے عقلی بے خردی اور بے ہوشی ہندوستانیوں کے، درانحالیکہ اگر ساتھ نظر غور کی کے دیکھیے تو اے آگرہ کے پتھر لکھنؤ کی مٹی اور گنگا جمنا کے پانی سے بنے ہوئے ہندوستانی تو تحقیق ثابت ہوگی عقل تیری سیاہ اے کالی۔

مگر عجب مضبوطی تیری اوپر بیوقوفی اپنی کے کہ برباد کر رہا ہے تو دولت اپنی اوپر تقلید یورپ کے اور خرچ کرتا ہے تو روزانہ خوراک تین آدمیوں کی اوپر سنیما اور تفریح جو پاٹیوں اور کلبوں بھی ٹینس کے مگر نہیں اندازہ کرتا تو خرچ پٹرول موٹر اپنے کے کا پس توفیق دے اللہ تجھے ہندوستان زادے کو کہ گھی کھانے کی بدلے خرچ موبی آئیل اور پیٹرول کے تا درست ہو دماغ تقلید پسند تیرا اور بیوی انٹرنس فیل تیری کا کہ تحقیق خرچ کرنا اوپر پیٹرول بے ضرورت کے اور خرچ کرنا اوپر دس بارہ بندقوں یورپ کے بھی خرچ کرنا اوپر سوٹ کیسوں زیادہ کے بھی پالنا کتوں دُم بریدہ یورپ کے کا برابر ہے اسے مشابہ ہے پاگل خانے آگرہ سے، مگر اے عجب وہ گھڑی مبارک کہ بشارۃ اور خوشخبری پہنچائی ہم کو ایک نے رہنے والوں بمبئی سے کہ اے مُلّا رموزی صاحب استاد ٹھیکہ داروں یورپ کے خبرداری اور آگاہی ہو جیو تم کو کہ تحقیق منا رہے ہیں سالگرہ کارکن اخبار "رہبر دکن" کے اخبار "رہبر دکن" کی.... پس شتابی کیجئے اور لکھئے مبلغ ایک مضمون گلابی کے تا یادگار رہے وہ بیچ ذخیرہ "رہبر دکن" کے تو قسم ہے "ریشمی ساڑیوں" اور "رنگین دوپٹوں" بھی لچکدار آنچلوں کی کہ حکم دیا ہم نے شاگرد قدیم اپنی مس زبیدہ جان سینما والی کو تا ناچے وہ بھی گائے وہ اوپر اس تقریب مبارک "رہبر دکن" کے اگر نا دٗ نہ کھائیں اوپر ناچ گانے تیرے کے ایڈیٹر صاحب "رہبر دکن" کے پھر دعا کی ہم نے اور گورنروں ہندوستان نے کہ اے اللہ لمبی کردے تو عمر اس اخبار ہذا کی کہ تحقیق یہی ہے اور لاریب یہی وہ اخبار ہذا کہ استعمال کرتا ہے یہ زبان عمدہ اردو بھی پرہیز کرتا ہے بے ضرورت الفاظ انگریزی سے، بھی جری ہے یہ بیچ بیان اپنے کے بھی حسین ہے زیادہ مس سلطانہ اور مس سلوچنا سے کاغذ اور چھپایا اس اخبار تذکرہ کئے ہوئے کا بھی کم ہے قیمت اس کی سگریٹوں اور صابون یورپ سے پھر کیا ہو گیا ہے ہندوستانیوں کو کہ بدلے پاوڈر اور لونڈر کے نہیں خریدتے وہ اس اخبار کو ساتھ تعداد زیادہ کے، درانحالیکہ بڑھاتا ہے عقل کو مطالعہ اس کا جیسا کہ اوپر سالگرہ اس کی کہ لکھا ہے بزرجمہر وزیر نوشیروانی نے یہ شعر ہذا ؎

"سلامت رہو اے اخبار "رہبر دکن" ہزار برس"
اس طرح کہ دن ہوں پچاس ہزار ہر برس کے"

پس اے اللہ موافق اس شعر اوپر والے کے گرداں تو اس کو بھی توفیق دے تو مطالعہ کی اس اخبار کے بیوی ہماری کو کہ کہا ہے

تمام شد



مغربی تعلیم اور تمدن کا گہرا اثر ہماری معاشرت پر روز افزوں ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانان ملک عورتوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کی طرف خاص طور پر توجہ کر رہے ہیں۔ ہم اس خیال کے مخالف نہیں۔ اپنی بھی اصلاح کیجئے اور عورتوں کی بھی۔ صرف اس قدر بتلانا مقصود ہے کہ آنکھ بند کرکے مغرب کی تقلید کرنا ہمارے حق میں کہاں تک مفید ہو سکتا ہے۔

عورتوں کے اصلی فرائض کیا ہیں، ان کو انجام دینے کے لئے کس قسم کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے کس حد تک ان پر مردوں کی نگرانی رہنی چاہئے اور کس قدر آزادی ملنی چاہئے۔ مغرب کی عورتوں نے تعلیم یافتہ ہو کر کونسا تیر مار لیا ہے اور رونق محفل بن کر اخلاق کے معیار کو پہلے کی نسبت اونچا کر دیا ہے یا اور نیچے گرا دیا ہے۔ یہ تعلیم عورت کے حق میں اچھی ہے یا بری، یورپ کی موجودہ معاشرت عورت کی عصمت اور حیا کو برقرار رکھنے میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئی، یہ سارے مسائل غور طلب اور نہایت اہم ہیں۔ ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ یورپ میں شریف الخیال اور باعصمت عورت کا وجود نہیں۔ یا ساری عورتیں جرائم پیشہ اور بدکار ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تعداد کی مناسبت سے نیک کردار عورتیں بہت کم ہیں۔ تعلیم اور معاشرت کی خرابی اخلاق کے معیار کو روز بروز گھٹاتی جا رہی ہے۔

دنیا میں سیاہ کاری اور بداعمالی ابتدائے آفرینش سے چلی آتی ہے۔ سوسائٹی اس کے روک تھام کی بہت کچھ کوشش کرتی ہے۔ عدالت اور پولیس کا وجود اسی غرض سے ہے کہ جرائم کا انسداد ہو۔ جان کے بدلے جان لی جاتی ہے۔ لیکن یہ سلسلہ نہ کبھی مسدود ہوا ہے اور نہ آئندہ کے لئے ایسی توقع ہے۔ دنیوی حکومت اور انتظام کا آغاز بہت بعد کو ہوا ہے۔ ابتدا میں مذہب نیک و بد کی خبر دیتا تھا۔ فطری کمزوریوں کی وجہ سے انسان نہ تو احکام مذہب کی تعمیل تمام و کمال طریقہ پر کرتا ہے۔ نہ حکومت کے قانون کی خلاف ورزی میں اس کو باک ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سرشت میں بداعمالی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن شریف میں خداوند کریم نے انسان کی اس خصوصیت کی طرف جو اشارہ فرمایا ہے اس سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے جس وقت باری تعالے نے یہ قصد فرمایا کہ زمین پر اپنا قایم مقام انسان کی صورت میں بھیجا جائے تو فرشتوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ خاک کا پتلا زمین پر فساد پھیلائے گا۔ سورۂ البقرۃ (رکوع ۴) میں اس طرح ارشاد ہوا ہے۔ "اور جس وقت ارشاد فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خونریزیاں کریں گے۔" خالق دوجہاں اپنی مصلحت سے خوب واقف ہے۔ فرشتوں کا اعتراض کارگر ثابت نہ ہوا۔ چنانچہ اسی مقام پر یہ عبارت ملتی ہے "حق تعالے نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے" آدم کو وجود میں لانے کے بعد ایک ساتھی بھی پیدا کیا جس کو ہم لوگ اماں حوا کہتے ہیں۔ ان دونوں کو خالق اکبر نے اپنی مہربانی سے بہشت میں رہنے کی اجازت دی۔ بالآخر شیطان کے فریب میں آکر انھوں نے شجر ممنوع کا پھل کھا لیا اور جنت سے نکالے گئے۔ حضرت آدم کے دو بیٹوں قابیل و ہابیل میں نسبت کے متعلق اختلاف ہوا اور انجام کار ہابیل نے اپنے بھائی قابیل کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد سے جرائم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

عقل انسانی روز بروز ترقی کرتی گئی۔ اسی مناسبت سے ضروریات زندگی میں اضافہ ہونے لگا آرام اور آسائش کا سامان فراہم کرنے کی فکر لاحق ہو گئی۔ قدرت نے تقریباً سب جانداروں کو ملکیت کا احساس عطا کیا ہے کتوں کو دیکھئے ایک ہڈی کی خاطر آپس میں کس طرح لڑتے ہیں۔ انسان اگرچہ اشرف المخلوقات ہے لیکن اس میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر موجود ہے۔ چھوٹے چھوٹے کم عقل بچوں کو دیکھئے کھلونے کی خاطر کیا کچھ ہنگامہ برپا کرتے ہیں اور آپس میں مارپیٹ کرتے ہیں۔ اپنے اور پرائے کی تمیز ان میں کتنی جلد پیدا ہو جاتی ہے۔ بچہ ہر چیز کو اپنی بتلاتا ہے۔ البتہ مفید اور غیر مفید کا احساس اس کو مطلق نہیں ہوتا۔ سچ پوچھو تو ملکیت کا احساس ہماری دنیوی ترقی کا اصلی راز ہے۔ تمدن کی یہ عالیشان عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہے۔ ضروریات زندگی کا دائرہ وسیع ہونے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ آپس میں اشیاء کا لین دین نہ ہو۔ رفتہ رفتہ روپیہ کا خیال پیدا ہوا۔ تجربہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ بقائے حیات اور آسائش کے لئے تین چیزیں نہایت ضروری ہیں کسی خوش خیال نے ان ضروریات کو۔ زر۔ زمین۔ زن کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ ان تینوں کی قدر و قیمت معلوم ہو جانے کے بعد ہر شخص ان کو حاصل کرنے کے لئے حتی الامکان جد و جہد کرنے لگا۔ قدرت نے کسی مصلحت سے ذی روح کائنات کے قوائے جسمانی و ذہنی میں مساوات نہیں رکھی۔ مثل مشہور ہے کہ خدا پنج انگشت یکساں نکرد۔ ہر شخص اپنی قابلیت و حکمت عملی کے لحاظ سے کسب معیشت میں کامیابی حاصل کرنے لگا۔ بعض قسمت کے دھنی ایسے بھی ہیں جو امیر والدین کے ہاں پیدا ہو جانے کی وجہ سے دولتمند رہتے ہیں۔ بعض کسی اور طرح بغیر محنت و مشقت کے خوش حالی میں بسر کرتے ہیں۔ بدقسمت ایسے بھی موجود ہیں جو باوجود اکتساب علم و کمال تلاش معاش میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں لیکن فلک سفلہ پرور ان کو جھوٹوں بھی نہیں پوچھتا۔ اس عدم مساوات نے ایک قسم کی بدنظمی پیدا کر دی۔ انسان فطرتاً آسائش پسند واقع ہوا ہے۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ آسائش کا معیار بھی بلند ہوتا گیا۔ کم نصیب لوگ خوش قسمتوں کے ساتھ مساوات پر آنے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی کا نام زندگی کی کشمکش ہے۔ اس کشمکش حیات میں انسان اکثر اوقات احکام مذہب و حکومت کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جدید علوم و فنون کی ترقی نے ایجادات کا دریچہ کھول دیا۔ پہلے انگریزی محاورہ کے مطابق ضرورت ایجاد کی ماں تھی، اب صورت حال برعکس ہو گئی۔ بیٹی ماں بن بیٹھی ہے۔ ہر نئی ایجاد کے بعد اس کی ضرورت اور خواہش محسوس ہونے لگتی ہے خواہشات کے اس وسیع میدان نے زندگی کے معیار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اسی مناسبت سے اخلاق پر بھی

اثر پڑتا ہے۔ آرام طلبی اور عیش پرستی زیادہ ہوتی جاتی ہے کاش کہ وسائل معاش بھی اسی رفتار سے وسیع ہوتے جاتے لیکن مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ موجودہ صورت حال ہماری سیہ کاریوں میں اضافہ کرنے کی ذمہ دار ہے تا وقتیکہ طبیعت انسانی میں کوئی عظیم الشان انقلاب پیدا نہ ہو (جس کی بظاہر کوئی امید نہیں ہے) زناکاری اور بداعمالی کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ بلکہ قرینہ یہ بتلاتا ہے کہ اس میں زیادتی ہوتی رہے گی۔ جرایم کے اسباب اور نوعیت پر اگر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے تو بجائے خود ایک ضخیم کتاب ہوجائے گی۔ ہم نے اوپر تین بڑے اسباب زر، زمین، زن کا ذکر کردیا ہے۔ ان کے علاوہ خارجی اور اندرونی چھوٹے چھوٹے اسباب بھی پیدا ہوجاتے ہیں لیکن ایسے واقعات جن کا تعلق مندرجۂ بالا تینوں باتوں میں سے کسی کے ساتھ نہ ہو بہت کم ہیں۔ جرائم کے مرتکب زیادہ تر مرد ہوتے ہیں۔ عورتوں کو قدرت نے گھریلو کاموں کے لئے پیدا کیا ہے اسی وجہ سے ان کے جسمانی قویٰ ارتکاب جرائم کے لئے زیادہ موزوں نہیں ہیں۔ بریں ہم جن عورتوں کو صحبت بڑی ملی یا مردوں نے ضرورت سے زائد آزاد رکھا وہ بھی مردوں کی طرح اس مرض میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ جرائم سے ہمارا منشا صرف حکومت کے قانون کے خلاف ورزی نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ فعل بھی اس میں شامل ہے جو احکام مذہب و اخلاق حسنہ کے خلاف ہو۔

آئے دن کے سنسنی خیز واقعات ہم کو بتلاتے ہیں کہ طلب زر کو جرائم اور سیاہ کاری سے کس قدر تعلق ہے۔ نیز یہ کہ عورت کی خاطر مرد کس طرح اپنے کو برباد کردیتا ہے اور بدروش عورت مرد کی اس کمزوری سے کس کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے جس وقت تک انسان میں توالد و تناسل کے فطرتی جذبات موجود ہیں، عورت مرد ایک دوسرے کے محتاج رہیں گے۔ ان جذبات کو صحیح طریقہ پر استعمال کرنا انسان کا مذہبی اخلاقی اور قانونی فرض ہے۔ خواہشات شہوانی کی اصلی غرض یہ ہے کہ نسل انسانی میں افزائش ہوتی رہے۔ ان اغراض سے ہٹ کر محض نفس پرستی کی خاطر جو لوگ اپنی زندگی تباہ و برباد کرنے میں ان کے لئے سیاہ کار عورتوں کے ہتھکنڈے سبق آموز ہیں۔ یہ تو بالکل ناممکن ہے کہ عورت مرد کے تعلقات کلیتہً معدوم کردئے جائیں۔ البتہ ایسا کوئی بندوبست کرنا ضروری ہے کہ ان جذبات کا استعمال غلط طور پر نہ ہونے پائے۔ اگر ہم اس میل جول کو خاص شرائط کا پابند کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو یقین ہے کہ عورت کی سیاہ کاری اور مرد کی بربادی کا انسداد بڑی حد تک ہوجائے گا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند موثر تدابیر کا تذکرہ کردیا جائے۔ غلبہ آرا اسی پر ہے کہ زناکاری کو روکنے کی بہترین تدبیر نکاح ہے۔ اس کی اہمیت کو بعض لوگ محسوس نہیں کرتے۔ کسی قدیم فلاسفر کا قول ہے کہ انسان کی زندگی میں تین واقعات سب سے بڑے ہوتے ہیں، پیدائش، شادی، اور موت۔ ہماری اخلاقی حالت اور گھریلو آسائش کا بہت کچھ دارومدار نکاح پر ہے، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس معاملہ میں گفتگو کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ہر مذہب نے نکاح کے متعلق مختلف قیود عائد کئے ہیں۔ کسی مذہب میں صرف ایک بیوی کی اجازت ہے اور بعض مذاہب تعدد ازدواج کو جائز رکھتے ہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عورت وقت واحد میں متعدد مردوں کے ساتھ نکاح کرتی ہے۔ بہرحال ان قواعد کی شکل جو کچھ بھی ہو یہ ضرور ہے کہ مرد کو معلوم ہوجاتا ہے کہ کس عورت کے ساتھ بطور جائز لطف اندوز ہونے کا حق اس کو حاصل ہے وہ جانتا ہے کہ نکاح سے باہر کسی عورت پر بری نظر ڈالنا اخلاقی اور مذہبی گناہ ہے۔ باوجود اسکے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اصولاً نکاح کے مخالف ہیں ان کی حجت یہ ہے کہ انسان میں توالد و تناسل کی رغبت صحت اور تندرستی کی دلیل ہے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ اگر کسی آدمی کو ایک یا چند خاص عورتوں کا پابند کردیا جائے تو اس کی تشفی نہیں ہوتی۔

ان فطرتی جذبات کو نکاح کی جکڑ بندی عاید کرکے دبانے کی کوشش کرنا قدرت کے ساتھ لڑائی مول لینا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ شادی شدہ آدمی بھی قبول صورت کو دیکھکر اس کی طرف مایل ہوجاتا ہے اور اکثر اوقات نکاح کی قید غیر موثر ثابت ہوتی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے احکام نکاح سے متعلق خلاف فطرت ہیں۔ ماسوا اس کے دنیا میں اگرچہ زیادہ تعداد ایسے آدمیوں کی ہے جو کسی نہ کسی مذہب کے پابند ہیں اور اپنے مذہب کے مطابق نکاح بھی کرتے ہیں، پھر بھی دیکھا جاتا ہے کہ زناکاری روز بروز ترقی پر ہے اور اس میں شادی شدہ اشخاص بھی معقول تعداد میں حصہ لیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ زناکاری کو روکنے کے لئے نکاح کوئی موثر تدبیر نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر بجائے خود صحیح نہیں ہوسکتا۔ انسان دنیا بھر کی کمزوریوں کا مجموعہ ہے قیود عاید کرکے ان کمزوریوں کی اگر روک تھام نہ کی جائے تو دنیا میں ایک عجیب فتنہ و فساد رونما ہوگا۔ مذہب کا اصلی مقصد اصلاح باطن ہے۔ عورت مرد کے تعلقات کو اگر مذہب کی حد سے نکال لیا جائے تو نسوانی عصمت کی کوئی وقعت ہماری نگاہ میں باقی نہ رہے گی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ محض رسمی طور پر نکاح کرلینے سے انسان پاکدامن نہیں ہوجاتا۔ فی زمانہ ایسے آدمیوں کی تعداد بدقسمتی سے کچھ کم نہیں ہے جو نکاح کو ایک معمولی رسم خیال کرتے ہیں اور نہایت بے باکی کے ساتھ احکام مذہب کو بالائے طاق رکھکر حدود نکاح سے متجاوز ہوجاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ دو باتوں نے انسانوں کو اشرف المخلوقات بنایا ہے ایک عقل اور دوسری شرم۔ عقل سے نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے اور شرم ایسے کاموں سے روکتی ہے جو سوسائٹی میں قابل اعتراض ہوں۔ الحیاء من الایمان۔ حیا مذہب کا جزو لاینفک ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ کردو تو نتائج ضرور بدنما اور متضاد پیدا ہوں گے۔ نکاح کے ساتھ جو کچھ پابندیا

مذہب نے عاید کردی ہیں ان کا بہت کچھ تعلق شرم اور حیا سے ہے۔ خداوند کریم نے جس کسی کو یہ بیش بہا نعمت عطا کی ہے وہ نہ صرف زناکاری سے بچا رہیگا بلکہ دوسرے ہر قسم کے جرائم سے بھی محفوظ رہے گا۔ موجودہ زمانے میں بے حیائی کی سب سے بڑی مثال برلن اور لنڈن کے برہنہ کلب ہیں۔ یورپ کے بعض شہروں میں ایسے تھیٹر اور ناچ گھر متعدد ہیں جہاں برہنہ عورتیں اپنے کرتب بتا کر شوقین مزاج تماشائیوں کے دل لبھاتی ہیں۔ اس حیا سوز منظر کو نہ صرف مرد دیکھتے ہیں۔ بلکہ شریف اور نوجوان عورتیں بھی اس سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ ابتدائے آفرینش میں ممکن ہے کہ انسان ایک دوسرے سے کوئی حجابت رکھتے ہوں، لیکن آخرکار فطرتی شرم غالب آئی اور عقل نے ستر پوشی کا طریقہ بتلا دیا۔ پہلے تو درخت کے پتوں سے کام لیا گیا جس طرح اب بھی بعض وحشی اور غیر متمدن اقوام کا طرز عمل ہے لیکن رفتہ رفتہ عقل کی ترقی کے ساتھ ستر پوشی کے معقول ذرائع معلوم ہوتے گئے۔ اب یورپ نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی ہے اسے ترقی معکوس کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ عورتوں اور مردوں نے کھلم کھلا بے حیائی اختیار کر لی ہے جو ان لڑکیاں اپنے والدین کے سامنے ننگی دھڑنگی پھرتی ہیں تو غیر مردوں کے سامنے شرم کی کہاں تک پابند رہیں گی بالکل ظاہر ہے اس نوبت پر پہنچنے کے بعد انسان اور حیوان میں امتیاز باقی رکھنے کے لئے صرف ایک درجہ باقی رہ جاتا ہے کیا عجب ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ ذہنیت ہم کو جانوروں کے ساتھ مساوات پر لے آئے۔ خدا اس وقت سے محفوظ رکھے محض اس کا تصور ہمارے رونگٹے کھڑے کردینے کے لئے کافی ہے۔

الغرض نکاح کے شرائط کی پابندی تمام و کمال اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ انسان شرم و حیا کا بھی خیال رکھے۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو مذہب بیچارے کو بدنام کرنا بے سود ہے۔ نکاح کے سلسلہ میں طلاق اور تعدد ازدواج کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انسان کی خانگی زندگی کا تعلق نکاح کی کامیابی کے ساتھ بہت کچھ وابستہ ہے اکثر اوقات خانہ آبادی کے بجائے خانہ بربادی کی صورت پیش آجاتی ہے۔ اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے کوئی مقررہ طریقہ نہیں ہے۔ مختلف مذاہب نے مختلف شرائط عاید کئے ہیں۔ زمانہ حال میں بعض اقوام نے مذہب میں مداخلت کرکے آئینی قواعد مرتب کر لئے ہیں، مثلاً سوویٹ روس نے اس خصوص میں بالکل کایا پلٹ کر دی ہے۔ اب ان کے ہاں طلاق حاصل کرنا کوئی مشکل بات نہیں رہی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے میاں بیوی میں ان بن ہو جائے اور سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کی امید نہ رہے تو کیا چارۂ کار اختیار کرنا چاہئے۔ عیسائیوں کے ہاں قانون طلاق ایک حالت میں نہیں رہا۔ وقتاً فوقتاً اس میں اہم تبدیلیاں ہوتی رہیں ابتدائی زمانے میں یہ دستور تھا کہ صرف مرد طلاق کے لئے درخواست کر سکتا تھا۔ عورت اس معاملے میں بے اختیار تھی۔ بعد کو پادریوں نے قاعدہ بدل دیا جس کی رو سے مرد کا حق بھی جاتا رہا۔ ایک دفعہ نکاح ہو جانے کے بعد مرتے دم تک خلاصی ممکن نہ تھی۔ طلاق کی قطعی مخالفت ہوگئی۔ جن میاں بیوی میں موافقت نہ ہوتی وہ ساری عمر مصیبت میں پڑے رہتے۔ اس قاعدے نے یورپ میں بڑی حد تک زناکاری کا دروازہ کھول دیا۔ اس زمانہ میں اس قسم کے معاملات پادریوں کے اختیار میں تھے سیاسی اقتدار رکھنے والے یا دولتمند لوگ اثر اور روپے کے زور پر پادریوں کو ہموار کرکے مطلب براری کر لیتے تھے۔ غریب بے چاروں کو سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ قید نکاح میں رہ کر بے حیائی کی زندگی بسر کریں کیونکہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسرا نکاح ناجائز تھا۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں انگلستان کے ایک بادشاہ ہنری ہشتم کی پہلی بیوی کیتھرین ... اسپین کی شہزادی تھی۔ پہلے اس کی شادی بادشاہ کے بھائی کے ساتھ ہوئی تھی اس کے انتقال پر پاپائے اعظم کی اجازت سے بادشاہ نے نکاح کر لیا۔ بیس برس بعد اس کو طلاق دینے کی ضرورت ہی۔ کیونکہ اسی ملکہ کی ایک سہیلی این بولین پر بادشاہ عاشق ہوگیا تھا ملکہ نیک چلن اور پاکدامن عورت تھی۔ بادشاہ نے حجت پیش کی کہ بھائی کی بیوہ کے ساتھ نکاح ناجائز ہے اس لئے یہ نکاح سرے سے کالعدم ہے۔ پوپ سے عدم جواز کا فتویٰ طلب کیا گیا تو اس نے انکار کر دیا کیونکہ اس کو حکومت اسپین کا ڈر لگا ہوا تھا۔ راج ہٹ مشہور ہے۔ بادشاہ اپنی ضد پر قایم رہا۔ اپنے ملک کے بڑے پادری پر دباؤ ڈال کر مفید مطلب فتوے حاصل کر لیا اس واقعہ کے بعد سے حکومت نے پوپ سے قطع تعلق کر لیا اور خود بادشاہ کو قائم مقام بنایا۔ پھر تو بادشاہ نے متعدد بیویاں کیں۔ کوئی نہ کوئی الزام بیوی پر عاید کر دیتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ قاعدہ جاری ہوا کہ طلاق نافذ کرنے کے لئے پارلیمنٹ کی اجازت لازمی ہے۔ اس قاعدہ سے صرف ذی اثر لوگ مستفید ہوا کرتے تھے۔ عوام کی رسائی پارلیمنٹ تک ہونا کوئی آسان بات نہ تھی کشاکشی کے علاوہ اخراجات بیروی پریشان کن ثابت ہوئے جب چیخ و پکار زیادہ ہوئی تو پروٹسٹنٹ فرقہ نے یہ اختیار چند شرائط کے ساتھ عدالتوں کو دیدیا۔ ممکن ہے کہ پہلے

کی نسبت کچھ سہولت ہوگئی ہو لیکن موجودہ قانون بھی اپنی سختیوں کی وجہ سے میاں بیوی کو سیاہ کاری کی طرف مائل کرنے کے لئے نہیت کافی ہے۔ بڑی مشکل تو یہ ہے کہ ان کے ہاں اختلاف طبائع طلاق کے لئے وجہ معقول نہیں ہے حالانکہ عقل سلیم علی الاعلان یہ بتلاتی ہے کہ اگر عورت مرد میں موافقت نہیں ہوسکتی تو امن چین کی زندگی کی خاطر علٰحدگی سب سے بہتر تدبیر ہے۔ دو ناراض ہستیوں کو قید نکاح میں رکھ کر گھریلو آسائش کی توقع کرنا ایک فعل عبث ہے۔

انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے اپنی زندگی کے دس سال مصیبت میں بسر کئے۔ پہلی بیوی سے ستارہ نہیں ملا۔ یہ لڑکی شادی کے وقت سترہ سال کی تھی۔ والدین کے ہاں اکثر نوجوانوں کی سوسائٹی سے دل بہلاتی رہتی تھی۔ محض صورت شکل کی خاطر اس نے ملٹن سے نکاح کرلیا۔ یہاں خاوند اور اس کی کتابوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک ہی مہینے میں ایسا دل گھبرایا کہ میکے بھاگنے کی فکر ہوئی۔ والدین کو خطوط لکھے۔ انھوں نے کچھ عرصے کے لئے لڑکی کو بلوا لیا۔ لیکن جب ملٹن نے بیوی کو واپس بلانا چاہا تو صاف انکاری جواب ملا۔ آخر کار مایوس ہو کر ملٹن نے طلاق کی خواہش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس نے طلاق کی سختیوں کے خلاف متعدد رسالے لکھے اور تعدد ازدواج کی حمایت کی۔ پیر پادری مخالف ہوگئے۔ ملٹن کے رسالوں میں طلاق کے عام مسائل پر گفتگو ہے۔ لیکن اپنے خانگی معاملات کے متعلق اس نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ تاہم بعض لوگوں نے طرز تحریر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بیوی نے خواہشات کی تعمیل سے انکار کردیا تھا۔ بہرحال اصلی وجہ جو کچھ بھی ہو ملٹن نے اخیر رسالے میں حکومت کو یہ دھمکی دی ہے کہ اگر نا موافقت طلاق کے لئے وجہ کافی قرار نہ دی گئی تو خلاف ورزی قانون کی بنیاد پڑجائے گی۔ دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اس نے ایک شادی شدہ عورت سے دوستی پیدا کی۔ یہ ارادہ کرلیا کہ بدنامی کی پروا نہ کرونگا۔ لیکن عورت علانیہ طور پر اظہار تعلقات کو ناپسند کرتی تھی۔ حالات اس نوبت پر تھے کہ خانگی مشکلات نے بیٹی والوں کو صلح پر مائل کیا۔ دو سال تک علٰحدہ رہنے کے بعد بیوی نے عاجزی کے ساتھ معافی مانگ لی اور یہ بیان کیا کہ والدین کے غلط مشورہ پر وہ عمل کرتی رہی۔ اس کے بعد آٹھ سال تک دونوں میاں بیوی اگرچہ ساتھ رہے لیکن خاوند چنداں خوش نہ رہا۔ بیوی کے مرنے پر فوراً دوسری شادی کرلی۔

چند خاص حالات میں طلاق کے لئے عدالت میں نالش ہوسکتی ہے بہت بڑی وجہ فریقین میں سے کسی ایک کی زناکاری ہونی چاہئے۔ مجبوراً عدالت میں ایسے ایسے شرمناک واقعات ظاہر اور ثابت کرنے پڑتے ہیں کہ انسان کی خودداری اور حیا یہ مشکل گوارا کرتی ہے۔ سیاہ کاری کے خانگی حالات پبلک بڑے شوق سے سنتی ہے۔ اخباروں کے لئے اچھا مضمون ہاتھ آتا ہے۔ معاملہ کی نوعیت کے لحاظ سے اکثر اوقات ثبوت ملنا ممکن نہیں ہوتا۔ بدنامی کے خیال سے بعض لوگ مقدمہ بازی پسند نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی خانگی طور پر الگ ہوجاتے ہیں لیکن نکاح کی قید باقی رہتی ہے۔ آپس میں سمجھوتا ہوجاتا ہے کہ ہر فریق اپنی اپنی جگہ آزاد ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ زناکاری کا دروازہ کھل گیا۔ بعض لوگ جو طلاق کے تو خواہشمند ہیں لیکن عدالت میں وجہ ثبوت پیش نہیں کرسکتے یا پیش کرنا نہیں چاہتے، یہ تدابیر اختیار کرتے ہیں کہ آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ایک فریق عدالت میں اس بیان کے ساتھ رجوع ہوتا ہے کہ فریق ثانی بدچلن ہے۔ دعوے کی تائید میں اپنا بیان حلفی بھی دیدیتا ہے۔ عدالت فریق ثانی کے نام نوٹس جاری کرتی ہے لیکن وہ حاضر نہیں ہوتا۔ عدالت سے یکطرفہ ڈگری ہوجاتی ہے۔ جان چھڑانے کے لئے تدبیر تو اچھی ہے لیکن اگر یہ معلوم ہوجائے کہ حلف جھوٹا لیا گیا تھا تو عدالت فوجداری مقدمہ قایم کردیتی ہے۔ ایک شاعر نے کہا ہے کہ کوئی فریق طرف ثانی کی زناکاری پر چشم پوشی کرتا رہا اور طرح دیتا رہا یا دانستہ ایسے اسباب پیدا کئے کہ طرف ثانی جذبات کے مغلوب ہوکر زناکاری میں مصروف رہا تو ان حالات میں طلاق نہیں مل سکتی۔ اسی ضمن میں دو دلچسپ سوالات اور پیدا ہوتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک فریق بہت عرصہ تک حقوق ازدواج ادا کرنے سے انکار کرے اور کوئی معقول وجہ اس طرز عمل کی نہ بتائے تو کیا طلاق کی ڈگری ملسکتی ہے۔ اس مسئلہ میں امریکہ کی عدالتوں میں اختلاف ہوگیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وجہ معقول موجود ہو یا نہ ہو اس بنا پر طلاق نہیں ملسکتی۔ بعض نے یہ طے کیا ہے کہ وجہ کافی پائی جائے تو طلاق کی ڈگری ملنی چاہئے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر مرد اپنی قوت کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ اس سے بیوی پریشان ہوجائے تو طلاق کے لئے یہ وجہ کافی ہے یا نہیں۔ غالبیہ آرا اس طرف مائل ہے کہ ایسی صورت میں جسمانی ضرر مضر صحت ثابت ہونا ضروری ہے ایسے ثبوت کے لئے صداقت نامہ طبی لینا پڑتا ہے۔ عورت طبیب کے سامنے برہنہ ہوتی ہے۔ عدالت میں حیاسوز واقعات ثابت کئے جاتے ہیں۔

رومن کیتھولک فرقہ میں بالعموم طلاق ناجائز ہے۔ ایک دفعہ نکاح ہوجانے کے بعد علٰحدگی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ البتہ مرد کا قصور ثابت ہونے پر خاص حالات میں عورت کو علٰحدہ بود و باش کی اجازت ملجاتی ہے اور بسر برد کے لئے نان و نفقہ مقرر ہوجاتا ہے۔ کوئی فریق دوسرا نکاح نہیں کرسکتا۔ زندگی کے دن لازمی طور پر تجرد میں کاٹنے پڑتے ہیں۔ نوجوان عورت کے حق میں اس قسم کی زندگی کس قدر دشوار ثابت ہونی چاہئے بالکل ظاہر ہے۔ اچھے اور مضبوط کیرکٹر کی عورت پاکدامنی کے ساتھ گزر کرلے گی لیکن اس خوبی کی عورتیں تعداد میں کتنی ہیں اور پاکدامن رہنے کے لئے ان کو اپنے نفس کے ساتھ کس قدر کشمکش کرنی پڑتی ہوگی۔

ہنود کے ہاں بھی طلاق کی ممانعت ہے اور بیوہ کا نکاح ثانی ممنوع ہے اکثر مصلحان قوم اس طرف توجہ کررہے ہیں۔ اس رواج کے بدنما نتائج عام طور پر محسوس کئے جارہے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں سرہری سنگھ گور نے مجلس وضع قوانین میں یہ تحریک پیش کی ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت کو طلاق حاصل کرنے کا حق ملنا چاہئے امریکہ والوں نے ایک انوکھا قاعدہ آزمایشی شادی کا بھی نکالا ہے۔ ایک مقررہ زمانے کے لئے فریقین عارضی نکاح کرتے ہیں۔ اس دوران میں دیکھتے ہیں کہ موافقت ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اگر نبھاؤ کی امید نہ ہو تو الگ ہوجاتے ہیں کیا تعجب ہے کہ اسی چکر میں ایک عورت کئی مردوں کے ساتھ نکاح کرلے، لیکن استقلال کی زندگی کبھی نصیب نہ ہو اس عارضی معاہدہ کو نیم نکاح کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اسلام نے ان ساری مشکلات کا حل دو صورتوں میں پیش کیا ہے۔ یعنے طلاق میں سہولت اور تعداد ازدواج خاوند بیوی کو طلاق دینا چاہے تو عدالت میں حاضر ہوکر خانگی حالات ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اپنے اختیار سے گھر بیٹھے طلاق دیسکتا ہے۔ اگر ایسا نہ کرکے عورت کو معلق چھوڑدے تو عورت عدالت میں رجوع ہوسکتی ہے۔ مخالفین کا اعتراض ہے کہ اسلام نے اس معاملہ میں مساوات حقوق کو نظر انداز کردیا ہے۔ یہ کیا انصاف ہے کہ مرد تو مطلق العنان ہو اور عورت قاضی کے حکم کی محتاج۔ غور کرو تو یہ اعتراض آسانی کے ساتھ رد ہوجاتا ہے۔ قدرت نے خود عورت مرد میں مساوات کو جائز نہیں رکھا ہے ہر ایک بات میں مرد کو برتری حاصل ہے۔ عورت بہت سی باتوں میں مرد کی دست نگر رہتی ہے ساری دنیا اس کو صنف نازک کے لقب سے مخاطب کرتی ہے۔ اس اصول کو مدنظر رکھا جائے تو برتر ہستی کو برتر حقوق ملنا کوئی ناانصافی نہیں ہے، بلکہ ہر حیثیت سے

اسلام نے دوسرے مذہب کی نسبت عورت کو زیادہ حقوق دئے ہیں ۔ طلاق میں سہولت پیدا کرنے کے ساتھ مذہب نے یہ بھی بتلا دیا ہے کہ بلاوجہ معقول عورت کو طلاق دینا سخت ترین گناہ ہے ۔ افضل طریقہ یہی مانا جاتا ہے کہ وقفے کے ساتھ طلاق کا اعلان کرے ۔ ہر نوبت پر سوچ بچار کا موقع حاصل ہے ۔ دوسری اقوام کی طرح مسلمانوں کو اپنے قوانین کی ترمیم کی اب تک ضرورت نہیں پڑی یہ چیز خود ان احکام کی خوبی کو ثابت کر رہی ہے اپنے موقع سے تعداد ازدواج کا مسئلہ بھی نہایت مفید ہے اسلام نے چار عورتوں کی اجازت دی ہے لیکن اہل ہنود کے ہاں کوئی قید نہیں ہے ۔ ایک مرد وقت واحد میں کئی نکاح کر سکتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک سے زائد بیوی کرنے میں گھریلو آسائش کے برباد ہونیکا اندیشہ لگا رہتا ہے ایک سے زائد عورتوں کے ساتھ محبت قائم رکھنا اور مساوات کا سلوک کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے اسی وجہ سے اسلام نے سخت تاکید کر دی ہے کہ اگر مساوات نہیں رکھ سکتے تو دوسرا نکاح مت کرو، خاص خاص صورتوں میں بدرجہ مجبوری دوسری بیوی کرنا احسن سمجھا گیا ہے بعض صورتیں ایسی پیش آتی ہیں کہ اگر انسان دوسرا نکاح نہ کرے تو چند در چند خرابیوں کا سامنا ہوگا ۔ منکوحہ بیوی کو طلاق دیکر دوسری عورت کرنا بھی خالی از علت نہیں ہے ممکن ہے کہ اس عورت سے کوئی شخص نکاح ثانی نہ کرے کیونکہ طلاق پانے کے بعد عورت کی وقعت ضرور کم ہو جاتی ہے بہتر یہی ہے کہ تھوڑی سی بے لطفی برداشت کر لی جائے یہ بے لطفی ان خرابیوں اور بدنامیوں سے ہزار درجہ بہتر ہے جو بالعکس صورت میں پیش آیا کرتی ہیں ۔ مثلاً بیوی دائم المریضہ ہے اور حقوق ازدواج خاطر خواہ ادا نہیں کر سکتی ۔ زناکاری سے بچنے کے لئے مرد دوسرا نکاح کرے تو زیادہ احسن ہے فرض کرو کہ بیوی بانجھ ہے جائداد کی حفاظت کے لئے اولاد نرینہ کی ضرورت ہے منکوحہ کو طلاق دیکر اس کی زندگی برباد کرنے سے بہتر یہی ہے کہ اس کی موجودگی میں دوسری بیوی کرلے جو لوگ محض نفس پرستی کی خاطر بیوی پر بیوی کرتے رہتے ہیں وہ احکام مذہب کی خلاف ورزی کر رہے ہیں ان سے استدلال کرکے مذہب کو بدنام کرنا سراسر ناانصافی ہے

فقط

برار کی آئینی مشکلات

مولوی سید معین الرحمن صاحب ایم ایل سی وکیل ہائیکورٹ اکولہ

میں نے اپنے گزشتہ مضامین میں برار کی موجودہ آئینی بے بسی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی تھی ۔ مندرجہ ذیل سطور میں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ برار کا موجودہ قانون اراضیات نہ صرف شرائط پٹہ بلکہ حکومت ہند کے احکام کس حد تک خلاف ورزی کر رہا ہے ۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں صوبہ متوسط کا قانون نزول ایک سرکولیرپٹے کی تحت برار میں نافذ کیا گیا اسکے قبل اس صوبہ میں محکمہ نزول کا وجود بھی نہ تھا چونکہ برار کی موجودہ حیثیت ایک قسمت کی ہے اس لئے صوبہ متوسط کے تمام قوانین برار میں بتدریج نافذ ہوتے رہتے ہیں قانون نزول کے اجراء کے بعد سے سرکاری اراضی کی فروخت برابر جاری ہے اور گزشتہ بیس سال میں لاکھوں روپیہ قیمت کی زمینات مستقل طور پر خانگی ملکیت میں منتقل ہو چکی ہیں ۔ نزول ٹکس یا لگان کی شرط اس مستقل انتقال اراضی کی آئینی و قانونی شکل کو متبدل نہیں کر سکتی ۔ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے ہر خانگی زمین پر سرکاری تحصیل اور محاصل کا بار ہے اور حکومت کو ان کے وقتاً فوقتاً اضافہ کا اختیار بھی حاصل ہے ۔ اس کے باوجود حقوق مالکانہ خانگی خرید و فروخت کے ذریعہ برابر منتقل ہوتے رہتے ہیں ۔ اسی طرح محاصل نزول کی ادائیگی کی شرط مستقل انتقال جائداد کے منافی نہیں ہے اس صوبہ کی عدالت عالیہ نے ایک حال کے مقدمہ میں مسئلہ کے اس پہلو کی کافی تشریح کر دی ہے ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۲ء کے پٹہ کی شرائط کے تحت انتقال اراضی سرکاری کہاں تک جائز ہے ۔ کوئی سمجھدار انسان اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ کسی حالت میں بھی ”ایڈمنسٹرٹو ایکٹ“ یا فعل انتظامی قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

اس سلسلہ میں میں ناظرین کی توجہ حکومت ہند کی ایک گشتی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کا علم بہت کم قانون دان حضرات کو ہے ۔ اسسٹنٹ سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا اپنے مراسلہ مورخہ ۳۱ر جنوری سنہ ۱۸۶۳ء میں صاحب رزیڈنٹ حیدرآباد کو تحریر فرماتے ہیں کہ

> ”گورنر جنرل باجلاس کونسل برار کی سرکاری اراضی کے مستقل انتقال کی سخت ممانعت فرماتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ اس حکم کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے“
>
> (ملاحظہ ہو مراسلہ نمبرہ ۳۵ فارن ڈپارٹمنٹ مورخہ ۳۱ر جنوری سنہ ۱۸۶۳ء فورٹ ولیم) “

اس حکم کی مسٹر ڈنلاپ سکریٹری رزیڈنٹ حیدرآباد نے اپنے مراسلہ نمبر (۷) مورخہ سنہ ۱۸۷۸ء کے ذریعہ کمشنر برار کو مکرر اطلاع دی اور انھیں ہدایت کی کہ ”کسی حالت میں بھی برار کی سرکاری زمینات جو بادشاہ کی ملکیت ہیں فروخت نہ کی جائیں“۔

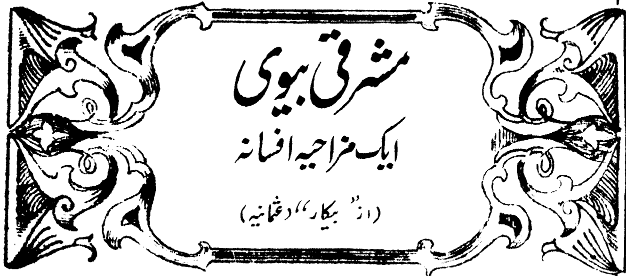
اس مراسلہ کی تشریح مسٹر سی، سی دیسائی ۔ آئی، سی، ایس افسر اعلیٰ نزول بندوبست اپنی ایک تصنیف میں جو صوبہ کی حکومت نے شائع کی ہے مندرجہ ذیل الفاظ میں فرماتے ہیں :-

> ”چونکہ برار بطور امانت حکومت برطانیہ کے پاس ہے اس لئے حکومت ہند کا خیال تھا کہ انگریزی حکام کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ برار کی سرکاری آراضیات کے حقوق مالکانہ مستقل طور پر منتقل کریں“

اس میں شک نہیں کہ آخر کار سنہ ۱۸۸۵ء میں حکومت ہند نے صاحب رزیڈنٹ کے اصرار پر ”بہ منظوری ہز ہائینس نظام“ اپنے سابقہ احکام میں ایک حد تک ترمیم کی مگر میری رائے ناقص میں قوانین نزول سنہ ۱۹۱۲ء ۔ ان ترمیم

شدہ احکام کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ مراسلہ نمبر ۱۴۲ حکومت ہند۔ فارن ڈیپارٹمنٹ مورخہ ۱۸۸۵ء اور موجودہ قوانین نزول ۱۹۱۲ء کا مقابلہ اس حقیقت کو واضح کر دیگا۔ غرض کہ مروجہ قوانین نزول اعلیٰ حضرت حضور نظام کے حقوق بادشاہت کے منافی ہیں ان تمام آئینی اور قانونی پیچیدگیوں کا واحد حل یہ ہے کہ برار کو صوبہ متوسط سے علحدہ کرکے اعلیٰ حضرت حضور نظام کے ماتحت ایک علحدہ صوبہ بنا دیا جائے اور حکومت حیدرآباد کو وہی اختیارات تفویض کر دئے جائیں جو فی الحال گورنمنٹ آف انڈیا یا حکومت ہند کو اس صوبہ پر حاصل ہیں۔ اگر برار صوبہ متوسط کا جز رہ کر وفاق ہند میں شریک ہوا تو اہالیان برار مجوزہ اصلاحات سے کافی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

(تمام شد)



مشرقی بیوی

ایک مزاحیہ افسانہ

(از ”بیکار“، عثمانیہ)

دفتر سے تھکے ہوئے ہم گھر واپس آئے آرام کرسی پر دراز ہوگئے۔ ملازمہ کو پانی لانے کے لئے کہا۔ کمرہ میں نورانی ہمہ تن بن سنورنے میں مصروف تھی۔ وہ کبھی آئینہ دیکھتی کبھی چوٹی برابر کرتی اور کبھی اپنے نہایت شوخ رنگ کے کپڑے جھاڑتی۔ ہاں اس کی سہیلی کا بیاہ رچا تھا اور وہ مدعو کی گئی تھی۔ شان محویت تو دیکھئے کہ ہم نے ملازمہ کو آواز دی لیکن نورانی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ پانی آیا اور ہم منہ ہاتھ دھونے میں مصروف ہوگئے۔ ہاں کبھی کبھی ترچھی نگاہوں سے کمرے کی طرف ضرور دیکھ لیتے تھے۔ نورانی نہایت خوشی و اطمینان سے خود کو آراستہ کر رہی تھی، اس کے بال مشرقی رواج کے موافق جمے تھے، ہونٹوں پر پان کی دھڑی اور دانت مسی مالیدہ تھے، چوٹی کو مختلف زریں تاروں اور موبافوں سے آراستہ کیا گیا تھا کان تنکوں سے اینٹھے ہوئے، گلے میں مختلف قسم کے ہار سنہری اور جڑاؤ تھے (ان میں سے صرف ایک چندن ہار ہے جس کے نام سے ہم واقف ہیں) ڈنڈوں پر طلائی کڑے اور کنگھنیاں جڑی تھیں جن کا منظر ایک سادگی پسند انسان کیلئے نہایت متوحش تھا۔ کلائیوں میں پہونچیاں اور انگلیاں انگوٹھیوں سے لدی تھیں۔ جسم پر سبز رنگ کا زریں کف گلے والا کرتا اور ایک نہایت سرخ اور شوخ بنارسی ساڑی زیب تن تھی، ٹخنوں میں پازیب توڑے اور پیر میں مشرقی طرز کا چڑھاوا تھا یقین مانئے وہ ایک زیورات سے لدا ہوا بت معلوم ہوتی تھی یا فی الحال آپ اس کو ایک بنک تصور کر لیجئے۔

موٹر کا ہارن بجا اور نورانی ملازمہ کو آواز دیتی ہوئی برآمدہ میں آئی۔ جونہی ہم پر نظر پڑی اپنے سیاہ چمکدار بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے کہا ”اوہو! آپ آگئے۔“ وہ بہت زیادہ حسین تھی اس کا جسم نہایت متناسب تھا اس کی بھولی بھولی باتیں ہمیں بہت ہی پسند تھیں۔ ہم تھے سادہ اور نفیس آدمی اس لئے نورانی کے چھریرے بدن اور حسین صورت کے لئے ہمیں سادہ اور نفیس لباس بہت ہی موزوں معلوم ہوتا تھا۔ ملازمہ دوڑی آئی نورانی کو موٹر میں سوار کرانے کے لئے چادریں لے لیں۔ نورانی اپنے ہر کام پر ہم سے تعریف و توصیف کی خواہشگار ہوتی۔ ہاں اس میں کئی اوصاف لائق تحسین تھے جن کے متعلق ہم تعریفوں کے پل باندھ دیتے۔ لیکن وہ قدیم لباس وضع اور قطع کی پابند تھی جس پر ہم کو اعتراض ہوتا۔ ہمارے اعتراضات پر بعض اوقات وہ بہت ہی برافروختہ ہوتی۔ موٹر میں سوار ہونے کے لئے وہ زینہ سے اترنے لگی۔ بھلا ہم جیسے سادگی پسند نئی روشنی کے انسان نورانی کو اس قدر بوجھ سے لدا پھندا کب دیکھ سکتے تھے توال سے منہ پوچھتے ہوئے کہہ بیٹھے ”واہ! بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہو جیسے نادیہ کا بیل۔“ نورانی کی تیوری میں بل پڑ گئے، اس کا حسین چہرہ سرخ ہوگیا وہ غضب ناک نگاہوں سے ملازمہ کو دیکھنے لگی جو چادریں لے کر قریب ہی کھڑی تھی بغیر کسی گفتگو کے وہ برآمدے میں آئی اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔ ہم ہکا بکا رہ گئے ”یا الٰہی ماجرا کیا ہے“، ہم نے اپنے دل میں کہا۔ توال کھونٹی سے ٹانگ دیا اور ہمت کرکے اس کے کمرے کے قریب پہنچے دیکھا کہ نہایت غصہ اور برہمی کے ساتھ گہنا اتارا جا رہا ہے، ایک منٹ تک ہم ساکت دیکھتے رہے ”کیوں نورانی کیا جانا ملتوی کر دیا؟“ ہم نے نہایت نرمی سے دریافت کیا ”جی ہاں اب میری بجائے آپ تشریف لے جائیے!“ نورانی نے طنزاً جواب دیا۔ ”تو اس قدر بگڑتی کیوں ہے آخر خفگی کا کوئی سبب؟“ ہم نے پھر نہایت متانت اور ہمدردی کے لہجہ میں کہا ”موٹر والا پہنچ رہا ہے شام ہو رہی ہے تو جلد چلی جا“ ”میں ہرگز نہیں .. جاؤں گی“ نورانی نے بگڑ کر کہا ”آپ کو میری کوئی بات پسند نہیں جتنے کہ میرا پہننا اوڑھنا بھی . . . . . .“

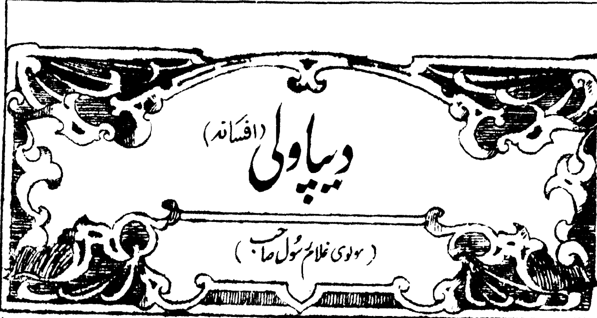
”نادان!“ ہم نے نصیحت آمیز لہجہ کہا ”تو نے یہ کیسے فرض کر لیا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ تو بھی زمانہ موجودہ کا رسم و رواج سیکھ لے۔ قدیم ڈگر کو چھوڑ کر کچھ تو بھی نئی روشنی سے منور ہوجائیے، آخر خدا نے تجھے بھی تو عقل دی ہے، اس وحشت خیز گہنے کی بجائے سادہ نفیس اور قیمتی لباس پہن مگر بلّہ خود کو اس قدر بوجھ سے تو نہ لاد۔ تو کسی لمباڑے کے گھر تو آئی نہیں ہے جو لمباڑن بنی رہے۔“ ”بس میں آپ کی نصیحت سے باز آئی ملازمہ سے کہہ دیجئے کہ موٹر واپس کر دے۔“

نورانی کی اس ہٹ پر ہمیں غصہ بھی آتا تھا اور پیار بھی وہ گہنا اتارنے میں مصروف تھی، ہم جرات کرکے اس کے قریب پہنچ گئے۔ ”آج تجھے ہو کیا گیا ہے؟“ ہم نے بے چین ہو کر اسے روکتے ہوئے کہا ”بھئی خطا ہوئی معاف کرنا، تو کانوں میں بڑے بڑے پتیلی گھمر سے ٹانگ لے ہم آئندہ سے تجھے کچھ نہ کہیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے ہم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور میز پر سے چندن ہار (جو اس نے اتار پھینکا تھا) اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے پہنانے لگے۔

”بس ہٹ جائیے۔“ نورانی نے ہمیں تیز نظر سے زخمی کرتے ہوئے کہا ”میں کبھی نہیں پہنوں گی۔“ ہم پہنانے کی کوشش کرتے تھے اور وہ بچنے کی کوشش کرتی تھی، تین یا چار منٹ کی کشمکش کے بعد ہم ہار پہنانے میں کامیاب ہوگئے۔ ملازمہ برآمدہ میں ساکت کھڑی ہماری کشتی دیکھ رہی تھی۔ ہماری کامیابی پر نورانی کو شاید ہنستی

آگئی لیکن پھر اس نے اپنا چہرہ بناوٹی طور پر غضب آلود بنالیا۔ "دیکھیئے آپ مجھے اس قدر تنگ نہ کیجیئے ورنہ ...." "تیرا دماغ چل تو نہیں گیا ہے" ہم نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "واللہ نورانی تونے یہ کنگھنیاں کب خریدیں واقعی تیرے ہاتھوں میں کیا ہی بھلی لگتی ہیں"۔ "جی ہاں!" نورانی نے گردن کو ایک طرف جھکا کر کہا۔ اب نہ ہی اس کے غصے میں وہ شدت تھی اور نہ ہی وہ پہلی سی تیزی کے ساتھ گھنا اتارنے میں مصروف تھی۔ "اوہو! ہم نے یہ طلائی پہونچیاں تو دیکھی ہی نہیں"۔ ہم نے پھر خوشامدانہ لہجہ میں اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا۔ "واہ! تیری کلائیوں میں کیا ہی زیب دیتی ہیں"۔ ہمارے اس جملہ سے غصہ کا پارہ اور دو درجہ اتر گیا۔

اب نورانی میز سے لگی کھڑی تھی اس کے چہرہ سے خفیف سی برہمی کے آثار ہویدا تھے۔ موٹر تھا کہ اپنے کا اور شوفر چلا رہا تھا کہ شام ہو رہی ہے۔ "بات یہ ہے نورانی!" ہم نے سمجھاتے ہوئے رازداری کے لہجہ میں کہا "گھنے کا انتخاب تو تو خوب کرتی ہے لیکن پہننے کا اصول ہی نہیں جانتی۔ اگر تو پازیب کلائیوں میں توڑے کانوں میں پہونچیاں ٹخنوں میں پہنتی تو کم از کم ہمیں بھلی لگتی"۔ اس جملہ پر نورانی نے ہمارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑالیا اور ہنسی کو جبراً روکتے ہوئے دوسری جانب منہ پھیر لیا۔ اب ہم نے نہایت اطمینان سے وہ گھنا جو اس نے حالت برہمی میں اتار پھینکا تھا اپنے ہاتھوں سے پہنانا شروع کیا۔ پہلے پازیب پہنائے۔ کلائیوں میں پہونچیاں پہنا دیں پھر دوسرے ہار جو میز پر بکھرے پڑے تھے گلے میں پہنانے لگے۔ نورانی سے رہا نہ گیا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ہار ہمارے ہاتھ سے چھین لیا۔ "جا پہن کر تیار ہو جا دیوانی!" ہم نے کہا "موٹر والا دق کر رہا ہے"۔ یہ کہکر ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔ گرمی سے اور نورانی کی خوشامد کرتے کرتے ہم پسینے میں نہا گئے تھے۔ ملازمہ کونے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ۵ منٹ بعد نورانی پھر پہلے کی طرح گھنے میں لدی ہوئی کمرہ سے باہر آئی۔ جونہی ہم پر نظر پڑی اک شان استغنا سے مسکراہٹ کو روکا، ملازمہ چادر لی ہوئی باہر پہنچ گئی نورانی نے صحن میں اتر کر دروازہ کا رخ کیا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے ہم نے وہی پہلا جملہ زیر لب دہرایا "واہ بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہو جیسے ...." نورانی دروازہ تک پہونچ چکی تھی جہاں موٹر کھڑا تھا۔ جونہی یہ جملہ فضا میں منتشر ہو کر اس کے کانوں تک پہونچا پلٹ کر ہم کو دیکھا اور کچھ اس طرح مسکرایا کہ ہم مسحور ہو کر ساتویں آسمان پر پہنچ گئے۔ موٹر چلتا بنا اور ہم اکیلے بیٹھے ہوئے صنف نازک کی نفسیات اور مشرق کی پابندی رواج ولباس پر غور کرنے لگے۔ فقط



دیپاولی کی شام تھی۔ ایک جھونپڑے سے گھر میں ایک مفلس خاندان لکشمی پوجا کا انتظام کر رہا تھا۔ ایک گوشے میں دیوار پر سفید لکیریں سی کھینچی ہوئی تھیں جن کو غور سے دیکھنے پر یہ پتہ چلتا تھا کہ بڑی بھاری شکل اتارنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اس شکل کے نیچے گوبر سے لیپی ہوئی زمین پر دو نئی لیکن بھدی بنی ہوئی ہنڑیاں (بچوں کے کھلونے) رکھی ہوئی تھیں۔ ہنڑیوں کے آگے آٹھ دس مٹی کی چھوٹی چھوٹی دِاولیاں (دِینتھیاں) رکھیں تھیں جن میں بتی اور تیل پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف طاق پر ارنڈی کے تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ پاس ہی ایک بڑھیا اپنے گھٹنوں پر سر رکھے متفکر حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے روبرو ایک عورت جسکی عمر تقریباً ۲۴، ۲۵ برس کی ہوگی، دیوار پر کھینچی ہوئی شکلوں کو جمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ شکلیں اسی کی بنائی ہوئی تھیں اور وہ دل ہی دل میں اُن پر تنقید کر رہی تھی۔ عورت کے جسم سے اپنا جسم لگائے ہوئے ایک آٹھ سال کا لڑکا بڑی توجہ سے کبھی ایک ہنڑی کو دیکھتا تھا اور کبھی دوسری کو۔

دفعتہً لڑکے نے اپنا منہ ذرا اوپر اٹھا کر عورت کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اماں، اب چراغ جلاؤ رات تو ہو گئی"۔ عورت نے شکلوں پر سے نظر ہٹا کر لڑکے کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "ابھی جلائے جائیں گے، ذرا اور اندھیرا ہو جائے"۔

بڑھیا گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر آنچل کو ٹھیک کرتے ہوئے بول اٹھی "اپنے باپو کو تو آجانے دے۔ ابھی کھیل کھلونے تو آئے ہی نہیں"۔ لڑکا ماں کے پاس سے گھٹنوں کے بل بڑھیا کے پاس آیا اور گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر بڑھیا کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "دادی، باپو کیسے کھلونے لائیں گے؟"۔ دادی نے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا "گنیش لائیں گے، لکشمی لائیں گے اور کچھ لائیں گے"۔ لڑکا مارے خوشی کے دادی کی گود میں گھوم کر بیٹھ گیا اور پھر ہنڑیوں کو تکنے لگا...... بڑھیا عورت سے بولی "پوجا کی تھالی رکھ رکھ اب آتا ہی ہوگا"۔ عورت آنچل سنبھالتے ہوئے اٹھی اور قریب کے ایک کمرے کے اندر چلی گئی۔ کچھ لمحہ بعد پیتل کی ایک چھوٹی تھالی ہاتھ میں لئے ہوئے دوبارہ باہر آئی۔ تھالی میں رولی (کنکو) چڑوے اور پانی سے بھرا ہوا چھوٹا سا برتن رکھا ہوا تھا لڑکا گھس کر تھالی کے پاس آ بیٹھا۔ اور اس نے اپنی انگلی رولی کی جانب بڑھائی، لیکن قبل اس کے کہ انگلی رولی تک پہنچے، بڑھیا بولی ہاں، ہاں ہاتھ نہ لگا سب خراب ہو جائیگا۔ لڑکے نے جھجک کر ہاتھ پیچھے ہٹالیا اور گھوم کر دادی کے منہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا "خراب کیا ہو جائے گا؟ میں ٹیکا لگاؤں گا"۔ اس کی ماں بولی "ابھی نہیں بیٹے پوجا تو ہو جانے دے"۔ اتنا کہہ کر عورت باہر چلی گئی اور کچھ لمحہ بعد پھر اندر آکر بولی "اب تو پوجے کا وقت ہو گیا"۔

"ہاں رگھو بھی اب آتا ہی ہوگا"، بڑھیا نے کہا عورت بیٹھ گئی۔ اسے بیٹھے کچھ ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ کسی کی آمد کی آہٹ نے سب کو چونکا دیا۔ لڑکا "بابو آگئے"، کہہ کر فرط اشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ عورت بھی سرکا پلو آگے کھسکا کر ایک جانب سرک گئی۔ اس اثنا میں ایک مرد جسکی عمر ۳۰ سال کے لگ بھگ ہوگی، دائیں ہاتھ میں ایک گٹھڑی اور بائیں ہاتھ میں کچھ مٹی کے کھلونے لئے ہوئے اندر آیا۔ پہلے اپنی گٹھڑی زمین پر رکھ دی اور پھر بڑی احتیاط سے مٹی کے کھلونوں کو گٹھڑی کے پاس رکھ دیا۔ لڑکا تیر کے مانند کھلونوں کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے سب کھلونوں کو اس نے ایکدم دیکھنا چاہا۔ لیکن اس کی ماں نے لپک کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا، اور آہستہ سے بولی "ٹوٹ جائیں گے"۔ لڑکا دوسرے ہاتھ میں ایک کھلونا اٹھا کر بولا

"ہا ہا ہا! یہ تو پری ہے، پری!" ماں نے لکشمی اور گنیش کی مورتیاں اٹھا کر تھالی میں رکھ دیں اور باقی دو کھلونے دونوں ہنڈیوں کے درمیان رکھ دے۔ مرد نے اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا۔

بڑھیا بولی۔ "اب تو پوجے کا وقت ہو گیا ہوگا؟"

مرد نے جواب دیا۔ "ہاں، ذرا پیر دھولوں تو"

اتنا کہہ کر وہ پھر باہر چلا گیا۔ ادھر عورت کمرے کے اندر سے ایک بڑی پرات لے آئی۔ اس پرات میں اس نے گٹھری کھول کر کھیلیں، بتاشے اور کچھ شکر کے کھلونے رکھ دئے اور پرات کو پوجا کی تھالی کے پاس سرکا دیا۔

بڑھیا بولی "آسن بچھا دے۔"

عورت ایک کشن آسن لے آئی اور اسے تھالیوں کے سامنے بچھا دیا۔ مرد جس کا نام راج کشور تھا۔ آکر آسن پر بیٹھ گیا۔ پہلے اس نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر تھالی میں رکھا۔ بعد ازاں تھالی میں ادھر ادھر دیکھ کر بولا "اس میں مٹی کا ٹکڑا اور کلاوا (نارڑا) تو رکھا ہی نہیں۔" بڑھیا نے منہ پھیر کر عورت کی طرف دیکھا، لیکن وہ پہلے ہی جا چکی تھی۔ کچھ لمحہ میں وہ دونوں چیزیں لے آئی اور اس نے انہیں تھالی میں رکھ دیا۔ راج کشور نے مٹی کے ٹکڑے پر کلاوا لپیٹ کر اسے "گنیش" پر چڑھایا، بعد ازاں پہلے گنیش اور روپے کی پوجا کی پھر مٹی کی مورتوں کی پوجا کرنے کے بعد دو چراغ جلائے اور اس وقت لڑکے کے قہقہہ لگایا۔ کھیلیاں بتاشے وغیرہ اٹھا کر لڑکے کو دئے لڑکے کے ایک ہاتھ میں "پری" تھی، دوسرے ہاتھ سے اس نے کرتے کا دامن اٹھا کر اس میں کھیلیں بھر لیں۔ بڑھیا بول اٹھی "ہے لکشمی مہارانی، ہے گنیش جی! رگھو کو نوکری دلادو۔ چھ مہینے بیٹھے بیٹھے ہوگئے ہے دیوالی میا! اب تو کرپا کر"

راج کشور کا سر جھک گیا۔ ایسا معلوم ہوا گویا وہ بھی ماں کی دعا کے ساتھ آمین کہہ رہا تھا۔ پیچھے بیٹھی ہوئی بیوی نے ایک لمبا سانس لیا۔ تھوڑی سی کھیلیں اور بتاشے منہ میں رکھ کر راج کشور اٹھ کھڑا ہوا اور باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد عورت نے بھی پوجا کی اور کچھ دیر تک ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرتی رہی بعد ازاں باقی چراغ روشن کئے انہیں تھالی میں رکھ کر باہر لے گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر راج کشور اپنی والدہ سے بولا۔ "اماں، اب میں جاتا ہوں میری راہ نہ دیکھنا۔"

"کہاں جاؤ گے بیٹا؟" ماں نے پوچھا۔

"جاتا ہوں، ذرا قسمت آزمائی کروں گا۔ شاید دیوالی مہارانی خوش ہو جائیں"

بڑھیا بولی "کیا جوا کھیلے گا؟ ارے بیٹا ایسا نہ کرنا۔ کہیں ہار ہو رہا تو غریبی میں آٹا گیلا ہو جائے گا۔ ابھی نہ جانے کب تک نوکری لگے۔ اس وقت تک کھانے کو بھی چاہئے۔"

"کچھ بھی ہو اماں اب تو جو ہوگا دیکھا جائے گا"

اتنا کہہ کر مرد باہر کی طرف چلا اور باہر بیوی سے مٹھ بھیڑ ہوئی وہ بولی۔ "جوا مت کھیلو ہمیں جوے کا پیسہ نہیں چاہئے اور جوے میں ہار گئے تو روٹیوں کے لالے پڑ جائیں گے"

راج کشور نے بیوی کے چہرہ پر نظر ڈالی، اس نے بیوی کے چہرے پر تفکرات اور دلی رنج و ملال کے نمایاں آثار دیکھے۔ شوہر کی بیکاری کے بعد چھ مہینے کے اندر اس کا خوبصورت چہرہ جو تفکرات کی وجہ سے مرجھا گیا تھا، وہ اس وقت جوے کی بدانجامی کے خوف سے نہایت ہی اداس ہو گیا تھا۔ راج کشور کے دل سے ایک آہ نکلی لیکن اس نے اسے اندر ہی دبا کر شادمانی کے لہجہ میں کہا "بھگوان سب اچھا ہی کریگا تم گھبراؤ نہیں" اتنا کہہ کر راج کشور تیزی کے ساتھ باہر چلا گیا۔

۲

"بابو جی ایک ٹکٹ دیدیجئے" تیسرے درجے کے دریچہ پر کھڑے راجکشور نے کہا

"کہاں کا"؟ بابو نے پوچھا۔

راج کشور... سوچنے لگا۔ بابو نے اُسے سوچتے ہوئے دیکھ کر خفگی سے کہا جلد "بولو"

"اچھا کلکتہ کا دیدیجئے" راجکشور نے جواب دیا۔

دوسرے مسافر اس کی طرف حیرت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ راج کشور ٹکٹ لیکر بھیڑ کے باہر نکلا اور ٹکٹ کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ پلاٹ فارم پر پہنچا۔ اس کے ساتھ کوئی اسباب نہ تھا، جن کپڑوں میں وہ رات میں گھر سے نکلا تھا، وہی کپڑے اس کے جسم پر تھے۔ صبح کے سات بج رہے تھے گاڑی آنے میں پندرہ منٹ کی دیر تھی۔ راج کشور پلاٹ فارم پر ٹہلنے لگا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جو رہ رہ کر ڈبڈبا آتی تھیں لیکن کچھ لمحے میں ہی وہ پھر خشک ہو جاتی تھیں، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، لمحہ لمحہ پر نکلنے والے لمبے سانسوں سے اس کے اندرونی غم کا اظہار ہو رہا تھا۔ گاڑی آئی۔ راج کشور ایک ڈبے میں جا کر کونے میں بیٹھ گیا۔ اسٹیشن کی چہل پہل کی طرف اس کا دھیان نہیں تھا اور نہ ڈبے میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافروں کی طرف توجہ تھی۔ ٹوپی کے اندر دونوں ہاتھ چھپائے کھڑکی کے باہر کی جانب نظریں جمائے ہوئے تھا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور ایک جھٹکے کے ساتھ چل پڑی، رفتہ رفتہ پلاٹ فارم اسٹیشن کی حد لائن کی دونوں طرف بکالو کی قطاریں اور سڑک پر دوڑتی ہوئی دوسری قسم کی سواریاں پیچھے چھوٹنے لگیں۔ راجکشور نے اپنا چہرہ کھڑکی کے باہر نکال لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں ٹپکنے لگیں دن کے سوا تین بجے گاڑی مغل سرا پہنچی۔ راج کشور اسی جگہ بیٹھا تھا، اونی چادر تہ کر کے گھٹنے کے نیچے رکھ لی تھی جس بنچ پر راج کشور بیٹھا تھا وہ اب بہت کچھ خالی ہو چکی تھی۔ اس کے دوسرے سرے پر دروازے کے قریب ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتہً دروازہ کھلا اور قلی ایک ٹرنک اور بستر کا بنڈل سر پر رکھے اندر آیا اس نے آکر راج کشور کے اوپر والے تختے پر دونوں چیزیں رکھ دیں اسی کے پیچھے ایک مارواڑی آیا اور راجکشور کے قریب بیٹھ گیا۔ پہلے اس نے قلی کا حساب چکایا۔ لیکن قلی کی تسکین نہ ہوئی اس نے کہا "سیٹھ جی، کم سے کم چار پیسے تو اور دیجئے، پل پرسے لایا ہوں۔"

"پل پر سے لایا ہے تو کیا ڈر جو تیرا ریٹ (Rate) ہے اس سے دو پیسے بڑھتی دئے ہیں" سیٹھ جی نے کہا۔

"ریٹ سے ہمارا پیٹ تھوڑی ہی بھرتا ہے سیٹھ جی! آپ جیسے سیٹھ لوگ تو بہت دے جاتے ہیں۔"

"میں ویسا سیٹھ نہیں ہوں سمجھا۔ جا اپنا کام دیکھ!"

"اچھا دو ہی پیسے دیدیجے" قلی نے عاجزی کی۔

"ایک کیا دھیلا تو اب دوں نہیں جا بھاگ" سیٹھ جی آنکھیں دکھا کر بولے۔ قلی بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ سیٹھ جی راج کشور کی طرف دیکھکر بولے۔

"ان سسروں کو چاہے جتنا جاستی دے دو، پر ان کا من نہیں بھرتا"

راج کشور خشک انداز میں ذرا مسکرا کر بولا "بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔

"بڑی بدذات قوم ہے۔ آپ کہاں جائیں گے؟"

"کلکتہ" راج کشور نے جواب دیا۔

"اوہو! اب تو ہمارا آپ کا ساتھ ہے، کہاں سے آرہے ہو؟"

"کانپور سے"

"اچھا یہ تو بڑا اچھا اتفاق ہوا۔ میں تین برس کانپور میں رہا ہوں۔ میرے

سیٹھ کی ایک دوکان کانپور میں بھی ہے پہلے میں اس دوکان میں تھا اب ادھر انھوں نے کلکتہ بلا لیا تب سے وہیں ہوں چار دن ہوئے کاشی جی (بنارس) آیا تھا۔ آج کلکتہ جا رہا ہوں"۔

"دیوالی گھر پر کی ہوگی، کاشی جی میں گھر ہے کیا؟" راجکشور نے پوچھا۔

"اجی رام! ہم تو جہاں رہے ہیں وہیں ہمارا گھر ہو جاوے ہے اور ہمیں ہولی دیوالی سے کیا کام؟ گھر پر رہے تو گھر پر ہوگئی، جو پردیس میں رہے تو پردیس میں ہوگئی۔ کام پہلے ہونا چاہئے"۔

"ٹھیک بات ہے" راج کشور نے کہا

سیٹھ جی نے بنچ کو خالی دیکھکر راجکشور سے کہا "حکم ہو تو بستر لگا لوں، رات بھر کا سفر ہے"

"ہاں، ہاں ضرور!" راج کشور بولا:۔

سیٹھ جی اٹھے اوپر سے بستر اتارا اور اسے کھول کر بنچ پر بچھایا۔ راجکشور نے بھی مدد دی۔

بستر بچھا کر سیٹھ جی بولے "آپ بھی اپنا بستر اوپر لگا لیجئے"۔

راج کشور کچھ شرمیلے انداز میں بولا "میرے پاس بستر وستر نہیں ہے۔ میں تو جیسا آپ کے سامنے بیٹھا ہوں ویسا ہی ہوں"۔

"ارے! یہ کیسی بات! اتنا لمبا سفر اور ساتھ کچھ بھی نہیں؟

"وہاں کہاں ٹھیرو گے؟"

"کیا بتاؤں سیٹھ جی مصیبت کا مارا ہوں، نوکری کی تلاش میں جا رہا ہوں جو کہیں لگ جائے تو۔۔۔۔"

سیٹھ جی نے ایک دفعہ راجکشور کو غور سے سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا "کون بھائی ہو؟"

"گور برہمن ہوں" راج کشور نے جواب دیا۔

"اوہو! تب تو آپ ہمارے پوجئے (قابل احترام) ہیں"

اسی وقت گاڑی نے سیٹی دی اور چل پڑی۔

۴

راج کشور کو کلکتہ آئے ہوئے چار دن گزر چکے ہیں۔ جس سیٹھ سے ریل میں اس کا تعارف ہو چکا تھا، اس نے راج کشور کو اپنے مالک کے یہاں نوکر رکھا دیا اگرچہ راجکشور کو رہائش اور گزر اوقات کا ذریعہ میسر آ چکا تھا لیکن تاہم وہ متفکر رہتا ہے۔ کلکتہ میں گو اس جیسے اجنبی کے لئے خاطر خواہ دلچسپی کے ذرائع موجود تھے لیکن باوجود اس کے دل پر خوشی نہ تھی۔ دیوالی کی رات، لکشمی کی پوجا! لڑکے کی یاد! بیوی کی افلاس زدہ حالت یہ ترحم آمیز نظارہ ذہن سے اترانہ تھا۔ ماں کی محبت ہر دم اس کی نظروں میں پھر رہی تھی اس کے اس طرح غائب ہو جانے پر ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ انہی خیالات کے آنے پر وہ مضطرب ہو جاتا تھا۔ کئی دفعہ اس کے دل میں آیا کہ خط کے ذریعہ ان کو اپنی خیریت سے مطلع کرے۔ لیکن وہ ٹال جاتا تھا۔ وہ سوچتا تھا "خط لکھ کر کیا کرونگا، میں خود دو چار دن میں جاؤں گا۔ یہاں میرا دل نہیں لگتا، میں یہاں زیادہ دن نہ رہ سکوں گا مالک سے موقع پا کر کہوں گا کہ وہ مجھے کانپور کی دوکان میں مامور کر کے وہاں بھیجدیں اگر مان جائیں تو بہتر ہے ورنہ یہاں تو رہوں گا نہیں" اس طرح دل میں منصوبے باندھ کر وہ اپنا وقت کاٹ رہا تھا، ایک ایک لمحہ اسے پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ دل بہلانے کے لئے جب وہ کلکتہ کی سڑک پر جا نکلتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کسی سنسان جگہ میں ہے۔ سینکڑوں ہزاروں آدمی ادھر اودھر آتے جاتے دکھائی دیتے تھے لیکن سب اپنے اپنے کام میں اس قدر منہمک تھے کہ کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس قدر جم غفیر میں وہ اپنے آپ کو بالکل اکا اور تنہا پاتا تھا۔ کوئی اس کی بات نہ پوچھتا تھا۔ کوئی اس کی دلی بے چینی کو رفع کرنے کے لئے اس پر ہمدردانہ نظر تک نہ ڈالتا تھا۔ کئی منزلوں کی اونچی اونچی کوٹھیاں اور بنگلے اسے کبوتروں کی کابک اور ان میں رہنے والے بے شمار آدمی کبوتر جیسے معلوم ہوتے تھے۔ انھیں دیکھ کر اسے اپنا چھوٹا سا گھر یاد آ جاتا تھا وہ غور کرتا تھا کہ ان میں قیام پذیر ہونے کی نسبت اسے اپنے چھوٹے اور تنگ مکان ہی میں رہنے بسنے میں زیادہ راحت ہے۔ ایک چھوٹی دوکان کے روبرو ایک بنگالی بابو کچھ کاغذ اور پنسل خرید رہے تھے۔ راجکشور وہاں کھڑا ہو کر موٹروں کی قطار دیکھنے لگا اچانک اس کے پیر پر کوئی چیز گری۔ اس نے دیکھا کہ ایک چمڑے کا کیسہ ہے۔ اس نے کیسہ اٹھا کر اس خیال سے کہ یہ کس کا ہے ادھر اودھر دیکھا۔ بنگالی بابو چھڑی بغل میں دبائے کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ راج کشور نے لپک کر ان سے کہا "بابو یہ آپ کا ہے" بابو صاحب نے پلٹ کر حیرت سے کیسہ کے اندر سے کیسہ پر نظر ڈالی۔ بعد از اں "اوہ" کہہ کر راج کشور کے ہاتھ سے کیسہ چھین لیا اور چلتے بنے۔ راج کشور حیرت زدہ کھڑا رہ گیا۔ بنگالی بابو نے شکریہ کے طور پر کچھ کہنا تو کجا، اس کی طرف دیکھا بھی نہیں! راج کشور کی طبیعت اکتا گئی وہ سیدھا مالک کی کوٹھی پر آیا اور اپنی کوٹھری میں بیٹھ کر رونے لگا۔

سیٹھ جی اپنے بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ راج کشور ایک تار لیکر ان کے پاس پہنچا، وہ اپنے بڑے منیم سے کچھ بات کر رہے تھے۔ راج کشور نے تار سامنے رکھدیا۔ سیٹھ جی تار کھولتے ہوئے منیم جی سے بولے۔ "اچھا کر لو۔ لیکن ایک لاکھ کا جوا ہے خوب سوچ سمجھ لینا چاہئے"۔

منیم جی بولے۔ "ہاں جوا تو لمبا ہے۔ لیکن نہ کرنے کے لائق"۔

"تو کر ڈالو" اتنا کہہ کر سیٹھ جی نے تار پر نظر ڈالی۔

منیم جی بولے "اچھا تو آپ سوچ لیجئے میں بھی سوچ لوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آؤں گا"

"اچھا!" کہہ کر سیٹھ جی نے تار الگ رکھدیا منیم جی چلے گئے۔

"ایک لاکھ کا جوا" راجکشور کا کلیجہ دہل گیا۔ سیٹھ جی نے اس کی طرف دیکھکر ذرا مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے پنڈت جی؟ اداس بہت رہتے ہو۔ کیا جی نہیں لگتا ہے"۔

راجکشور نے عاجزانہ انداز میں کہا "سیٹھ جی اگر حضور معاف ہو تو کچھ کہوں"

"کہو! کہو! قصور کی کیا بات ہے؟" سیٹھ جی نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "ان داتا! جوے کی بدولت آج میری یہ حالت ہے کہ میں اپنے بال بچوں سے دور یہاں پڑا ہوں۔ میں چھ مہینے سے بیکار تھا گھر میں صرف چالیس روپے تھے انہیں لے کر میں دیوالی کی رات کو جوا کھیلنے نکلا رات بھر کھیلتا رہا اور صبح چار بجے تک سب ہار گیا۔ اپنی پونجی گنوا کر گھر لوٹنے کی ہمت نہ ہوئی سوچا ماں اور بیوی سے کیا کہوں، ان کے کھانے پینے کا انتظام کیسے کروں میں اسی سوچ میں پاگل سا ہوگیا۔ اسی پاگل پن میں میں نے وہیں ایک دوست سے کچھ روپے ادھار لئے اور سیدھا اسٹیشن کی طرف بھاگا اور کلکتہ کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور یہاں آگیا۔ وہ سارا واقعہ مجھے خواب سا معلوم ہو رہا ہے۔ دیوالی کی رات کو دھرم کے خلاف روپیہ کمانے کے لالچ نے مجھے اس حالت کو پہنچایا۔ سیٹھ جی جوے کا نام سنتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں"۔

سیٹھ جی ہمدردانہ انداز میں مسکرا کر بولے "ٹھیک ہے۔ جوا ایسی ہی چیز ہے۔ لیکن ہم جو جوا کھیلتے ہیں وہ دوسری چیز ہے"۔

"دھرم اوتار جوا جوا ہی ہے۔ وہ چاہے جیسا ہو۔ میری تو آپ سے دست بستہ یہی عرض ہے کہ آپ یہ کام نہ کریں"۔

سیٹھ جی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ راجکشور آزردہ ہو کر سیٹھ جی کا منہ تکنے لگا۔ کچھ لمحے تک ہنسنے کے بعد سیٹھ جی بولے "جوے سے تم کو بہت تکلیف پہنچی ہے"۔

"یہ تکلیف کیا کچھ کم ہے۔ بغیر کہے سنے گھر چھوڑ کر بھاگ آیا۔ رات دن وہیں کی فکر لگی رہتی ہے کسی بچہ کو روتے دیکھتا ہوں تو یہ سوچ کر کہ میرا بچہ بھی میری یاد میں اسی طرح روتا ہوگا میری چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔ کسی عورت کو رنجیدہ و مغموم دیکھتا ہوں تو اپنی ماں اور بیوی کی یاد آ جاتی ہے کہ وہ بھی اسی طرح غمگین ہوں گے۔ ایک رنج ہو تو کہوں۔ ان داتا! اگر آپ مجھے گھر جانے کی اجازت دیدیں تو آپ کا بڑا احسان مانوں گا میں اس قدر بے چین ہوں کہ اگر میرے پاس خرچ ہوتا میں بلا اجازت ہی چلا جاتا، لیکن پیسہ پاس نہیں ہے، اس لئے

لاچار ہوں۔"

کہتے کہتے راج کشور کا گلا بھر آیا۔ آبدیدہ ہوا۔ سیٹھ جی کا چہرہ سا بگڑ گیا۔ کچھ لمحے تک راجکشور کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھتے رہے۔ بعد ازاں بولے "اچھا اگر تمھاری ایسی ہی خواہش ہے تو کل پرسوں چلے جانا۔ کانپور میں ہماری ایک دوکان ہے وہاں کام کرنا۔ راجکشور ہاتھ جوڑ کر احسانمندانہ لہجہ میں بولا "اگر اتنی مہربانی ہو جائے، تو میں آپ کا عمر بھر ممنون رہوں گا۔"

سیٹھ جی نے کہا "اچھا پرسوں چلے جانا جاؤ۔"

راجکشور آنکھیں پونچھتا ہوا باہر کی طرف چلا۔ اسی وقت منیم جی اندر آئے۔ راجکشور باہر چلا گیا۔

سیٹھ جی کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ منیم جی نے نہایت انکسار کے ساتھ کہا۔ "میری رائے میں تو یہی مناسب ہے کہ ایشور کا نام لے کر یہ سودا کر لیجئے۔"

سیٹھ پریشان خاطر ہو کر بولے "ٹھہاؤ! نہیں کروں گا۔ پھر دیکھا جائے گا۔ جائیے اس وقت میرا دل ٹھکانے نہیں ہے"

منیم جی تعجب کی نظروں سے سیٹھ جی کو دیکھتے ہوئے چلے گئے۔

راجکشور کانپور لوٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ سیٹھ جی نے کچھ روپیے دئے تھے۔ انہی سے اس نے والدہ اور بیوی کے لئے ایک ایک جوڑا ساڑی کا خریدا تھا۔ بچہ کے لئے بھی کچھ کپڑے اور کھلونے لئے۔ مارے خوشی کے اس کا اداس چہرہ ہشاش بشاش ہو گیا تھا۔ مستقبل کی اسے ذرا بھی فکر نہ تھی اس کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ جلد گھر پہنچ جائے۔ سیٹھ جی سے رخصت جانے کے لئے وہ ان کے پاس پہنچا۔ سیٹھ جی ہاتھوں میں ایک تار لئے ہوئے کسی خیال میں محو تھے۔ راجکشور کو دیکھتے ہی مسکرا کر بولے "کہو پنڈت جی کیا تیاری ہو گئی؟"

"ہاں سرکار حکم ہو تو جاؤں ایک ایک منٹ بار معلوم ہو رہا ہے" راجکشور نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اچھا!" کہہ کر سیٹھ جی نے میز میں لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا۔ کچھ لمحہ بعد ایک دربان آ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ جی اس سے بولے۔

"منیم جی کو بھیجو" دربان چلا گیا۔ کچھ لمحہ بعد منیم جی آئے سیٹھ جی نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ منیم جی چلے گئے۔ سیٹھ جی راج کشور سے بولے "تو آپ کانپور والی دوکان میں نوکری کریں گے؟" "کروں گا نہیں تو بال بچوں کا پیٹ کیسے پالوں گا؟"

"اچھا تو ہم یہاں سے بھی چٹھی بھیج دیں گے اور یہ چٹھی ہم نے لکھی ہے اسے ہماری دوکان پر دے دینا۔ تمہیں نوکری مل جائے گی۔"

یہ کہہ کر سیٹھ جی نے ایک لفافہ راج کشور کی طرف بڑھایا راج کشور نے سیٹھ جی کے ہاتھ سے لفافہ لیکر انہیں بہت سی دعائیں دیں۔

اس اثناء میں منیم جی آ گئے۔ انھوں نے سیٹھ جی کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک مٹھا دیا۔ سیٹھ جی نے وہ مٹھا راجکشور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس دن میں ایک لاکھ کا سٹہ کرنے والا تھا۔ لیکن آپ کی باتوں سے میرا دل اتنا متاثر ہوا کہ میں نے اس دن وہ نہیں کیا۔ ابھی مجھے یہ تار ملا ہے۔ اگر میں اس دن وہ سودا کر لیتا، تو مجھے ایک لاکھ کا نقصان ہوتا۔ آپ کی بدولت میرا ایک لاکھ روپیہ بچ گیا۔ اس کے صلہ میں یہ آپ کو نذر کرتا ہوں۔ راج کشور نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ مٹھا لے لیا اور سیٹھ جی سے رخصت لے کر چل دیا۔

رات ہو گئی تھی۔ راجکشور اپنے گھر پہنچا۔ گھر میں تاریکی تھی۔ راج کشور نے پکارا۔ اماں! سنسان گھر میں "اماں" کا لفظ گونج گیا۔

معاً کسی نے دھیمی آواز میں کہا "کون بیٹا راجو؟" راجکشور نے کہا۔ "ہاں اماں۔ میں ہوں اماں چراغ تو روشن کرو۔"

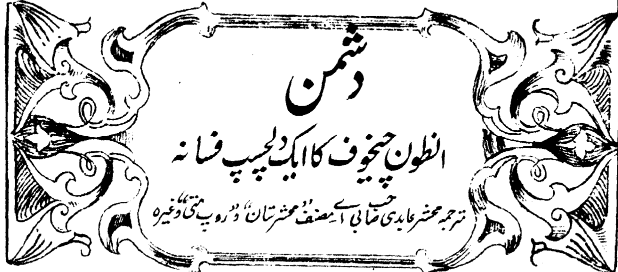
ماں زور زور سے رونے لگی "ارے بیٹا کہاں چلا گیا تھا؟"

راج کشور نے خوشنودی کے لہجہ میں کہا۔ "پہلے چراغ تو جلاؤ"

اسی وقت کسی نے اٹھ کر چراغ روشن کیا۔ راج کشور نے دیکھا چراغ کے پاس اس کی بیوی کھڑی ہے آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے بہہ رہے ہیں ایک طرف چارپائی پر ماں اٹھ کر بیٹھ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی بیٹا پڑا سو رہا تھا۔ راجکشور نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دیوار پر بنی ہوئی شکلوں کے سامنے سب چیزیں بدستور دھری تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طرف کسی نے کوئی توجہ ہی نہیں کی۔ راج کشور نے کوٹ کے اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھا نکالا اور اسے کھولا۔ کھولکر اس کے اندر سے پانچسو روپیے کے نوٹ نکالے۔ ان نوٹوں کو لکشمی کی مورتی کے سامنے رکھ کر اس نے ہاتھ جوڑے اور آنکھیں بند کر کے بولا "لکشمی مہارانی! دیوالی میا! تم نے جیسی کرپا اس غریب کے حال پر کی، ایسی ہی سدا بنائے رکھنا"

چراغ کے پاس کھڑی ہوئی اس کی بیوی آبدیدہ ہو کر نظر حیرت سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔

(ماخوذ از ہندی)



دشمن

انطون چیخوف کا ایک دلچسپ فسانہ

ترجمہ محشر عابدی صاحب ایم اے مصنف "محشرستان" "روپ متی" وغیرہ

ستمبر کی ایک تاریک رات کو ۹ اور ۱۰ بجے کے درمیاں ڈاکٹر کریوف کی چھ سالہ لڑکے اینڈری نے انتقال کیا۔ عین اس وقت جب کہ ڈاکٹر کی بیوی جذبات غم و یاس سے مغلوب ہو کر مردہ کے بستر پر جھکی ہوئی تھی گھنٹی کی کرخت آواز آئی۔ اسی روز ڈاکٹر نے اپنے ملازمین کو گھر میں آنے سے منع کر دیا تھا کہ اس کے لڑکے کو مرض متعدی تھا اس لئے اس وقت خود ڈاکٹر کو دروازہ کھولنا پڑا۔ اس وقت اس کے جسم پر نہ تو کوٹ تھا نہ واسکوٹ اس نے ابھی آنسوؤں سے نم چہرہ کو بھی نہ پونچھا تھا اور نہ ہاتھ دھوئے تھے جن میں کاربالک لگا ہوا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے نووارد کی صورت تمیز نہ کی جا سکتی تھی، صرف لمبا قد، ٹوپی اور ایک انتہائی افسردہ چہرہ کسی قدر نظر آرہا تھا۔

"کیا ڈاکٹر صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" نووارد نے پوچھا

"میں موجود ہوں" ڈاکٹر نے جواب دیا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

اچھا۔ تو آپ ہی ڈاکٹر۔ مجھے آپ سے ملکر بڑی خوشی ہوئی۔"

نووارد نے اطمینان کے لہجہ میں کہا:۔ اور وہ تاریکی میں ڈاکٹر کے ہاتھ کو ٹٹولنے لگا اس کو پکڑ لیا اور زور سے اپنے ہاتھوں میں دبالیا۔ "میں بہت مسرور ہوں اب ہم دونوں ایک دوسرے سے واقف ہو گئے۔ میرا نام ابوگن ہے اور مجھے تیخو کے یہاں موسم گرما میں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ میں بہت خوش ہوں کہ آپ مکان پر مل گئے۔ خدا کے لئے اب میرے ساتھ فوراً چلنے میں انکار نہ کیجئے میری بیوی سخت علیل ہو گئی ہے ..... گاڑی باہر ٹھیری ہوئی ہے"۔

نووارد کی آواز، حرکات اور تکلم سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ ایک انتہائی اضطراب میں مبتلا ہے ایک ایسے آدمی کی مانند جو گھر میں آگ لگنے کی وجہ سے بہت پریشان اور مبہوت ہو، وہ اپنے تیز تنفس اور تھرتھراتی ہوئی آواز کو، جس میں ایک غیر مؤثر خلوص اور ایک طفلانہ خوف مخفی تھا، روک نہ سکتا تھا۔ خوفزدہ اور مبہوت لوگوں کی طرح وہ مختصر اور غیر مسلسل اور بعض اوقات مہمل جملے بھی کہتا جا رہا تھا۔

"میں اپنے دل میں ڈر رہا تھا کہ شاید آپ نہ ملیں" وہ پھر کہنے لگا۔ "جب میں یہاں آرہا تھا تو میری روح کرب اور اضطراب میں گرفتار تھی۔ خدا کے لئے جلد لباس پہنکر میرے ساتھ چلئے۔ بس یہ واقعہ یونہی ہے ——— الکزنڈر پیپنسکی جس سے آپ واقف ہیں مجھسے ملنے آیا ہم لوگوں نے کچھ دیر گفتگو کی اور پھر چائے پینے لگے۔ یکایک میری بیوی چیخ اٹھی دونوں ہاتھوں سے اپنے دل کو پکڑ لیا اور کرسی پر گر پڑی ہم لوگ اسے اٹھا کر بچھونے پر لے گئے میں نے اس کی پیشانی پر امونیا ملا اور اس پر عرق گلاب چھڑکا لیکن وہ اس قدر ساکت پڑی رہی جیسے خدا نا کردہ مر گئی ہو۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں مرض شریان نہ ہو گیا ہو۔ کیونکہ اس کے باپ نے بھی اسی مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کیا ہے۔ کریوف سنکر خاموش رہا جیسے وہ روسی زبان سمجھتا ہی نہیں۔

جب ابوگن نے مکرر پیپنسکی کا نام لیا اور اپنے خسر کا ذکر کیا اور تاریکی میں ڈاکٹر کا ہاتھ ٹٹولنے لگا تو ڈاکٹر نے سر کو جنبش دی اور انتہائی حقارت و نفرت سے الفاظ کو چبا چبا کر کہنے لگا "معاف کیجئے میں نہیں آسکتا میرے لڑکے کو انتقال کئے ہوئے صرف پانچ منٹ گزرے ہیں"

"کیا یہ ممکن ہے؟" ابوگن نے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"او خدا ——— میں کس قدر بے وقت آیا ہوں۔ ایک غیر معمولی منحوس دن۔ حالات کس قدر مشابہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے پہلے ہی سے اس کا انتظام کر لیا تھا"

ابوگن نے دروازہ کا دستہ پکڑ لیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اس وقت وہ عجب پس و پیش میں تھا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ آیا چلا جائے یا مکرر استدعا کرے۔

"سنئے" اس نے یکایک ڈاکٹر کی آستین پکڑتے ہوئے کہا "میں آپ کی موجودہ حالت کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں اس وقت ایسی حالت میں آپ سے کوئی استدعا کرتے ہوئے نادم ہوں۔ لیکن میں اس وقت کیا کروں؟ خیال فرمائیے کہ اس وقت میں اور کس کے پاس جا سکتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اور کوئی ڈاکٹر نہیں ہے خدا کے لئے میرے ساتھ آئیے۔ میں آپ کو اپنے لئے نہیں بلا رہا ہوں میں خود مریض نہیں ہوں"۔

سکوت چھا گیا ——— ڈاکٹر نے ابوگن کی طرف پشت کر لی، تھوڑی دیر خاموش کھڑا رہا اور پھر آہستہ آہستہ نشست گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے غیر مستقل اور ڈگمگاتے ہوئے قدم اور اس کے اس انداز سے جس سے اس نے برقی لیمپ پر شیڈ رکھا اور پھر میز پر پڑی ہوئی کتاب کو دیکھنے لگا، یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس وقت نہ تو اس کا کہیں جانے کا ارادہ ہے اور نہ خواہش ہے اور اس کو نووارد کی موجودگی کا بھی خیال نہیں ہے، دھندلی روشنی اور کمرہ کے سکوت سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی افسردگی بڑھتی جا رہی ہے۔ نشستگاہ سے نکلکر وہ کتب خانے کی طرف جانے لگا اس نے اپنا سیدھا پاؤں ضرورت سے زیادہ اوپر اٹھایا اور دروازہ کی چوکھٹ کو ہاتھ سے محسوس کرنے لگا۔ اس کے جسم میں اضطراب اور پریشانی ایک لہر دوڑ گئی جیسے وہ کسی غیر آدمی کے گھر میں داخل ہو رہا ہو۔ یا اس نے عمر بھر میں پہلی مرتبہ شراب پی ہو اور اس کے اثرات اس کے دماغ اور دل پر طاری ہو رہے ہوں۔ کتابوں کی الماری کے کنارے سے روشنی کی ایک شعاع دیوار پر پڑ رہی تھی۔ ساتھ ہی قریب کے کھلے ہوئے کمرے سے کاربالک اور ایتھر کی خوشبو بھی آرہی تھی۔ ڈاکٹر میز کے سامنے ایک کرسی پر گر پڑا۔ ایک لمحہ تک غنودگی کی حالت میں الماری کو دیکھتا رہا۔ پھر اٹھکر خوابگاہ میں چلا گیا۔

خوابگاہ میں قبرستان کی سی ہیبتناک خاموشی حکمران تھی۔ ہر چیز سے معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی زلزلہ اور طوفان آیا تھا جس کے بعد انتہائی سکون پیدا ہو گیا ہے۔ بہت سی شیشیوں، بوتلوں، ڈبوں اور برتنوں کے بیچ میں تپائی پر رکھی ہوئی ایک شمع اور سنگھار دان پر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی سے سارا کمرہ روشن تھا۔ کھڑکی کے پاس بچھونے پر ایک لڑکا لیٹا ہوا تھا جس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور چہرے پر تعجب کے آثار ہویدا تھے اس میں ذرا سی جنبش بھی نہ تھی لیکن

اس کی کھلی ہوئی آنکھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ لحظہ بہ لحظہ تاریک ہو کر سر کے اندر دھنستی چلی جاری ہیں۔ ماں دونوں ہاتھ نیچے رکھے ہوئے بستر پر جھکی ہوئی تھی اور اس نا سمجھ بچھونے میں چھپا ہوا تھا۔ بچے کی مانند وہ بھی بے حس و حرکت تھی لیکن اس کے جسم اور ہاتھوں کے خم میں ایک دھڑکنے والی زندگی دوڑری تھی۔ وہ اپنی روح کی تمام بے چینیوں کے ساتھ بچھونے پر جھکی تھی اور اپنی تمام قوت سے اس کو مس کر رہی تھی گویا وہ اس امر سے خوفزدہ تھی کہ ذرا سی جنبش سے بھی اس کا موجودہ آرام فنا ہو جائے گا جو اب اس کے تھکے ہوئے جسم کو محسوس ہو رہا تھا۔ بچھونے کپڑے، برتن فرش پر پڑے ہوئے پانی کے نشیب و فرش اور سمجھے جوتے کے پانی کی بوتل ــــ اور ساری فضا ــــ بلکہ اور ہر چیز یہ ہوا ــــ بالکل خاموش تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سب انتہائی آرام کی نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر اپنی بیوی کے پاس پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ پتلون کے جیب میں ڈالے گردن کو ایک جانب ترچھا کئے ہوئے اپنے لڑکے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے پروائی کے آثار ہویدا تھے مگر صرف ان چند قطرات اشک سے جو اس کی پلکیں دراز پر اٹک رہے تھے، یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی رو چکا ہے۔

وہ تباہ کن خوف، جو ہم موت کا ذکر کرتے وقت محسوس کرتے ہیں اس کمرے میں موجود نہ تھا، ہر شے کی افسردگی میں، ماں کی موجودہ کیفیت میں، ڈاکٹر کے چہرے پر نظر آنے والے استغنا میں ایک ایسی کیفیت تھی جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہمدردی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ انسانی غم و اندوہ کی حسین صورت جس کو بہت زمانہ تک انسان نہ تو سمجھنے کے قابل بن سکے گا اور نہ بیان کرنے کے قابل، اور جس کو صرف "نغمہ" خوبی سے ادا کر سکتا ہے، اس مقدس سکوت میں بھی حسن کی ایک ہلکی سی جھلک موجود تھی۔ کرلوف اور اس کی بیوی دونوں مصروف گریہ نہ تھے بلکہ ساکت، گویا۔ اس نقصان کی تکلیف کے بعد بھی وہ دونوں اپنی موجودہ غمناک حالت کو محسوس کر رہے تھے جس طرح کہ ایک بار ان کی جوانی جا کر واپس نہیں آئی۔ اسی طرح اب اس لڑکے کے ساتھ ان کے بچوں کی پرورش کرنے کے حقوق بھی عالم فانی کو رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر کی عمر (۴۴) برس کی تھی۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے اور وہ ایک بوڑھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی کملائی ہوئی بیمار بیوی (۳۵) برس کی تھی۔ اینڈری نہ صرف اکیلا بلکہ آخری بچہ تھا۔

بیوی کے برعکس ڈاکٹر اس قسم کے لوگوں میں تھا جو روحانی تکالیف کے وقت بھی خاموش رہنا پسند نہیں کرتے۔ بیوی کے پاس پانچ منٹ تک ٹھہرنے کے بعد وہ خواب گاہ سے ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف بڑھا۔ جس کا نصف حصہ ایک بڑے سوفے نے گھیر رکھا تھا۔ وہاں سے وہ باورچی خانہ میں گیا۔ باورچی کے بچھونے اور چولھے کے گرد پھرنے کے بعد جھک کر ایک دروازہ سے راستہ میں پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سفید ٹوپی اور سفید چہرہ کو دیکھا۔

"آخر کار" ابوگن نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "آپ آگئے۔ اب ہم کو چلنا چاہئے"۔ ڈاکٹر چونک پڑا۔ اس کو گھور کر دیکھا اور پھر اس کو یاد آگیا۔ "کیوں میں نے آپ سے کہہ دیا کہ آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اس نے برہم ہوتے ہوئے کہا "تعجب ہے کہ آپ ابھی تک کھڑے ہیں۔"

"ڈاکٹر میں پتھر نہیں ہوں۔ میں آپ کی موجودہ حالت کو خوب سمجھتا ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے"۔ ابوگن نے ملتجی آواز میں ٹوپی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں آپ سے اپنے لئے نہیں کہتا۔ میری بیوی مر رہی ہے اگر آپ نے اس کی چیخ سنی ہوتی اور اس کا چہرہ دیکھا ہوتا تو میری اس گستاخی کو ضرور سمجھ سکتے۔ او میرے خدا۔ میں نے سمجھا تھا کہ آپ میرے ساتھ چلنے کے لئے کپڑے پہننے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب وقت بہت زیادہ قیمتی ہے میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ جلد چلئے۔"

"میں نہیں چل سکتا" کرلوف نے موثر انداز سے کہا اور نشستگاہ کی طرف بڑھا۔ ابوگن بھی اس کے پیچھے گیا۔ اس کی آستین پکڑلی۔

"آپ غمزدہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ لیکن میں آپ سے دانت کے درد کے مریض کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں یا کسی مشورہ کے لئے نہیں بلا رہا ہوں بلکہ ایک انسانی زندگی کو خطرہ سے بچانے کے لئے۔" وہ ایک بھکاری کی طرح کہنے لگا۔ "زندگی ہر انسانی اور شخصی غم اور نقصان سے بالاتر اور مقدم ہے۔ چلئے۔ میں آپ سے ہمت اور جوانمردی کے لئے کہتا ہوں۔ انسانیت کی خاطر کہتا ہوں"۔

"انسانیت ــــ یہ ایک ذو معنی لفظ ہے"۔ کرلوف نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ "انسانیت کا واسطہ دیکر میں آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے نہ لے چلئے اور درحقیقت یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اس وقت مجھ میں کھڑے ہونے کی تاب نہیں ہے اور آپ مجھ سے انسانیت

غزل

از جناب نواب حسین نواز جنگ بہادر خسرو

قفس میں نکہت گل سے بہار زیست کا کچھ ہے　　ہوا خواہ عنادل ہے تو ہاں باد صبا کچھ ہے

بیاں پیغام بر کا کچھ ہے۔ اپنا مدعا کچھ ہے　　پڑیں اس عقل پر پتھر سنا کچھ تھا کہا کچھ ہے

بہت تعریف سنتا ہوں میں قاتل آپ پیکاں کی　　ترے ترکش میں میرے درد دل کی بھی دوا کچھ ہے

یونہی کیا تشنہ لب در سے ترے ساقی پلٹ جاؤں　　خم و جام و سبو میں دیکھ تو بہر خدا کچھ ہے

کہاں تک امتحاں لیتے تمھارے عہد و پیماں کا　　یہی ہم دیکھتے آئے کہا کچھ ہے کیا کچھ ہے

نہ کرنا جذب اے خاک درِ قاتل اقیامت تک　　اگر تجھ کو لحاظ خون ارباب وفا کچھ ہے

لئے جاتے دلِ بیخوف بزمِ یار میں خسرو
اگر ہے تو ہمیں اندیشۂ دزدِ حنا کچھ ہے

پر بحث کر رہے ہیں ۔ میں اس وقت کسی قابل نہیں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اس وقت کوئی بات چلنے پر مجبور نہیں کر سکتی ' اور میں اپنی بیوی کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا نہیں ' ہرگز نہیں ''

کرنوف نے اپنے ہاتھوں کو جنبش دی اور پیچھے ہٹ گیا '' اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اب خدا مجھ سے مت کہو '' وہ مبہوت انداز سے کہنے لگا '' مجھے معاف کرو ۔ قانونی دفعہ ۱۳ کے مطابق مجھے تمہارے ساتھ چلنا ضروری ہے اور تم کو حق ہے کہ میری گردن پکڑ کر مجھے لے چلو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو گردن پکڑ کرکے چلو اگر تم چاہتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس قابل نہیں ہوں ۔ میں بات تک نہیں کر سکتا ۔ معاف کرو ''

'' ڈاکٹر اس طرز تکلم کی ضرورت نہیں ہے ''

'' ابوگن نے مکرر ڈاکٹر کی آستین کو پکڑتے ہوئے کہا کہ '' مجھے دفعہ (۱۳) کی ضرورت نہیں ۔ آپ کو اپنی کی مرضی کے خلاف مجبور کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے ۔ اگر آپ چل سکتے ہیں تو چلئے اگر نہیں چل سکتے تو خدا آپ کو معاف کرے ۔ لیکن میں آپ کی خواہش سے درخواست نہیں کر رہا ہوں بلکہ آپکے احساسات سے ایک جوان عورت بستر مرگ پر پڑی ہے ابھی آپ خود اپنے بیٹے کی موت کا ذکر کر رہے تھے تو پھر آپ کے سوا میرے خوف ' میرے اضطراب اور میری بے چینی کو کون سمجھ سکتا ہے ۔ کون محسوس کر سکتا ہے ؟ ''

'' ابوگن کی آواز فرط جذبات سے بھرا گئی ۔ اس کے لہجہ میں اس کی تقریر سے زیادہ اثر نہاں تھا ۔ ابوگن مخلص تھا ' لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے طرز تکلم میں افسردگی ' اور کسی قدر خوشامد بھی موجود تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر کے موجودہ گھر کی فضا ' اور اس عورت پر جو کہیں پڑی مر رہی ہے برہمی کا اظہار کر رہا ہے ۔ اس امر کا اس نے خود احساس کیا اور اس خوف سے کہیں اس کی گفتگو ناقابل فہم حد تک نہ پہنچ جائے اس نے اپنی تمام امکانی کوششیں لہجہ کو نرم اور موثر بنانے میں صرف کر دیں تاکہ اگر الفاظ اس کے جذبات کے اظہار میں ناکام رہیں تو اس کا لہجہ کامیاب ہو ۔ اصول کے مطابق جملہ خواہ کتنا ہی عمدہ اور عمیق معنے رکھتا ہو ' صرف ایک بے پروا آدمی پر اثر کر سکتا ہے اور ان لوگوں کو پوری تسکین نہیں بخش سکتا ' جو مسرور ہیں یا ناشاد ہیں ۔ اسی لئے بے زبانی یا خاموشی مسرت اور ناخوشی کے اظہار کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے عاشق و معشوق ایک دوسرے کو عالم سکوت میں زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھ سکتے ہیں اور جو جذباتی تقریر کسی کی موت پر کیجاتی ہے اس سے عوام تو متاثر ہوتے ہیں لیکن وہ ایک بیوہ اور اس کے بچوں کے لئے انتہائی مہمل اور لغو ثابت ہوتی ہے ۔

کرنوف چپ چاپ کھڑا رہا ۔ جب ابوگن نے ڈاکٹر کی ہمدردی اور اس کی شخصی قربانی کی مثالیں پیش کیں تو ڈاکٹر نے پوچھا '' کتنی دور ہے ؟ '' تقریباً '' آٹھ یا نو میل ۔ ڈاکٹر صاحب میرے پاس بہت مضبوط گھوڑے ہیں ۔ میں آپ کو زبان دیتا ہوں کہ ایک گھنٹہ میں یہاں واپس پہنچا دوں گا صرف ایک گھنٹہ میں ''

کرنوف پر ان الفاظ کا اثر بہت ہوا ۔ اس نے ایک لمحہ تک سوچا اور ایک آہ بھر کر بولا '' بہت اچھا چلو '' ڈاکٹر تیزی سے اپنے کتب خانہ میں گیا اور ایک اور کوٹ پہنکر باہر آیا ۔ ابوگن یہ دیکھکر بہت مطمئن ہو گیا اور اس کے ساتھ باہر چلا گیا ۔

ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی ۔ پھر بھی یہ تاریکی دروازہ کی تاریکی سے کسی قدر کم تھی ۔ ڈاکٹر کا طویل قد لمبی اور پتلی داڑھی اور اونچی اور چوڑی ناک اندھیرے میں اچھی طرح دکھائی دیری تھی ۔ اور ابوگن کا بڑا سا سر ' چھوٹی سی ٹوپی اور افسردہ چہرہ بھی بخوبی پہچانا جا سکتا تھا ۔ '' یقین کیجئے کہ میں آپ کی اس عنایت بے پناہ کی قدر دل سے کرتا ہوں '' ابوگن نے ڈاکٹر کو گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا '' ہم بہت جلد پہنچ جائیں گے ۔ لوکا ——— ! جس قدر جلد چلا سکے ہو چلاؤ ''

کوچبان نے گاڑی ہانک دی ۔ پہلے کچھ غیر متمیز عمارتوں کی ایک قطار نظر آئی جو ہسپتال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی تھی ' ہر طرف اکیلی ہی تاریکی تھی ' صرف بہت دور ایک کھڑکی سے روشنی کی شعاعیں درختوں میں سے گزر کر سڑکوں پر پڑ رہی تھیں ۔ اس کے بعد گاڑی ایک بہت ہی مہیب سایہ میں سے گزری یہاں پر کوکرمتا کی بو بھی آرہی تھی اور گرمی بھی زیادہ تھی اور درختوں کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے ۔ بھیوں کی آواز سے کوے ایک شاخ سے اڑ کر دوسری شاخ پر بیٹھنے لگے اور ایک ناگوار شور مچانے لگے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر کا لڑکا مر گیا ہے اور ابوگن کی بیوی بیمار ہے ۔ اس کے بعد درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ الگ الگ نظر آنے لگے ۔ پھر جھاڑیاں شروع ہو گئیں ' پھر ایک تالاب نظر آیا جس کے کنارے درختوں کے بڑے بڑے سائے محو خواب تھے ۔ یہاں سے گزر کر گاڑی ایک ناہموار اور چکنی مٹی کی زمین پر چلنے لگی کوؤں کی کائیں ' کائیں '' بہت دور تک آہستہ آہستہ سنائی دیتی رہی

قطعۂ تاریخ سالنامۂ رہبر دکن بابتہ سنہ ۱۳۴۳ ف

از مولوی سید ضیاء الدین صاحب عالی

سب اسپہ شگفتہ ہیں کیوں ناز ہو اسکو — کیا بے نیاز نکلا رہبر کا سالنامہ
افسانہ و مضامیں ہیں کس قدر خوش آئیں — اُردو نواز نکلا رہبر کا سالنامہ
لعل و درِ سخن سے اسرار علم و فن سے — اک گنج راز نکلا رہبر کا سالنامہ
حسن و جمال دلکش اہل کمال ہیں غش — باسوز و ساز نکلا رہبر کا سالنامہ
کیا کیا کھلائے ہیں گل جدول ہے یہ کہ سنبل — گلزار ناز نکلا رہبر کا سالنامہ
جو اسکو دیکھ پائے کیوں وجد میں نہ آئے — کیا دلگداز نکلا رہبر کا سالنامہ

فصلی کا سال عالی ہے بے مثال عالی
بہجت طراز نکلا رہبر کا سالنامہ
۴۳ ف ۱۳

اور پھر یک لخت بند ہو گئی۔

کرلوف اور ابوگن راستہ بھر چپ چاپ بیٹھے رہے صرف ایک مرتبہ ابوگن نے آہ سرد بھری اور کہا "یہ ایک انتہائی کرب و اضطراب کی حالت ہے۔ کوئی شخص ان لوگوں کو جو اس کے قریب ہوتے ہیں، اسقدر محبت کی نظر سے نہیں دیکھتا جتنا ان لوگوں کو جو کسی خطرہ میں گرفتار ہو کر جان سے گزرنے کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔"

اور جب گاڑی دریا کے کنارے آہستہ آہستہ چلنے لگی تو کرلوف یکایک چونک پڑا۔ جیسے پانی کی لہروں کی آواز نے اس کو ڈرا دیا ہو اور پھر وہ اپنی جگہ سے حرکت کرتے ہوئے بولا "سنو مجھے اس وقت جانے دو" اس کی آواز میں ایک بیکسی کا عالم تھا "میں تھوڑی دیر کے بعد تمہارے پاس آؤں گا۔ مجھے اپنے مددگار کو فوراً اپنی بیوی کے پاس روانہ کر دینا چاہئے۔ تم کو معلوم ہے کہ وہ گھر میں تنہا اور سوگوار ہے۔"

ابوگن نے کوئی جواب نہ دیا گاڑی پتھروں پر لڑکھڑاتی اور گھڑگھڑاتی ہوئی ریتیلے کنارے پر چلتی رہی۔ کرلوف مضطربانہ انداز سے ادھر اودھر دیکھتا رہا۔ ان کے پیچھے تاروں کی دھندلی تابانی میں سڑک نظر آ رہی تھی اور دریا کے کناروں کی منڈیریں تاریکی میں روپوش ہوتی جاری تھیں۔ داہنی جانب آسمان کے مانند وسیع اور غیر محدود ایک میدان پڑا تھا، جابجا لالٹینوں کی روشنیاں دور سے پھیکی شعاعیں ڈالتی نظر آ رہی تھیں بائیں جانب سڑک کے برابر ایک پہاڑی سلسلہ تھا جس پر درختوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑی کی چوٹی پر ایک بڑا کہر آلود سرخ نصف چاند چھوٹے چھوٹے بادلوں کے حلقہ میں تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند کو چاروں طرف سے دیکھ رہے ہیں کہ کہیں نکل نہ جائے۔

قدرت کی اس ساری کائنات میں یاس اور درد کا ایک احساس نظر آ رہا تھا۔ زمین ایک زن برباد کی مانند جو ایک تاریک کمرے میں بیٹھی ہوئی عہد ماضی کے تباہ کن حالات کو بھلا دینے کی سعی کر رہی ہو، موسم گرما و بہار کی رنگین و لطیف یاد پر سر دھن رہی تھی اور نفرت کے بے پایاں جذبات کے ساتھ موسم سرما کا انتظار کر رہی تھی جس طرف بھی نظر پڑتی، قدرت ایک تاریک غیر محدود اور عمیق غار کی مانند معلوم ہوتی تھی جس سے نہ تو کرلوف کو پناہ مل سکتی تھی، نہ ابوگن کو حتیٰ کہ سرخ نصف چاند بھی اس سے گریز نہ کر سکتا تھا۔

جیسے جیسے گاڑی منزل مقصود سے قریب ہوتی جاتی ابوگن زیادہ بے چین اور بیقرار ہوتا جاتا اور رہ رہ کر جھانکتا، اٹھتا، بیٹھتا، اور کوچبان کے بازوں اور کندھوں کو دیکھتا۔ آخر کار جب گاڑی ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گئی جس پر ایک خوبصورت پردہ پڑا ہوا تھا اور جب اس نے دوسری منزل کی کھڑکیوں میں روشنی دیکھی تو اطمینان کی سانس لی۔

"اگر خدا ناکردہ کچھ ہوا تو ——— میں اس کو برداشت نہ کر سکوں گا" اس نے ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اور بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا، "لیکن یہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہے اس سے پتہ چلتا ہے سب حالات اطمینان بخش ہیں۔"

ہال میں کوئی آواز یا تحرک نظر نہ آتا تھا اور کھڑکیوں کے روشن ہونے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا گھر محو خواب ہے۔ اب ڈاکٹر اور ابوگن جو اب تک تاریکی میں تھے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ ڈاکٹر طویل قامت اور دبلا آدمی تھا، اس کے کپڑے کچھ ٹھیک نہ تھے اور شکل بھی بھونڈی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ناخوشگوار متانت اور غیر مشفقانہ کیفیت تھی، اور اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے روشن تھے اس کا متحرک سر، اندر گھسی ہوئی پیشانی، لمبی اور پتلی داڑھی کی قبل از وقت سفیدی جس میں سے اس کی ٹھوڑی نظر آ رہی تھی، جلد کا بھورا رنگ اور ترش انداز و اطوار تمام باتیں اس امر کی مظہر تھیں کہ اس کی عمر نکبت، افلاس اور انسان اور زندگی سے بیزاری کے عالم میں بسر ہوئی ہے، اس کے قد و قامت اور جسم کو دیکھ کر کوئی شخص ہرگز یقین نہ کر سکتا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس کی بیوی بھی موجود ہے اور اس میں اپنے بچہ کے لئے رنج و غم اور گریہ و زاری کرنے کی اہلیت موجود ہے۔ ابوگن کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی وہ ایک تندرست، خوبصورت متناسب الاعضاء اور مضبوط آدمی تھا، اس کے خط و خال اور اطوار دلکش تھے، وہ نفیس ترین جدید فیشن کا لباس پہنے ہوئے تھا اس کی رفتار، لمبے بال اور بٹن لگے ہوئے کوٹ اور چہرے میں ایک خاص شان اور رعونت پائی جاتی تھی، چلتے وقت اس کا سر سیدھا اور سینہ ابھرا ہوا رہتا تھا، اس کے لہجہ میں نرمی تھی اور اس کے انداز میں کسی قدر نسائیت کی جھلک بھی شامل ہوتی تھی لیکن اس کے چہرہ کی افسردگی اور طفلانہ خوف و ہراس نے اس کی شان اور وقار میں کوئی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ اگر گفتار یا کردار پر اس کا کوئی اثر پڑ سکتا تھا

"یہاں نہ تو کوئی آدمی ہے نہ آواز سنائی دیتی ہے" اس نے سیڑھی پر چڑھتے ہوئے کہا ——— "کوئی حرکت نہیں۔ خدا کرے سب کچھ ٹھیک ہو۔"

وہ ڈاکٹر کو اپنے ساتھ ہال میں سے ایک کمرہ میں لے گیا جہاں ایک سیاہ پیانو رکھا ہوا تھا اور وہاں سے وہ دونوں ایک بہت خوبصورت نشست گاہ میں داخل ہوئے جس میں گلابی روشنی ہو رہی تھی اور ساری فضا خوشبوؤں سے معطر تھی۔

"ڈاکٹر صاحب یہاں تشریف رکھئے . . . . اور میں . . . فوراً واپس آتا ہوں، ذرا جا کر دیکھتا ہوں۔"

کرلوف تنہا رہ گیا۔ نشست گاہ کی شان امارت شمع کی شہابی جگمگاہٹ اور ایک اجنبی کے گھر میں اپنی موجودگی سے وہ بالکل متاثر نہیں ہوا اور وہ ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ جو کاربالک کی وجہ سے جگہ جگہ جل گئے تھے اس نے ایک سرسری نظر روشنی کے لیمپ پر ڈالتے ہوئے دیواری گھڑی کی طرف دیکھا جہاں ایک بھیڑیے کا مصنوعی ڈھانچہ رکھا ہوا تھا جو ابوگن کی طرح نظر آ رہا تھا۔

ہر طرف سکوت تھا ——— متصل کمرے میں کسی نے زور سے چیخ ماری "آہ" الماری کا دروازہ بند ہونے کی ایک آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ پانچ منٹ انتظار کرنے کے بعد کرلوف نے اپنے ہاتھوں پر سے نظر اٹھائی اور اس دروازہ کی طرف دیکھا جس میں سے ابوگن اندر گیا تھا۔

ابوگن دروازہ پر کھڑا ہوا تھا، لیکن اب اس کی حالت میں ایک غیر معمولی تغیر واقع ہو چکا تھا اس کا چہرہ، اس کے ہاتھ اور اس کا سارا جسم ایک انتہائی کشمکش غم و اضطراب میں مبتلا تھا اور لرز رہا تھا، اس کی ناک ہونٹ، مونچھیں اور اس کے تمام اعضا غصے سے کانپ رہے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنا منہ آپ نوچ ڈالیگا اس کی آنکھیں فرط الم سے ہنس رہی تھیں۔

ابوگن نے نشستگاہ میں ایک قدم بڑھا کر رکھا سامنے کی طرف جھکا، ایک خاص قسم کی آواز نکالی اور مٹھی بند کر لی "اس نے مجھے دھوکا دیا ہے" اس نے دھوکہ پر زور دیتے ہوئے کہا "مجھے دھوکہ دیکر بھاگ گئی، وہ بیمار پڑ گئی اور مجھے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے بھیجا تاکہ خود اس نقال پتھینسکی کے ساتھ بھاگ جائے ——— او میرے خدا!"

ابوگن نے یہ کہکر ڈاکٹر کی طرف ایک قدم بڑھایا اپنی مٹھیاں اس کے چہرے کے سامنے اٹھائیں اور ان کو ہلا کر غصہ سے بکنے لگا "چلی گئی مجھے دھوکا دیا۔ لیکن اس دھوکہ بازی کے معنے؟ او خدا۔ او خدا۔ اس ناپاک دھوکہ بازی کی کیا ضرورت تھی۔ یہ مکاری؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ بھاگ گئی۔"

آنسو اس کی آنکھوں میں بھر آئے اور وہ کمرہ میں ادھر سے اودھر ٹہلنے لگا، اس وقت وہ اپنی تمام مردانہ قوت، اعضاء اور جذبات کے ساتھ ایک خیر کے مانند

نظر آرہا تھا۔ ڈاکٹر کے ناگوار چہرہ پر دریافت کی ایک جھلک نمودار ہوگئی۔ وہ کھڑا ہوگیا اور ابوگن کو گھورنے لگا "معاف فرمایئے۔ مریض کہاں ہے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"مریض ۔۔۔ مریض" ابوگن نے مٹھیاں ہلاتے اور ہنستے اور شور کرتے ہوئے کہا:۔

"وہ بیمار نہیں ہے بدخصلت ہے، کمینی ہے، مکارہ ہے خود شیطان اس سے زیادہ اور کوئی مکر نہ سوچ سکتا تھا اس نے مجھے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے بھیجا تاکہ خود ایک مسخرے ایک نقال، ایک شریر اور رذیل کے ساتھ بھاگ جائے او میرے خدا۔ کاش وہ مرجاتی میں برداشت نہیں کرسکتا میں اس کو برداشت نہیں کرسکتا۔"

"مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے اس کا مطلب دریافت کروں۔" ڈاکٹر نے اطراف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا لڑکا مردہ پڑا ہے، میری بیوی تنہا ہے، سوگوار ہے ۔۔۔ میں خود اپنے آپ میں صبر کی تاب نہیں پاتا تین راتوں سے مجھے نیند نصیب نہیں ہوئی اور یہاں مجھے مجبور کیا جارہا ہے کہ ایک ذلیل تمثیل میں حصہ لوں۔ میں نہیں سمجھتا میری سمجھ میں یہ سب کچھ نہیں آتا۔"

ابوگن نے ایک مٹھی کھولدی، فرش پر ایک نوٹ پھینک کر اس کو ایک حقیر کیڑے کی طرح ٹھکرا دیا۔ "میں نے نہیں دیکھا ۔۔۔ میں خود نہیں سمجھا۔"

اس نے اپنے دانتوں کو بھینچکر ایک مٹھی کو اس کے سامنے گھماتے ہوئے اس غصے سے کہا جیسے کسی نے اس کا کھیت روند ڈالا ہو "میں نے خیال نہ کیا کہ وہ روز آتا ہے میں نے اس امر کی طرف بھی توجہ نہ کی کہ آج وہ ایک بند گاڑی میں آیا تھا۔

۔۔۔ وہ ایک بند گاڑی میں کس لئے آیا تھا؟ میں نے اس کو نہیں دیکھا۔"

"میں نہیں سمجھا۔" ڈاکٹر جھنجلا کر بولا "کیوں اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ انسانی وقار کی اچھی خاصی توہین ہے، یہ ناقابل معافی ہے، میری عمر میں آج پہلا موقع ہے کہ مجھے ایسا تلخ تجربہ ہوا۔"

ایک اس شخص کی مانند، جس کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی سخت توہین کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نے اپنے کندھوں کو جنبش دی۔ اپنے دونوں بازو پھیلائے اور یہ نہ سمجھتے ہوئے کہ اس کو کیا کرنا یا کیا کہنا چاہئے ایک کرسی پر گر پڑا۔

"اگر تو نے مجھ سے محبت کرنا ترک کردیا ہے اور دوسرے سے محبت کرنے لگی تو خیر یہی سہی۔ لیکن ایسی دھوکہ بازی کیوں:۔ یہ رذیلانہ حرکت اور مکاری کیسی؟"

ابوگن نے اشک آلود لہجہ میں کہا "اس کا کیا مقصد ہے؟ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟ سنیئے ڈاکٹر صاحب!" اس نے کروف کی طرف آگے بڑھتے ہوئے کہا "آپ نے میری موجودہ بدنصیبی کا مشاہدہ کرلیا ہے اب میں آپ سے اس واقعہ کی صداقت کو مخفی رکھنا نہیں چاہتا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس عورت سے مجھے محبت تھی۔ بے انتہا محبت! ایک غلام کی مانند ۔۔۔ میں نے اس کی خاطر سب کچھ قربان کردیا اس کے لئے میں نے اپنوں سے بگاڑ کرلیا میں نے موسیقی ترک کردی، میں نے اس کی وہ تمام غلطیاں معاف کردیں جو اپنی اور بہنوں کی نہ معاف کرسکتا تھا۔ میں نے کبھی اس کو خشمگیں نظر سے نہیں دیکھا، میں نے کبھی کسی بات میں اس کی مخالفت نہیں کی پھر یہ دھوکہ کیسا؟

میں اس سے محبت واپس نہیں مانگتا۔ اس لے پہلے ہی صاف صاف کیوں نہ کہدیا جب کہ وہ اس موضوع پر میرے خیالات سے کماحقہ واقف تھی۔"

آنسو بھرے ہوئے اور کانپتے ہوئے ابوگن نے اپنے دل کا حال، انتہائی خلوص کے ساتھ ڈاکٹر سے بیان کردیا۔ اس نے اپنی خانگی زندگی کے سب راز بلا کسی جھجھک کے کھول ڈالے۔ اور اس کے بعد اس کے قلب پر سے ایک گرانی کم ہوگئی کہ اب اس کا سینہ رازوں سے خالی ہوچکا ہے۔ اگر وہ اسی انداز سے ایک یا دو گھنٹے تک باتیں کرتا رہتا تو اس کی حالت شاید بہتر ہوجاتی ۔۔۔ کون جانتا ہے لیکن اگر ڈاکٹر اس کی گفتگو کو ایک دوست کی طرح سنتا اور اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا تو شاید وہ اپنی موجودہ تکالیف کو بے چون وچرا کے برداشت کرلیتا اور کوئی فضول اور لغو حرکت نہ کرتا ..... لیکن جو کچھ ہوا وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ جب ابوگن یہ محبت اور نفرت آلود تقریر کر رہا تھا تو ڈاکٹر غصہ سے لال پیلا ہورہا تھا۔ اس کے چہرہ کی بے اعتنائی اور حیرت نے رفتہ رفتہ ایک خفگی، ایک برہمی اور پھر ایک خوفناک غصہ کی شکل اختیار کرلی اور اس کے چہرہ کی وضع وقطع اور زیادہ بدہیئت بنگئی۔

جب ابوگن نے ڈاکٹر کو ایک حسین عورت کی تصویر دکھلائی جو سرد جذبات کی حامل نظر آتی تھی اور جس کا چہرہ ایک راہبہ کے مانند اظہار جذبات سے معذور تھا، اور جب اس نے اس سے دریافت کیا کہ آیا اس عورت کے چہرہ کو دیکھکر اس کی فتنہ سازی اور عیاری کا پتہ لگایا جاسکتا ہے تو ڈاکٹر آپے سے باہر ہوگیا اور آنکھیں غصہ سے سرخ کرکے کہنے لگا۔

"یہ سب کچھ تم مجھے کیوں سنا رہے ہو؟ مجھے سننے کی خواہش نہیں ہے" اس نے زور سے چلا کر مٹھی میز پر ٹیک دی "میں تمھارے ذلیل اسرار سننا نہیں چاہتا۔ ان پر خدا کی لعنت۔ اب مجھ سے ایسی ذلیل اور ناپاک باتیں نہ کہنا۔ کیا تمھارا خیال ہے کہ میری کافی توہین نہیں ہوچکی ہے اور میں ایک ایسا ادنےٰ آدمی ہوں کہ تم بے روک ٹوک میری توہین کرتے چلے جاؤ۔

"کیا یہی ارادہ ہے؟"

ابوگن ڈاکٹر کی اس گفتگو سے متعجب ہوا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" ڈاکٹر کہنے لگا اور اس کی لمبی داڑھی ہلنے لگی "اگر تم ایسے خوش حال ہو کہ شادی کرسکتے ہو۔ مجھے تم اپنی اس محبت کی پریشان کن اور ذلیل تمثیل میں شامل کرکے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو؟ مجھے تمھاری محبت کے واقعات سے کیا مطلب؟ مجھے چھوڑ دو، جاؤ یہاں سے، اور شریفوں کے جیبیں بیوقوفوں سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ تم انسانی خیالات اور حالات کا مذاق اڑانا چاہتے ہو ۔۔۔ (ڈاکٹر نے ادھر ادھر دیکھا) باجے بجاؤ، گانا گاؤ، ناچو، کھا کھا کر خوب پھولو پھول پھول کر ہاتھی ہوجاؤ، لیکن انسانی وقار کی توہین کرنے کی جراٴت نہ کرو، اگر تم اس وقار کا احترام نہیں کرسکتے تو اس کو مجروح کرنے کی بھی کوشش نہ کرو۔"

"معاف فرمایئے اس کا کیا مطلب ہے؟" ابوگن نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ شریفوں کے ساتھ ایسا مذاق کرنا انتہائی کمینہ پن اور ذلیل حرکت ہے۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں تم ڈاکٹروں کو نفرت سے دیکھتے ہو اور دوسرے تمام لوگ بھی ڈاکٹر کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن تم کو ہرگز ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ ایک شریف آدمی کو اسٹیج کی ملازمہ سمجھ کر اس کے ساتھ مذاق کرو۔"

"آپ کو یہ کہنے کی جراٴت کیسے ہوئی؟" ابوگن نے آہستگی سے کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ غصے سے دمکنے لگا۔

"نہیں ۔۔۔ میرے رنج وغم کو جانتے ہوئے تم نے یہ جراٴت کیسے کی؟ مجھے یہاں لائے کہ اپنی مہمل اور فضول باتیں سناؤ" ڈاکٹر نے چلاتے ہوئے کہا اور زور سے میز پر ایک گھونسہ مارا "یہ حق تم کو کس نے دیا ہے کہ دوسروں کے رنج وغم کا مذاق اڑاؤ؟"

"آپ اپنے ہوش وحواس میں نہیں معلوم ہوتے" ابوگن نے جھنجلا کر کہا۔ "یہ انتہائی تنگ نظری ہے میں خود بے حد غمگین ہوں اور ..... اور ..... "بیہودہ غمگین" ڈاکٹر نے ایک حقارت آمیز تبسم سے کہا "اس لفظ کو زبان سے مت نکالو۔ اس سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں۔ ایک فضول خرچ انسان جو کسی کی امداد نہیں کرسکتا، وہ بھی اپنے آپ کو غمگین کہتا ہے، ایک شخص جو کھانے پر جان دیتا ہے وہ بھی اپنے

آپ کو ناشاد کہکر مخاطب کرتا ہے . . . . بیہودہ ذلیل انسان"۔ "جناب آپ خود کو بھولے جارہے ہیں" الوگن بولا۔ "ایسی باتیں کہنے پر لوگوں کی کھوپڑی توڑ ڈالی جاتی ہے۔ سمجھے آپ؟" الوگن نے جیب سے ایک نوٹ نکالی اس میں سے دو نوٹ نکالکر میز پر ڈالدیئے۔ "یہ آپ کی فیس ہے" اس نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا "آپ کا معاوضہ ملگیا"۔ "آپ نے فیس کیسے دی؟" ڈاکٹر چیخ اٹھا اور اس نے ہاتھ مارکر نوٹ زمین پر گرادیئے۔ "توہین کی قیمت روپیہ سے نہیں اداکی جاسکتی"۔

اب ڈاکٹر اور الوگن آمنے سامنے کھڑے ہوگئے اور غصے میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی یا عالم خود فراموشی میں بھی کبھی ایسی غیر منصفانہ، بیدردانہ، بیہودہ اور ناگوار باتیں نہ کی ہوں گی۔ ناشادوں کی خودبینی اور خودستائی پر دونوں نے بہت زور دیا۔ ناشاد انسان بہت زیادہ خود بین، حقارت پسند، نامنصف اور بے رحم ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں بیوقوفوں سے زیادہ نااہل ہوتے ہیں۔ ناخوشی انسانوں کو متحد نہیں کرتی بلکہ جدا کرتی ہے۔ "براہ کرم مجھے گھر جانے دو"۔ ڈاکٹر نے ہانپتے ہوئے کہا۔

الوگن نے گھنٹی زور سے بجائی۔ جب کوئی نہ آیا تو پھر بجائی اور جواب نہ ملنے پر اٹھاکر زور سے زمین پر ٹپک دی۔ وہ جھنجھناتی ہوئی زمین پر گر پڑی اور اس سے ایک ایسی دردناک آواز نکلی جیسے وہ مرہی ہو ایک ملازم اندر داخل ہوا۔

"تم کہاں جاکر مرگئے تھے۔ لعنت ہو تم پر" اس کا آقا گھونسا اٹھاکر اس کی طرف بڑھا۔ "تم کہاں گئے تو۔ جاؤ اور وکٹوریہ گاڑی اور ایک بند گاڑی میرے لئے تیار کراؤ . . . . " اس نے ملازم کو جاتا دیکھکر کہا "ٹھیر میں کل تک اس گھر میں ایک دغاباز کو بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم لوگ نکل جاؤ۔ میں نئے ملازم رکھلوں گا۔ دغابازو!" گاڑی کے انتظار میں، ڈاکٹر اور الوگن خاموش بیٹھے رہے الوگن کے چہرے پر نسان اور وقار کے آثار نمایاں ہوگئے وہ کوبات سوچتا ہوا کمرہ میں ادھر اودھر ٹہلنے لگا۔ اس کا غصہ کم نہ ہوا تھا اس نے اس امر کے اظہار کی کوشش کی کہ وہ اپنے "دشمن" کو نہیں دیکھ رہا ہے۔

ڈاکٹر ایک ہاتھ سے میز پر ٹیک لگائے ہوئے کھڑا تھا اور الوگن کو اس مجنونانہ نفرت اور حقارت سے دیکھ رہا تھا جو نکبت اور غم کی آنکھوں میں صرف اس وقت ہوتی ہے جب اس کو خوشحالی اور آرام و عشرت کی نظریں ذلت اور حقارت سے دیکھتی ہیں۔

جب تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر وکٹوریہ میں بیٹھکر روانہ ہوا۔ تو اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں حقارت کی جھلک پائی جاتی تھی تاریکی چھائی ہوئی تھی اس سے زیادہ ہیبت ناک تاریکی جو ایک گھنٹہ قبل تھی، سرخ نصف چاند چھپ چکا تھا اور بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے منتشر ہورہے تھے۔ گاڑی سڑک پر سے گھڑ گھڑاتی ہوئی گزر رہی تھی۔

راستہ بھر ڈاکٹر نے اپنی بیوی یا مردہ لڑکے اینڈری کا خیال نہیں کیا بلکہ وہ الوگن اور ان لوگوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو اس گھر میں رہتے تھے اور جن کو اس نے ابھی خیرباد کہا تھا۔ اس کے خیالات غیر منصفانہ اور غیر انسانی تھے، وہ الوگن اس کی بیوی اور پیچنسکی اور ان تمام لوگوں پر لعن و طعن کرتا رہا جو اس گھر کی گلابی روشنی اور خوشبوؤں میں رہتے تھے۔

راستہ بھر وہ ان سب پر حقارت اور نفرت کا اظہار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ وقت گزر جائیگا۔ کروف کا غم بھی رفع ہوجائیگا۔ لیکن انسانی بیدردی کا تجربہ تمام عمر فراموش نہ ہوگا۔ بلکہ قبر میں بھی ڈاکٹر کے دماغ کو چین نہ لینے دے گا۔

(چیخوف)